

جوری 2015

خوانین اور روشناؤں کیلئے اپنی طرف کا پہلا ہمانہ

# خاتونِ طاعنہ

گل و غزل

WWW.PAKSOCIETY.COM





پکوان

286 ہمارے دیس کے پکوان صبا سحر

نفسیات

288 نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان

بیوی بکس

290 بیوی بکس کے مشورے امت الصبور

رنگارنگ پھول

264 رنگارنگ سلسلہ شگفتہ جہاں  
284 تہریں و تہریں واصفہ سہیل

میری بیاض سے

273 آپ کی بیاض سے خالدہ جیلانی

جنوری 2015

جلد 42 شمارہ 9

قیمت 60 روپے

محلہ و کتابت کا پتہ: خواتین لی انجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

مبشر آذریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے تیار کرائی گئی۔ مقام: بی 91، بلاک W، مارچنہ ٹائم آف، کراچی

Phona: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateondigest.com Website: www.khawateondigest.com

ناول

34 آب حیات عمیر احمد  
206 بن مانگی دعا عفت سحر طاهر

ناولٹ

116 پہلی بارش آسمان مقصود  
88 مرگ و فنا نبیلہ رمضان  
136 محبت سرخ گلارہ حبیبی شاہ جہاں گل

افسانے

82 عاتقہ فیاض  
112 صبا خان  
154 دوری کا طاسم سعدی گل

نظائیں غزلیں

269 غزل شمیم فاطمہ  
269 نظم تنہیم کوثر

روزنامہ خواتین لی انجسٹ

پاکستان (سہ ماہی) 700 روپے

انڈیا (سہ ماہی) 5000 روپے

امریکہ (سالانہ) 8000 روپے

14 مسیر

15 ادا

268 نادر خاتون

بیاد انشا جی

20 انشا سے انشا کی باتیں مختار زمن

خاتون کی ڈائری

267 میری ڈائری سے امت الصبور

مجھ سے ملے

274 باتیں فیروز خان سے شاہین رشید

انٹرویو

24 ہمارے ناول سے ملاقات شاہین رشید

29 دیکھیں تیرے سال کی امت الصبور

کامل ناول

228 عجب الستی تشریہ ریاض

158 غزل عمیر احمد

ماہنامہ خواتین لی انجسٹ اور اردو ادبیات میں خواتین کے تحت شائع ہونے والے رچوں، مضمون، شعاع اور اہتمام کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ویب سائٹ پر ڈراما، ڈرامائی تفصیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے ہائپر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ یا کوئی جان بوجھ کر خلاف ورزی کرتا ہے۔



حقِ امتین اور اجماع کا جنوری 2015ء کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔  
وہ جمع الاولیٰ کا مہینہ مبارک ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں کائنات کی عظیم ترین ہستی نے دنیا کو رونق بخشی اس کی عظمت کا کیا بیان ہو سکتا ہے کہ جس کے ذکر جمیل کو اللہ تعالیٰ نے اظہارِ سما میں بلند کیا جس پر اللہ اور اس کے فرشتے صبح و شام درود بھیجتے ہیں۔ جس کے اخلاقی حسن کی تعریف اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمائی جس کی سیرتِ نبویؐ ایک ایک اور تارِ کرب کے صفحات میں محفوظ ہے اور جو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔

ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آپ کی یاد کی خوشی میں جشن مناتے ہیں لیکن آپ سے متعلق جنتِ نبویؐ ہی ہوگی جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تعلیمات پر عمل کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عبت، اخوت اور انسانیت کا درس دیا، اس پر خود کریں۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ گیارہ سال پہلے سے دارِ نبیؐ میں دے دے کیا جو شاید کبھی نہ مٹ پائیں گے۔ خصوصاً پشاور کے آری اسکول میں پیش آنے والا واقعہ جس نے دلوں میں درد ادا انگیزوں میں آنسو بہا دیا ہے۔ دعا ہے نئے سال کا سورج اس کا خوشیوں کا بیجا مے کرے۔

### ایک اندوہناک سانحہ

کراچی میں دھاتی عنبروں سے جادی و بہشت گردی نے ایک اور گمراہ چراغ بجھا دیا۔ ہمارے ساتھ رضا امام صاحب کے صاحبزادے عدنان، مقنا نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

### انٹالٹ وائٹ لائٹ برائجنڈ

والدین کی آنکھوں کے سامنے اوان اولاد کی اس طرح پانچ موت اور تین کہیں بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ جائے بہت بڑا سانحہ ہے۔ رضا امام صاحب سے دیرینہ وابستگی کی بناء پر ہم سب کے دل ٹوٹا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ رضا امام اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم عدنان رضا کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ بہاولی دعا ہے کہ وہ لیگ کے غیر کر دار کو پہنچیں جنہوں نے یہ ظلم عظیم کیا ہے۔

### انشائی

انشائی اردو ادب کی ایک بھرپور شخصیت۔

ادب، شاعری، سفر نامے، مزاح، اکالم نگاری، انہوں نے ہر میدان میں طبع آزمائی کی اور خود کو متاثر ایک خوب محرابیت جلتے کے باوجود ان کی شاعری مقبول ہے۔ ان کے کالم آج کے دور کی آواز ہیں۔ ان کے سفر نامے آج بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھے جلتے ہیں۔

11 جنوری 1978ء کو انشائی اس دنیا سے کوچ کر گئے لیکن وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ فاروقی سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

### اس شمارے میں

1. عید و اجماع و عظمتِ سرخسار کے ناول، تنزیلہ ریاض کا مکتبہ ناول - عبدالستار
2. نروا احمد کا مکتبہ ناول - اسٹیل
3. آسید مقصود و انجیل رمضان اور شاہ جہاں علی کے ناول
4. عائشہ فیاض، امبا خان اور سعدی گل کے انشائی
5. ماضی کی بائبل جیت فکاہ - ہارون سے مفاہات
6. ڈراما سیریل چنپ دہلے کے سرور و زمان سے باتیں
7. کرن کرن و دشمنی - احادیث نبویؐ کا سلسلہ
8. جوارے نام، نقیاتی از و انجیل اور عدنان کے مشورے اور دیگر مشعل سلسلے شامل ہیں۔

نئے سال کا پہلا شمارہ آپ کو کیا آگیا، اپنی دلچسپی سے نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

زور دینا صرف اس پر مستحق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور دھوری ہے اس لیے ان دونوں کا دین میں بہت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو ہر مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم ہر سال ایسا شمارہ کر رہے ہیں کہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز اقوال بھی شائع کریں گے۔

## کرن کرن روشنی

### ادارہ

### چالیس سال پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آپس میں بحث ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

”اے آدم! آپ ہمارے والد ہیں، آپ نے ہمیں عمروی کا شکار کر دیا اور گناہ کا ارتکاب کر کے ہمیں جنت سے نکلوا دیا۔“

آدم علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ ”اے موسیٰ! اللہ نے آپ کو شرف ہم کلامی کے لیے منتخب فرمایا اور آپ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تورات دی گئی آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری قسمت میں لکھ دی تھی؟ چنانچہ بحث میں آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام

پر غالب آ گئے۔ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ ”تین مرتبہ آپ نے فرمایا۔“ (بخاری) فوائد مسائل:

1۔ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ ملاقات ممکن ہے جنت میں ہوئی ہو، ممکن ہے عالم اولوح میں۔ واللہ اعلم۔

2۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد حضرت آدم علیہ السلام کو یہ طعنہ دینا نہیں کہ انہوں نے غلطی کی کیونکہ وہ غلطی تو اللہ تعالیٰ سے معاف فرمادی تھی۔ ارشاد باری ہے۔

”پھر انہیں ان کے رب نے نوازا، ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔“ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی وجہ سے تمام انسانوں کو دنیا کی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں وضاحت فرمادی کہ یہ مصائب تو پہلے ہی





تقدیر میں لکھے جا چکے تھے اور ان کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔  
 3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔  
 ”آدم علیہ السلام غالب آگئے“ یہ تکرار تاکید کے لیے تھی تاکہ بخوبی علم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام سے جو کچھ ہوا وہ تقدیر الہی اور مشیت الہی کا اجر تھا۔

### تقدیر پر بحث کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،  
 انہوں نے فرمایا۔  
 ”قریش کے مشرک تقدیر کے مسئلہ میں بحث کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے“  
 تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ترجمہ :  
 ”جس دن انہیں چروں کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) تم دونوں کی آگ لگنے کا مزا چکھو۔ بے شک ہم نے ہر چیز ایک انداز سے کے مطابق پیدا کی ہے۔“ (القمر)

### فوائد و مسائل :

- 1۔ اس آیت اور حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ملتا ہے۔
- 2۔ کفار کے لیے جہنم کا سخت عذاب مقدر ہے۔
- 3۔ واضح اور قطعی مسئلے میں اختلاف اور بحث کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

### تقدیر پر بحث

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر صحابہ کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے اس قدر سرخ ہو گیا کہ گویا اس پر انار کے دانے بچھڑ دیے گئے ہیں۔ (تب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ یا کیا تمہیں اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تم قرآن کی آیات کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہو۔ تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔“ (مسند احمد)  
 حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مجلس سے غیر حاضر رہنے پر خوشی نہیں ہوئی جس طرح اس مجلس میں موجود نہ ہونے پر خوشی ہوئی۔“

### فوائد و مسائل :

- 1۔ تقدیر اسرار الہی میں سے ایک راز ہے اس پر مجمل ایمان لانا کافی ہے اسی طرح دوسرے بھی امور کے بارے میں بھی جس قدر بتا دیا گیا اسے مان لینا کافی ہے اور جس چیز کی وضاحت نہیں کی گئی اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔
- 2۔ قرآن وحدیث کی نصوص کی وضاحت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ ان میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو ورنہ امت میں اخلاف و افتراق پیدا ہوتا ہے اور قرآن وحدیث پر ایمان میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔
- 3۔ قرآن وحدیث کے مطالبے کا اصل مقصد اخلاق و عمل کی اصلاح ہے۔ اگر کوئی شخص محض نذر خطابت کے اظہار کے لیے یا اپنے علم و فضل کا رعب جانے کے لیے پیچیدہ مسائل میں مشغول ہوتا ہے تو یہ اصل مقصد کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔
- 4۔ نصیحت کرتے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے بعض اوقات غصے کا اظہار بھی کیا جاسکتا ہے، خصوصاً جب کہ نصیحت کرنے والا قابل احترام شخصیت کا حامل ہو اور سامعین پر اس کے غصے کا منفی اثر پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود نہیں تھے کسی دوسرے صحابی نے انہیں یہ واقعہ سنایا، تاہم محدثین کے اصول کے مطابق یہ حدیث ”صحیح“ ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اسلم سے حدیث براہ راست سننے والے صحابی کا نام نہ ہو لیا جائے لیکن اس سے سن کر روایت کرنے والا بھی صحابی ہوا تو ایسی حدیث بالا اتفاق صحیح ہوتی ہے کیونکہ تمام صحابہ ”عادل“ (قابل قبول اور قابل اعتماد) ہیں۔

6۔ صحابی کو اس مجلس سے غیر حاضری پر اس لیے خوشی ہوئی کہ حاضرین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو اگر نیکی کی توثیق مل جائے یا وہ کسی گناہ سے بچ جائے تو اس پر خوشی کا اظہار کرنا غرور یا میں شامل نہیں بلکہ نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت کی علامت ہے جو ایمان کا ایک حصہ ہے۔

### بد شکونی

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی بد شکونی کی کوئی حقیقت نہیں نہ الکوئی چیز ہے۔“  
 ایک اعرابی انھیں کر آج کے قریب آیا اور کہا۔  
 ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دیکھئے نا ایک اونٹ کو خارش کی بیماری ہوتی ہے، وہ تمام اونٹوں کو خارش میں مبتلا کر دیتا ہے۔“  
 تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”یہ تقدیر ہے، پہلے اونٹ کو خارش کس سے لگی؟“

فوائد و مسائل : 1۔ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ اگر کسی بیمار کے پاس کوئی تندرست آدمی اٹھتا بیٹھتا ہے یا اس کے ساتھ کھاتا پیتا ہے یا اس کا لباس استعمال کرتا ہے تو اسے بھی وہی بیماری لگ جاتی ہے جو مریض کو تھی۔ عرف عام میں ایسی بیماریوں کو متعدی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیماری اس طرح ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جس وجہ سے پہلے آدمی کے جسم میں مرض پیدا ہوا ہے وہی وجہ کسی اور شخص میں بھی پائی جائے اور

وہ بھی بیمار ہو جائے۔ جدید طب میں جراثیم کا نظریہ بہت مقبول ہے لیکن یہ جراثیم بھی بحکم الہی اثر انداز ہوتے ہیں گویا دوسرے مریض کے بیمار ہونے کی اصل وجہ حکم باری تعالیٰ ہے نہ کہ مریض کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ اس کے علاوہ ہومیو پیتھک نظریہ علاج جراثیم کو امراض کا سبب ہی تسلیم نہیں کرتا، اس لیے اس نظریے کے مطابق بھی مرض کا ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہونا ایک غلط تصور ہے۔

2۔ عرب لوگ برندوں اور جنگلی جانوروں کے گزرنے سے شگون لیتے تھے۔ کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا تو کسی بیٹھے ہوئے پرندے یا ہرن وغیرہ کو پتھر مار کر بھگاتا، اگر وہ وہاں سے جان بچا جاتا تو سمجھا جاتا کہ کام صحیح ہو جائے گا، اگر بائیں طرف جاتا تو سمجھا جاتا کہ کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے کام محض توہم پرستی کا مظہر ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل بھی اس طرح کے توہمات پائے جاتے ہیں مثلاً ”کسی لنگرے یا ایک چشم انسان سے ملاقات ہو جائے تو اسے نحوست کا باعث قرار دیتا۔ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سمجھا کہ کام نہیں ہو گا یا کسی خاص عدد (مثلاً 7) یا کسی خاص دن (مثلاً منگل) یا کسی خاص مہینہ (مثلاً ماہ صفر یا شوال) کو نامبارک قرار دیتا بھی اسی میں شامل ہے۔ کوئی نقش بنا کر اس کے خانوں میں انگلی رکھنا یا اس قسم کے نال ناموں سے قسمت معلوم کرنے کی کوشش کرنا سب ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔

3۔ مشرکین عرب میں ایک غلط تصور یہ بھی پایا جاتا تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی روح الوکی شکل اختیار کر کے جنگلی اور چٹنی پھرتی ہے اور انتقام کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے ان لوگوں میں نسل در نسل انتقام اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہتا تھا حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی، اسی طرح الو کو منحوس تصور کرنا غلط ہے۔ وہ بھی نہ سری مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے جس کا انسانوں



کی قسمت سے کوئی تعلق نہیں۔

### دل کی مثال

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”دل کی مثال ایک پر کی سی ہے جسے ہوا میں چھیل میدان میں لٹائی پلٹائی رہتی ہیں۔“  
فوائد و مسائل :

1۔ پرندے کا اکھڑا ہوا ایک پر بہت ہلکی چیز ہوتا ہے جسے معمولی ہوا بھی سیدھے سے الٹا اور اگلے سے سیدھا کر سکتی ہے۔ اگر وہ کسی کھلے میدان میں ہو تو ظاہر ہے ہوا اس پر زیادہ اثر انداز ہوگی کیونکہ وہاں ہوا کے اثر کو کم کرنے والی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ بڑی تیزی سے الٹ پلٹ ہوتا دھڑلے سے لڑھکھڑاہٹ سے وہاں اڑتا پھرے گا، انسان کے دل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس پر مختلف جذبات و احساسات تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کبھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے کبھی گناہ کی طرف، کبھی اس میں محبت کے لطیف جذبات موجزن ہوتے ہیں، کبھی نفرت کی آندھی چڑھ آتی ہے۔ دل کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر شیطان اسے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے لہذا کسی کو نیکی کی راہ پر گامزن دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ضرور جنت میں جائے گا اور نہ کسی کو گناہوں میں غرق دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لازماً جہنمی ہے اس لیے نیکی کی توفیق ملے تو اللہ سے استقامت کی دعا کرنی چاہیے اور گناہ ہو جائے تو اشک ندامت کا نذرانہ لے کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ گناہوں کی آندھی اسے رحمت سے بہت دور لے جائے۔

2۔ چونکہ دل کی کیفیات کسی بھی لمحے تبدیل ہو سکتی ہیں اس لیے انسان اپنے انجام کے بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ایمان پر وفات کی دعا کی جائے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی کی

درخواست کی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کرتے تھے۔  
”اے دلوں کو پھیرنے والے! میرا دل اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر ثابت رکھ۔“

### عمر میں اضافہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”صرف نیکی ہی عمر میں اضافے کا باعث ہوتی ہے اور تقدیر کو محض دعا ہی نالتی ہے، بلاشبہ انسان کو بعض اوقات ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔“  
فوائد و مسائل :

1۔ یہ روایت بعض محققین کے نزدیک حسن درجے کی ہے جو البتہ اس حدیث کا آخری حصہ ”انسان اپنے برے عمل کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔“ کسی معتبر سند سے ثابت نہیں بلکہ صحیح البانی رحمۃ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ موضوع ہے۔

2۔ نیکی کا ثواب جس طرح آخرت میں بلندی ورجلت اور ابدی نعمتوں کا باعث ہوتا ہے اسی طرح نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی نعمت و عزت اور مزید نیکی کی توفیق سے نوازتا ہے اسی طرح برے عمل کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ملتی ہے ”الایہ کہ اللہ تعالیٰ معاف فرماوے۔“

3۔ عمر میں اضافے کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ (ا) یعنی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اچھے کاموں میں صرف ہوتی اور ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ (ب) نیکیوں کی توفیق ملتی ہے جس کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچتا رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے اچھی ہیں۔“

سے اچھی ہیں۔“

(ج) فرشتوں کو یا ملک الموت کو اس کی جو عمر معلوم تھی اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے یہ فرشتوں کے لحاظ سے اضافہ ہے اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ شخص فلاں سال تک کرے گا جس کے انعام کے طور پر اس کی عمر میں اس قدر اضافہ کر دیا جائے گا۔

تقدیر بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مصیبت سے انسان ڈرتا ہے، دعا کی برکت سے رک جاتی ہے اور آئی ہوئی مصیبت رفع ہو جاتی ہے۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو دعا کی وجہ سے چھلی کے پیٹ سے نجات مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔  
”اگر وہ (اللہ کی) پاکیزگی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہو جائے تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس (چھلی) کے پیٹ ہی میں رہے۔“ (الصفت 143-144)

یہاں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تبدیلی فرشتوں کے علم کے مطابق تبدیلی ہے اللہ کے علم میں تبدیلی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ فلاں شخص دعا کرے گا پھر اس کی مشکل حل ہو جائے گی۔

تک اس میں دعا کی ترغیب پائی جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا بھی جائز اسباب میں سے ہے جسے اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ عین توکل ہے۔

### عمل

حضرت سراقہ بن جعشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔  
”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا عمل ان امور میں شامل ہے جنہیں لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ ہو چکا یا اس کا تعلق آئندہ (فیصلہ ہونے والے معاملات) سے ہے۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”بلکہ وہ ان امور میں شامل ہے جن کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کا اندازہ ہو چکا اور ہر ایک کے لیے

وہ کام آسان ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ سیدھا کیا گیا۔“  
فائدہ : انسان کے نیک اور بد ہونے کا تعلق بھی تقدیر سے ہے لیکن بندے کو اس کا علم نہیں۔ وہ شریعت کے مطابق عمل کرنے کا مکلف ہے۔

### مومن

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”مومن ہمیشہ اپنے دین کے بارے میں کشادگی میں رہتا ہے جب تک وہ حرام خون (ہمارے کارکن کتاب) نہ کرے۔“ (بخاری)

### فائدہ :

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مومن جب تک کسی کا ناحق خون نہیں بہاتا اسے دین پر عمل کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے لیے کشادہ رہتی ہے (انجام) دونوں کا ایک ہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا زیادہ مستحق اور امیدوار ہوتا ہے اور جو ہی وہ قتل ناحق کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ کی رحمت کی امید کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے اور وہ ناامیدوں میں سے ہو جاتا ہے۔

### ناجائز لینا

حضرت خولہ بنت ثامر انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”بلاشبہ کچھ لوگ اللہ کے مال (ہیت المال) میں ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے لیے قیامت والے دن جہنم کی آگ ہے۔“ (بخاری)

### فائدہ :

قوی خزانے میں ناجائز تصرف اور اسے مصلح عامہ کے بجائے مصلح خاصہ کے لیے استعمال کرنا کبیرہ گناہ ہے جس پر اسے جہنم کی سزا ہو سکتی ہے اگر اس نے مرنے سے قبل خالص توبہ نہ کی۔







## انشائے الشاکِ باتیں

مختار حسن

وہی کھنچا ہوا قد، کشمکش بالوں میں لہریے گدگدی پر  
سے تقریباً "منڈے ہوئے" تھا تو شاعر اور دانشور مگر  
بال ہمیشہ چھوٹے رکھتا تھا۔ دیکھتے وہ سر ہلا رہا ہے۔  
باتیں کرتے وقت سر کو ہلکے ہلکے ہٹکتے رہتا اس کی عادت  
ہے۔ موٹے تال کی عینک کے پیچھے سے اس کی  
آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔ آئیے پوچھیں تو اس سے کہ  
آخر راہ فرار کیوں اختیار کی؟  
"کیوں انشائی! ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ کج ادائی؟"

"ارے بھائی! بات یہ ہے کہ سفر تو اپنا مقدر تھا اور  
ہم تو پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔  
کارواں دور کا دانا سپنوں کو بسرائے ہوئے  
لوگ تو جانے لگے انشا! چلو تم بھی چلو  
"نہیں انشائی! ہم سے یا تم سے نہ بناؤ۔ تم باہر تو اکثر  
جایا کرتے تھے مگر ہر دفعہ ایک نو تصنیف کتاب کا مسودہ  
اور ایک شفقت بھری مسکراہٹ کا تحفہ لے کر واپس  
لوٹ آتے تھے۔ مگر خیر، تمہیں کیا دوش دیں۔ تم سے  
کیوں شکایت کریں کہ تم کہہ چکے ہو کہ یہ شہر 'یہ  
قریبے تمہارا وطن نہیں ہیں۔ تم سدا کے رومانی عاشق  
تن آوارہ مزاج تھے۔"

"آہو وحشی جان کے تم کو ساتھ تمہارے پھرتے  
تھے۔"  
اور تمہیں بھی کچھ انہیں وحشیوں سے چاہت  
تھی۔ انہیں کی سنگت پسند تھی۔  
بستیاں قریبے گھوم چکے اب دشت کو لوٹیں، بن کو چلیں  
شام ہوئی آوارہ غزالو، آؤ کہ اپنے وطن کو چلیں  
انشائی تم تو خیر اپنے وطن کو لوٹ گئے یا بلغ عدن کو  
لوٹ گئے۔ مگر دیکھ رہے ہو، تمہارے اس ناوقت سفر  
نے کیا قیامت ڈھائی؟ تم ایک دن چپکے سے چلے گئے۔  
مگر جب تمہارا خاکی جسم تابوت میں رکھا ہوا گراچی آ  
کر اتر اتر دیکھا تھا، کیا بھوک بڑا۔ بیوی بچھاڑیں کھا رہی  
تھی، بچوں کو چین نہیں آتا تھا۔ بھائی بہنوں کی  
آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا رواں تھے۔ تمہارے  
یار دوست، تمہارے چاہنے والے، تمہارے مضافین  
پڑھنے والے، بلکہ شہر کا شہر نام کر رہا تھا۔  
لندن سے تمہاری سناؤنی سنی تو عالی نے پہاڑی  
رات آنکھوں میں کاشدہ۔  
قدرت اللہ شہاب آٹھ، نو سو میل کا سفر کر کے  
گراچی آئے کہ تمہارا آخری دیدار کر لیں۔ ارے بندہ  
خدا جانے کی ایسی کیا جلدی تھی۔  
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے دادوستہ کے  
کرنا ملک الموت تقاضا کوئی دانا اور  
میں کہتا ہوں انشائی! آخر تمہیں ہم سے شکایت  
کیا تھی؟ ہم لوگ تو تمہیں سر آنکھوں پر بیٹھاتے  
تھے جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ کیے جاتے تھے ہار  
پھول پہنائے جاتے تھے۔ لو صاحب پھر بھی آپ  
فرماتے ہیں۔  
ان لوگوں کی بات کرو جو عشق میں خوش انجام ہوئے  
نجد کے قیس، یہاں کے انشا خوار ہوئے بدنام ہوئے  
مگر ہم نے تو کبھی نہ سنا اس بدنامی کا قصہ۔ ہاں اپنی  
بہاری کی طرح چھپاتے رہے ہو تو دوسری بات ہے۔  
مگر کمال ہے، اپنے چلے جانے کی یہ شخص کیا کیا  
تاویلیں کرتا ہے۔

ہم ہٹل کے جوگی ہم کو ایک جگہ آرام کہاں  
توج یہاں، کل اور ذکر میں، صبح کہاں اور شام کہاں  
میری جان انشا! تم تو جوگی ہو گئے مگر تم چاہتے ہو کہ  
تمہارے چاہنے والے بھی بڑگ لے لیں۔ اب کے  
سفر کے بعد تم نے اس توڑ دی۔ چہرہ چھپا کر اپنے  
چیمتوں کی دنیا سونی کر دی۔ تمہارے لطیفوں کی  
پھا جڑیاں کیا جوت جگایا کرتی تھیں۔ تم کیا گئے کہ  
اندھیرا چھا گیا۔ تم خوب جانتے ہو کہ جب جانے والا  
پلا جاتا ہے تو لوگوں کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر نہ  
جانے تو یہ کیوں کر کہتے۔  
کس کا چہرہ چمکتا لائیں، کس سورج سے مانگیں دھوپ  
گھور اندھیرا چھا جاتا ہے غلوت دل میں شام ہوئے  
تم اپنی شاعری میں عشق کا دم بھرتے تھے بڑے  
عاشق بنے پھرتے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھا کہ تم خود کتنوں  
کے محبوب تھے؟ اور اب اپنے عاشقوں کا حال تک  
نہیں پوچھتے۔ خود را نصیحت، دیگر اس را نصیحت۔ تم  
باداوی تھے۔  
اپنی اہاں سے ہلکے نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق  
لوگ  
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا  
اپنا چلو، چشم تصور میں ہی آتے رہو، خواب ہی  
میں جلوہ دکھاتے رہو ہمیں منظور ہے۔  
ہٹل جنگل شوق سے گھومو، دشت کی سیر بدم کرو  
انشائی! ہم پاس بھی لیکن رات کی رات قیام کرو  
انشائی تمہاری وہی حالت ہے کہ "من نہ کروم  
شانزہ کند۔" ایک طرف آپ نصیحت فرماتے ہیں  
کہ۔۔۔  
میر مغفور کے اشعار نہ پیہم پڑھنا  
چینی والوں کو ابھی اور بھی جینا ہوگا  
اور خود یہ حالت بنارکھی ہے کہ۔۔۔  
آوارہ آوارہ پھرنا چھوڑ کے منڈی یاروں کی  
دیکھ رہے ہیں دیکھنے والے انشا کا اب حال وہی  
بلکہ نوستہ! نہما رسید کہ۔۔۔

کیا اچھا خوش باش جواں تھا جانے کیوں بیمار ہوا  
اٹھتے بیٹھتے میر کی بیتیں پڑھنا اس کا شعار ہوا  
اور آخر وہی ہوا جو ہونا تھا اور تقدیر کا بد ا تھا۔ وہوں آ  
کیا جب آنکھیں دھونڈتی ہیں کہ انشا کہاں گیا۔  
اے متوالو، نالتے والو، ورنہ اک دن یہ ہوگا  
تم لوگوں سے آتے جاتے پوچھیں گے انشا کا پتا  
انشائی! تم اپنے گرو میر تقی میر سے ملے ہو گے۔ وہ  
خستہ تن تم سے مل کر ضرور خوش ہوا ہوگا۔ شعر میں وہ  
تمہارا استلو تھا۔ تمہارے اشعار میں بھی آہوں کا  
دھواں ہے۔ عشق کی آگ سلگتی بھڑکتی رہتی ہے۔ سدر  
کی لمبیں اٹھتی ہیں۔ تمہارے بول بیٹھے ہیں۔ ان  
میں غضب کی گھلاوٹ ہے مگر تم خود مانتے ہو کہ میر میر  
تھا، تم محض پیرو ہو اور حال یہ ہے۔  
اک بات کہیں گے انشائی! تمہیں ریختہ کہتے عمر ہوئی  
تم ایک جہاں کا علم بڑھے، کوئی میر سا شعر کہا تم نے  
مگر جہاں من تمہاری نثر؟ وہ تمہاری اپنی خاص چیز  
ہے۔ خدا کی پناہ۔ تمہاری نثر کی البیلی ناگن خوب دوستی  
ہے۔ ہاں زہر نہیں چھوڑتی۔ تم نے وہ فقرے بازیاں  
کی ہیں کہ لوگ تمہیں پڑھ کر لوٹن کبوتر بن جاتے  
ہیں۔ اس فن کے تم استاد ہو۔ حباب کی اور اخبار کی  
زندگی ہی کیا۔ لیکن اخبار میں وہ چند مربع انچ جہاں  
تمہارا قلم موتی جڑا کرتا تھا زندہ جاوید ہو گئے۔ شعراء  
شعر میں تعلی کیا کرتے ہیں، تم نے نثر میں بھی  
تعلی کی مگر اس طرح گویا تمھیں گدگد ارہے ہو۔ یاد  
ہے جرمنی کی یہ بڑی بی بی جس سے تم نے بلیڈ خریدے  
تھے؟ وہ انگریز تھی۔ آپ فرماتے ہیں۔  
"اس بے چاری کو جرمن نہیں آتی صرف  
انگریزی آتی ہے۔ ہماری طرح دونوں زبانوں پر قادر  
نہیں معلوم ہوتی!"  
اور پھر وہ جرمن ٹیکسی والا جس کی شامت اعمال کہ  
اس نے آپ کو گڈ مارنگ کہا اور جناب نے کس  
پدرانہ شفقت سے فرمایا۔  
"عمیاں خوب انگریزی پوسلے ہو۔ ہمارے مقابلے



کی نہ سہی پھر بھی اچھی خاصی ہے۔

دنیا کے لوگ کے بت کھانا! طوطے میں بھی تمہارا جواب نہیں۔ تم نے کاروبار کرنے والے غریب پاکستانیوں کو خوب کچھ دے دیے ہیں جس کی کسک اب تک محسوس ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ”اہل فرنگ میں نیکی و نیک چلتی کا فقدان ہے کیونکہ شراب اکثر پیتے ہیں۔ گوشت بھی ملا لیتے ہیں۔ ذہنی کا نہیں کھاتے۔ پروے کا بھی چنداں خیال نہیں ہے۔ دکان دازوں کے ہاتھوں پر گئے اور ہاتھوں میں لپیٹ لیں یعنی ان کی عاقبت کا معاملہ مشکوک ہے لیکن ملاوٹ کا کاروبار نہیں۔ دودھ، دہی اور مکھن مسکاسب خالص ملتا ہے۔ چائے کی پتی میں بھی جتنے کا چھلکا نہیں ہوتا نہ بلدی میں انہیں ہوتی ہیں۔ چینی دکانوں سے بلک جھلکتے غائب نہیں ہوتی نہ آٹا کہیں جاتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ مین ہولوں کے ڈھکنے تک نہیں چراتے پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے ہر مردے۔“

انشائیہ یہ سچ ہے کہ تمہارے شعر کی کھلاوٹ اور ”غنائیت“ میریت کا پر تو ہے۔ لیکن تمہاری ”انشائیت“ تمہاری نثر میں ہے۔ یہ بڑی تختہ چڑ ہے۔ سیدھی سادی آسان زبان، چھوٹے چھوٹے فقرے متوازن طرزِ ادا، کوئی پیچ نہیں، کوئی سنگلاخ مقام نہیں، بدھنسی پیدا کرنے والے ثقیل الفاظ نہیں کہ لغت ساتھ لے کر بیٹھو تو پڑھو۔ بھی میرا تو یہ حال ہے کہ جب تم یاد آتے ہو تو تمہاری تحریریں پڑھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہو۔ محاورے کا نمک اور کلاسیکی تلمیحات کے مسالے اس پر معصوم سا طنز و مزاح لطف آجاتا ہے۔ مولوی عبدالحق کی صحبت سے تم نے فائدہ اٹھایا۔ تم نے یہ راز پایا کہ تحریر میں رچاؤ پیدا کرنے کے لیے کلاسیکی، شاعری اور تہذیبی پس منظر کتنا اہم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ کئے کنگوے کی طرح جدھر کی ہوا ہوئی اودھر کو ہلکے گئے۔ اگر تم غالب کے رسیانہ ہوتے تو میاں شیر محمد خاں انشا یہ کیوں کر لکھتے مرے، شعر تجھ پر بھی رحمت خدا کی۔

اور اگر تم نے اسماعیل میرٹھی کی ذہن لقمہ نہ پڑھی ہوتی کہ

اک لڑکی بکھارتی تھی وال  
وال کرتی تھی عرض یوں احوال  
تو یہ جملے کمل سے لاتے۔

”وال منگی ہے اتنی کہ وہ لڑکیاں جو اسماعیل میرٹھی کے زمانے میں وال بکھارا کرتی تھیں۔ اب فقط منگی بکھارتی ہیں۔“

بھئی بقول بادریچوں کے کیا مزے دار ”تڑکا“ لگایا ہے اور کھانے کا ذکر ہو تو تم نے یہ بھی خوب کہا کہ ”گوشت نہ کھانے والا ہر شاعر معری نہیں ہوتا۔ بعض منگا ہونے کی وجہ سے نہیں کھاتے۔“

انشائیہ میں مرزا کی طرح آدمی تھے ویسے ہی طنز نگار بھی ہو۔ چکیاں لیتے ہو، پھر کر حملہ نہیں کرتے مگر فقرہ ایسا چست کرتے کہ تیر کھانے والا تیر کھا کر بھی مسکراتا ہے۔ تمہارے متعلق مشتاق یوسفی نے کہ وہ خود بھی لیلائے مزاح کا دانشناس ہے کھاسی بات کہہ ڈال کہ

”بچھو کا کاٹا روتا ہے۔ سانپ کا کاٹا سوتا ہے اور انشا کا کاٹا سوتے میں مسکراتا بھی ہے۔“

انشائیہ میں تم نے تاریخ نویسی کی بھی نئی ادا اختیار کی۔ خوب لکھا ہے۔ ”بھائی تیر کو بڑا ہی زیرک اور سمجھ دار جانا چاہیے کہ اس نے محض کبوتر اڑانے سے نور جہاں کی لیاقت کا اندازہ کر کے اس سے شادی کر لی۔ اس کے سلیقہ شعار، پابند صوم و صلوة یا۔ کشیدہ کاری کا ماہر وغیرہ ہونے کی شرط نہ رکھی۔“

”شاہ جہاں بڑی دور رس نظر رکھتا تھا۔ تاج محل نہ ہوتا تو آج بھارت کی نورسٹ ٹریڈ کو اتنی ترقی نہ ہوتی۔“ پتا نہیں۔ سو برس بعد کوئی تمہارے اس فقرے کا مزالے سکے گا نہیں کہ

”ہاویوں کا بیٹا اکبر سندھ کے سفر میں امرکوٹ میں پیدا ہوا تھا۔ اصطلاح میں اسے نیا سندھی بھی کہہ سکتے ہیں۔“

اور پھر۔

”اکبر اور بیچوں بقال کی لڑائی پانی پت میں شروع ہوئی تو ہمدردوں نے اس کے جدی وطن سے پیغام بکھوایا کہ تم اور بیچوں یہاں تاشقند آؤ، صلح کرائے دیے ہیں۔ لیکن اکبر نہ مانا۔ بیچوں ایک ہاتھی کے دودے میں بیٹھا روئے آنے پانی کا حساب لکھ رہا تھا کہ اس لڑائی کا مال غنیمت فروخت کر کے کسی کاروبار میں پیسہ لگائے کہ ناگہاں ایک تیر قضا کا پیغام لے کر اس کی آنکھ میں لگا اور وہ بے سدھ ہو کر گر گیا بیچوں بقال کو ہم تانت کا پہلا موٹے ولایان کہہ سکتے ہیں۔“

مجھے معلوم نہیں کہ انشا تمہیں کبھی پی جی ہوڈاؤس سے بھی دلچسپی رہی ہے یا نہیں مگر تمہارے بعض لفظوں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے مثلاً

”کبوتر کی دو قسمیں ہیں۔ نیلے کبوتر اور سفید کبوتر“

نیلے کبوتر کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور سفید کبوتر بالعموم سفید ہی ہوتا ہے۔

اور پھر طنز کی یہ کلاں۔

”طوطے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جنگلی طوطے جو

باہل میں رہتے ہیں۔ پالتو طوطے جو پنجروں میں رہتے

ہیں۔ پالتو طوطے جنہیں جنگل میں رہنے نہ پنجرہ۔ آئے

دن ان کی وطنیت کا سوال اٹھاتا رہتا ہے۔“

ہائے ہائے انشا محفل میں لپیٹ کر لگانا اسی کو کہتے

ہیں۔

سوال۔ پاکستان میں کون رہتا ہے؟

جواب۔ پنجابی سندھی وغیرہ

سوال۔ پنجابی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں

سندھی تو ہندوستان میں بھی رہتے ہیں۔ بنگالی تو

ہندوستان میں بھی رہتے ہیں پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا؟

جواب۔ غلطی ہوئی معاف کر دیجیے آئندہ نہیں

بنائیں گے۔

انشائیہ میں تمہارے لیے اتنی ہی سہل تھی

جسے آپس میں باتیں کرنا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شام

تمہیں کہیں مضمون پڑھنا تھا۔ میں تمہارے دفتر پہنچا

کہ جلسے میں ساتھ ساتھ چلنے کا پروگرام تھا۔ تم دفتر

کام کر رہے تھے۔ فون بھی آ رہے تھے۔ باتیں بھی جاری تھیں اور ساتھ ساتھ ایک پرچہ پر مضمون بھی لکھ کر جلد جلد تیار کر رہے تھے جو کھٹے بھر بعد پڑھنا تھا۔ اسی طرح تمہاری کالم نویسی تمہاری زود لکسی کی مرہون منت تھی۔ یہی شاید تمہاری تحریر کی بے ساختگی کی وجہ ہے۔ اس میں آدھے آدھے اور نہیں۔

انشائیہ واقعی دوستوں کے دوست تھے۔ یاد ہے جب میری کتاب چھپ رہی تھی تو تم ضد کرتے تھے کہ اس میں کارٹون ضرور ہوں گے۔ اس پر جملہ بازیاں بھی ہوتی تھیں۔

میں کہتا تھا کہ آؤ ہم اپنی تصویریں لگا دیں! میں نے تم سے کہا تھا کہ ”چھوٹو کس چکر میں پڑتے ہو۔“

تم نے جواب دیا کہ ”بھئی مجھ پر چھوٹو۔“ پھر تم نے کارٹون بنوائے۔ اور تقریب تعارف میں وہ خوش و خوش دکھلایا کہ میں بھول نہیں سکتا۔

تم ایسے شاعر و نثر نگار تھے جس سے قاری کو الفت ہو جاتی ہے۔ یہی تمہاری سب سے بڑی جیت تھی۔ یوں مرزا تو برحق ہے تم کہتے تھے

یاں تو آیا جو مسافر یونہی شب بھر ٹھہرا

سرائے ہے یہاں کس کا ٹھکانہ ڈھونڈو

لیکن انشائیہ! ایسا لگتا ہے کہ تم نے شب بھر بھی

قیام نہ کیا۔ رات تو ابھی بچی تھی، چاند تو ابھی

بھی نہ تھا۔ چکورو تو بولے بھی نہ تھے۔ ابھی تو یہ حالت

تھی کہ۔

آغاز شباب شب ہے پیارے

جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

لیکن تم آئے۔ ادھر چکی لی۔ اودھر گدایا۔ کسی پر

فقرہ کسا، کسی کا منہ چڑایا جو کیوں کی طرح ایک لغو

مستانہ لگایا۔ اپنی شہرت کا خرقة کاندھے پر ڈالا۔

عقیدت و محبت کے سکوں سے بھرا ہوا کشکول سنبھالا

اور لوگوں کو دوتا چھوڑا اپنا دامن جھٹک کر چلتے بنے واہ

انشائیہ! خوب رسم و رواج تھا۔

خوب ہمارا ساتھ لہجہ، بچ بھنور کے چھوڑا ہات

ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا لکے ہو اچھی بات

ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا لکے ہو اچھی بات



## ہمالیہ سے صداقت

شاہین رشید

ہیں مگر کچھ ایسی بھی ہیں جو ہر دور کو انجوائے کرتی ہیں اور حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں کہ اب ہم بڑے ہو گئے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ بڑھاپے میں انسان کی شخصیت میں وقار اور بردباری آجاتی ہے۔

ہمالیہ اب ایک طویل عرصے کے بعد اسکرین پر واپس آئی ہیں اور آپ یقین کریں کہ ان کے اسکرین آتے ہی ان کے انٹرویوز کی فرمائشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اپنی مصروفیات کے باعث بڑی مشکل سے ہاتھ آتیں لیکن شکر کریں کہ آتیں۔

”کیسی ہیں ہمالیہ۔ آج بہت خوش ہو رہی ہے آپ سے بات کر کے۔ بہت شکریہ وقت دینے کا“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ میں مصروفیات باشاء اللہ اتنی ہیں کہ وقت نکالنا ذرا مشکل ہو رہا تھا۔“

”جی۔ آج کل کیا مصروفیات ہیں۔ کیا آن ایر ہے کیا انڈر پروڈکشن ہے؟“

”آج کل سوپ ”سسرال میرا“ آن ایر ہے پرائیویٹ چینل سے آتا ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ کیوں کیا یہ رول۔ میں نے کہا کہ ابھی ٹھیکل ٹھیکل کے رول بہت ہو گئے اب کچھ چنچ آنا چاہیے۔ اپنے آپ کو انسٹیبلش کروانا تھا۔ سو کافی سال پہلے کروالیا ”سسرال میرا“ کے علاوہ ”محرم“ آن ایر ہے۔

— جینا دشوار سہی ”لی بی وی ہوم سے آن ایر ہے کافی ٹیلنٹ کی ہیں۔ گزری عید پہ سرگدھوٹ کا کامیڈی بے کیا تھا تو کام بہت ہو رہا ہے۔ لیکن ہر اسکرین کا بھی مزہ نہیں ہے کچھ اسکرین ایسے بھی پڑے ہوئے ہیں جن پر کام کرنے کو دل ہی نہیں کر رہا۔ وہی ٹھیکل اسٹوریٹ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں یہاں سے گئی تھی پاکستان سے تو اس وقت



برسوں بعد جب ماضی کی حسین فنکارہ ”ہمالیہ“ کو ماں کے رول میں دیکھا تو احساس ہوا کہ وقت کسی کا نہیں اس نے سب کو چھو کر گزر جانا ہے۔ انسان وہی اچھا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو وقت کے سانچے میں ڈھال لے۔ میں نے اکثر حسین فنکاروں کو دیکھا ہے کہ جب جوائی ڈھلنے لگتی ہے تو وہ گوشہ نشین ہو جاتی

ہمارے ڈراموں کے موضوعات بہت اچھے ہوا کرتے تھے تو کام کرنے کا بھی مزہ آتا تھا۔ اور ڈرامہ دیکھنے کا بھی مزہ آتا تھا۔ اب تو محض موضوعات ہوتے ہیں بس۔ ایک فیکٹری بن چکی ہے ایک منڈی بن چکی ہے۔

”یعنی مزہ نہیں آ رہا، مجبوری میں کر رہی ہیں؟“

”مزہ ابھی رہا ہے اور نہیں اب اتنے سارے چینل کھل گئے ہیں کہ اب آپ صرف لی بی وی تک محدود نہیں ہیں۔ نئے نئے آرٹسٹ آگئے ہیں۔ لوجوان ڈائریکٹرز آگئے ہیں جو کہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ بہت عزت کرتے ہیں سب میری اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔ جسے انسان عزت کا ہی بھوکا ہوتا ہے۔ اس پر بات میں نے ضرور نوٹ کی ہے کہ کہنی تھوڑی نی اس آرگنائز ہے۔ بے منس کا تھوڑا مسئلہ ہوتا ہے اور اس کے لیے اپنا ہونا اور ہر ایک مرد رہا ہے۔“

”ایسا۔ ایک سینئر ہونے کی وجہ سے آپ اپنی مرضی کی بے منٹ نہیں کیتیں کیا؟“

”جی۔ آپ کو پتا ہے کہ ہمارے یہاں کوئی کمٹمنٹ دینا نہیں آتا، لی بی وی پر وہ زبان ہدیہ میں اور یہاں ابھی سرسبز ہے۔ لیکن اب وہاں بے منس مل تو جاتی ہیں مگر راز دارا کر ٹون کر کے، ایسے یہ ہم پر کوئی انسان کر رہے ہیں۔ بس کیا کر سکتے ہیں۔ اور ڈراموں میں بھی ایک بھیڑ چال چل پڑی ہے۔ شادیوں سے کام ایک ایسے موضوعات کم سے کم ہمارے زمانے میں لایا نہیں ہوتا تھا۔“

”ہمارے ڈراموں میں عورتیں بڑی مظلوم دکھائی پاتی ہیں؟“

”ہوتے ہوئے۔“ عورتیں مظلوم بے چاری تھپڑ کھاتی رہتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں ایک کلاس ایسی ہے جن کو اس قسم کے ڈرامے بہت پسند ہیں۔ تو ان کا ایسٹ بھی بدلنا چاہیے۔ کتنا مظلوم دکھائیں گے عورت کو۔ عورت تو اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ اسے اسٹرائک دکھاؤ، جو کہ اب حقیقت ہے، تاکہ کمزور اور مظلوم عورت میں بھی آگے بڑھنے کا

حوصلہ ہو۔ اور ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گی کہ میڈیکل سائنس سے یہ ثابت ہوا کہ گزرتا میجر بیماریوں کو ٹرانسفر بھی کرتی ہے اور جنم بھی دیتی ہے۔ ہمارے ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے کہ بھالی کے بیٹے سے شادی ہو رہی ہے۔ ما میں تڑپ رہی ہیں کہ میری بس کے بیٹے یا بیٹی سے شادی ہو جائے۔

”یہ جانتیں کہ انٹاروے کہاں رہیں۔ کس ملک میں رہیں۔ وقت کیسا گزرا اور اسکرین سے کیوں غائب ہو میں؟“

”ہر چیز کا ایک ٹائم ہوتا ہے اور انسان کی قسمت میں سب کچھ لکھا ہوتا ہے جہاں اس کو جانا ہوتا ہے چاہے وہ لاہور ہو، کراچی ہو، امریکہ ہو یا لندن ہو۔ تو 1998ء میں میں امریکہ چلی گئی تھی۔ کیونکہ میرا دانہ پانی وہاں لکھا ہوا تھا۔ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں میرا قیام رہا۔ وہاں رشتے دار تھے۔ ڈیڑھ سال ہوا سے مجھے پاکستان آنے ہوئے اور درمیان میں ایک بار پہلے بھی آئی تھی تو دوستوں اور رشتے داروں نے کہا کہ واپس آ جاؤ اور یہاں آکر ڈراموں میں کام کرو۔ چنانچہ وہاں جا کر سب کی باتوں پر غور کیا کچھ سوچا اور پھر آگئی۔ یہی کام چھوڑ کر گئی تھی۔ اسی کام کو دوبارہ شروع کر دیا۔“

”وہاں امریکہ میں کیا کرتی تھیں۔ جاب کی یا کوئی بزنس؟“

”وہاں رہ کر تو آپ کو پتا ہے کہ جاب کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ سوا اخراجات ہوتے ہیں ضرورتیں ہوتی ہیں۔ تو میں ہارڈ ور اسٹور میں کام کرتی تھی اور مجھے انٹیریر کا ڈیزائنمنٹ ملا ہوا تھا اور ہمارے پاس تقریباً 100 کے قریب اکاؤنٹ ہوتے تھے اپڈورٹائرنگ ایجنسیز کے، موٹن پیکچرز جیسے سونی وغیرہ کے تو ان کی سیٹ ڈیزائننگ کیا کرنی تھی اور وہ بہت دلچسپ کام تھا اور مجھے بہت مزہ آتا تھا کیونکہ اگر جاب مزے کی نہ ہو تو بڑی بوریٹ ہوتی ہے۔ تو ہوا اچھا وقت گزرا۔ اور اچھا کمایا بھی۔“

”اب مستقل آئی ہیں یا واپس جانے کا ارادہ ہے؟“





”پہلے میں چوڑی تھی۔ اب بھینر چال کا حصہ بن گئی ہوں۔ کیونکہ پہلے ہمارے پاس صرف پی ٹی وی ہوتا تھا اور بہت بعد میں این ٹی ایم آیا۔ اس وقت ہم سال میں صرف دو سیریز ہی کر سکتے تھے وہ بھی بیک وقت نہیں بلکہ گپ دے کر۔ تو جب انٹرنیٹ کا کام تھا تو پھر ازنی ہو جاتا تھا کہ ہندوہ کرور کرے جو یادگار رہ جائیں۔ اور اگر آپ دیکھیں تو میں نے کوئی بہت زیادہ کام نہیں کیا گزرے زمانے میں۔ مگر جو کیا وہ اچھا کیا اور وہ ہی یادگار رہ گیا میں جب پاکستان واپس آئی تو اسی ذہن کے ساتھ کہ یہ نہیں کرنا وہ نہیں کرنا۔ پھر سوچا نہیں بھئی وہ ہی کچھ کرو جو سب کر رہے ہیں۔ ڈراموں کی سب باتیں رو رہی ہیں تو چلو میں بھی رو لیتی ہوں۔ سب باتیں نگینو بدل کر رہی ہیں تو چلو میں بھی کر سکتی ہوں۔ تو میں تو ہر طرح کے بدل کرنے کو تیار ہوں۔ اور میں ہاؤس کی کہ ماں کے بدل سے ہٹ کر بھی کوئی کرار کروں۔ کسی پاگل کارول۔ صحرا میں بھٹکتی ہوئی عمرت کارول وغیرہ۔“

”انڈین ڈرامے دیکھتی ہیں۔ وہ آگے ہیں ار اموں میں یا ہم؟“

”ارے نہیں نہ پہلے کبھی دیکھے تھے نہ اب دیکھنے کا ارادہ ہے۔ انڈین ڈرامے تو ہماری پنجابی فلموں کی طرح ہوتے ہیں۔ ڈھن ڈھن کرتے ہوئے۔ تو مجھے تو کبھی بھی پسند نہیں آئے۔ اور چونکہ میں نے کبھی ان کے ارادے دیکھنا پسند ہی نہیں کیے تو نہیں بتا سکتی کہ کون آگے اور کون پیچھے۔ لیکن میں پھر بھی یہ ضرور کہوں گی کہ ہمارے ڈرامے انڈین ڈراموں سے بہت بہت آگے ہیں کیونکہ وہاں امریکہ میں مجھے اپنے پاکستانی ڈراموں کا فیڈ بیک ملتا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی تبدیلی آتی بہت ضروری ہے۔“

”مستقبل میں کیا کچھ کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ہنس اس فیلڈ میں رہ کر کام کرنا ہے۔ جنوری سے مارچ تک کے سیریز سائن کیے ہوئے ہیں میں نے فور درمیان میں امریکہ کا ایک چکر لگانے کا ارادہ ہے۔ آئی تو میں یہاں ایک دو ماہ کے لیے تھی۔ مگر پھر یہیں کی ہو

آنکھوں پہ لگائی ٹپ ٹپ آنسو بنے لگتے ہیں۔ کیونکہ کردار ہی رونے دھونے والے ہوتے ہیں۔“

”گزرے زمانے میں ڈرامے فیڈ بیک کو دیکھ کر بنا کرتے تھے اب پہلے پورا سیریل ریکارڈ ہوتا ہے پھر آن ایر ہوتا تھا۔ تو پہلے زیادہ بہتر تھا اب زیادہ بہتر ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہا اب اچھا ریٹس ملے یا برا آپ اسے چنچن نہیں کر سکتے۔ اور پہلے تین ماہ کی ایک سہ ماہی ہوا کرتی تھی اور تین ماہ کے بعد نئے ڈرامے اور دیگر پروگرام آن ایر ہوتے تھے۔ مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ پھر پہلے ڈرامے کے لیے ریسرسل بھی بہت ہوتی تھی۔ ڈسکشن بھی بہت ہوتا تھا راسٹر اور ڈائریکٹر کے درمیان۔ اب اس طرح کا کام نہیں ہو رہا۔ نئے نئے لوگ اپنی اپنی کہانیاں لے کر آجاتے ہیں۔“

”آپ جوانی میں اس میڈیا کو چھوڑ کر گئیں اور 14 سال بعد آپ کی واپسی ہوئی۔ بیک سے انڈیڈو لڑیں آگئیں۔ تکلیف ہوئی یا اچھا لگا۔ کیا محسوس ہوا؟“

”نہیں نہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور انسان ایک ہی دور میں رہے تو بائگ ہو جائے۔ تبدیلی تو بہت ضروری ہے اور مجھے بالکل بھی برا نہیں لگ رہا بلکہ میں اپنے کام کو بہت انجوائے کر رہی ہوں۔ چاہے کام جیسا بھی مل رہا ہے۔ ہمارے راسٹر کے پاس ٹاپک نہیں ہیں وہی ہیرو ہیروئین پہ گھوم رہی ہیں کہانیاں۔ جبکہ پاکستان میں ایشیائی ممالک میں تو موضوعات کی بھرمار ہے۔ ہر گھر میں ایک کہانی موجود ہے۔ بس جو چل رہا ہے سو چل رہا ہے۔ کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں دیکھ رہا۔ پروڈکشن کمپنیز میسج بنا رہی ہیں ماشاء اللہ سے۔“

”ریننگ کا بڑا زور ہوتا ہے؟“

”جی بالکل ایک مود کی دو دو تین تین شادیاں کروائیں گے تو ریننگ تو بڑھے گی ہی نا۔ یا کچھ اس طرح کے موضوعات ہوں گے چٹ پٹے تو ریننگ تو بڑھے گی ہی نا۔“

”روز کے معاملے میں چوڑی ہیں یا کتنی ہیں کہ چلو بھینر چال میں ہم بھی شامل ہو گئے تو کیا ہوا؟“

”جانا آتا تو انشاء اللہ لگا رہے مگر وہاں انٹرنیٹ نہ رہ کر آئی ہوں تو ایک دم ٹوکٹ آف نہیں کر سکتی۔“

”جب آپ واپس پاکستان آئیں تو لوگوں نے دیکھ کر کیا اندیشہ کے چکر لگائے پڑے؟“

”ارے نہیں نہیں۔ ماشاء اللہ سے۔“ وارم ویلم“

ملا مجھے اور جب میں واپس آئی ہوں تو میں نے کسی کو بتایا نہیں بلکہ اپنے لپارٹمنٹ کو رپورٹ کر دے میں مصروف تھی۔ تو جب میری آمد کا سب کو بتا چلا تو سب بہت خوش ہوئے اور کام کی آفرز آئیں۔ مگر ابتدا میں میں نے چھوٹے چھوٹے روزے کیے تاکہ اپنی فارم میں واپس آ جاؤں۔ اب بڑے روزے بھی لینے لگی ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ ایک آرٹسٹ چار چار سیریز میں بیک ہوتے ہیں اور کام کر رہے ہوتے ہیں اور کیوں نہ کریں مگر انہیں اچھا کام بھی مل رہا ہے اور کمائی بھی ہو رہی ہے۔ مگر جیو چھیں تو مجھ سے بیک وقت اتنے سارے روزے نہیں ہوتے اور پھر کچھ آرگنائزڈ قسم کا کام بھی نہیں ہو رہا تو زیادہ کام نہیں لیتی میں۔“

”امریکہ میں جب اپنے ڈرامے دیکھتی تھیں تو ڈرامے اچھے لگتے تھے یا کڑھتی تھیں کہ یہ کیا کام ہو رہا ہے؟“

”کم دیکھتی تھی لیکن دیکھتی ضرور تھی۔ اور اچھے لگتے تھے زیادہ نہیں کڑھتی تھی (ہنستے ہوئے) اور میری ایک بہت اچھی دوست ہیں جو کہ راسٹر بھی ہیں ”غذرا یار“ جو ایک لائن بھی لکھتی ہیں تو لالچک کے ساتھ لکھتی ہیں تو جب ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر ڈرامہ دیکھتی تھیں تو ضرور کہتی تھیں ”یار یہ کیا ہے؟“ سٹ کام بھی بہت عجیب اور بے ٹکے قسم کے ہوتے تھے ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بہت آرگنائزڈ اور ڈسپلن کے ساتھ کام ہوتا تھا اب تو ہر لمبے میں روٹا دھونا پچا رہتا ہے۔ جن لڑکیوں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں وہ بہت اچھی بچیاں ہیں ان سے کوئی اچھا اچھا کام کروائیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اب تو لڑکیوں کے ہاتھ میں ورک Vix ہوئی ہے جہاں

”مزیں ہاتھوں سے پہلے کچھ اپنی فیملی کے بارے میں جانتیں؟“

”راولپنڈی میں یکم دسمبر کو پیدا ہوئی۔ پاپا آری میں تھے اور ماما رسل تھیں فوجی فائونڈیشن اسکول کی انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور پاپا یو پی میں پیدا ہوئے کورالہ آباد یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی ایک میرے بھائی ہیں جو کہ پی ٹی وی اے میں کیپٹن ہیں۔ بھائی کے بعد میرا نمبر ہے اور پھر میری ایک چھوٹی بہن ہے وہ امریکہ میں ہوتی ہے اور تدریس کے شعبے سے وابستہ ہے۔ وہ شادی شدہ ہے اور اس کے ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں اور میں نے شادی نہیں کی۔“

”کیوں؟“

”پتا نہیں کیوں۔ شادی کا کبھی موڈ بنا ہی نہیں۔ اب بھی لوگ کہتے ہیں کہ شادی کر لو۔ سوچ لو۔ تو میں یہی کہتی ہوں کہ دنیا میں جہاں لڑکیوں کی شادیاں ہو رہی ہیں وہاں اگر ایک آدھ۔ کی شادیاں نہ بھی ہوئیں تو کیا فرق پڑتا ہے دنیا کو۔“

”دنیا کو تو فرق پڑتا ہی نہیں ہے۔ فرق تو اپنی زندگی کو پڑتا ہے۔ جب زندگی اکیلے گزار لی پڑتی ہے۔“

”ہاں کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں لیکن میں نے





دیکھا ہے کہ جن کی شادیاں ہوئی ہوتی ہیں وہ کون سی بہت اچھی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور یہ نہ کہیں کہ اکیلے انسان کی زندگی نہیں ہوتی یا ذمہ داریاں نہیں ہوتیں۔ اللہ نے ہر انسان کو اپنی یاد کے لیے رکھا ہوا ہے تو کسی کو کس انداز میں یاد کروانا ہے تو کسی کو کس انداز میں۔

”فوریس تو سب نے کیا ہو گا؟“

”بالکل کیا۔ ممایا نے بہت کیا، فیملی نے بھی بہت فوریس کیا۔ دوستوں نے بھی بہت کیا۔ رشتے داروں نے بھی بہت فوریس کیا۔ پھر میں باہر چلی گئی کہ کوئی کہنے والا تو نہیں ہو گا کہ شادی کر لو۔ بڑے سکون سے گزرے گی زندگی، مگر جان چھوٹی نہیں کیونکہ ابھی

بھی سب کہتے ہیں کہ شادی کر لو۔“

”مگر بیوا امور سے دلچسپی؟“

”بالکل ہے کافی ہے۔ مگر ٹائم ملتا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری شوٹ کا ٹائم ایسا ہوتا ہے کہ رات گھر

واپسی میں ہی اتنی دیر ہو جاتی ہے تو پھر راستے سے ہی کچھ بیتی ہوئی آتی ہوں۔ ہاں جس دن گھر پہ ہوتی ہوں تو پھر بہت شوق سے کھانا پکاتی ہوں۔ اور بہت اچھا پکاتی ہوں۔“

”کبلی ہوتی ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔ کبھی کبھی گزرتا ہوں آجاتی ہیں اور رہ جاتی ہیں تو کبھی دوستیں آجاتی ہیں۔ تو بڑا اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ اور ماشاء اللہ سے یہاں دوست رشتے دار اتنے ہیں کہ اگر ایک دن بھی ریکارڈنگ کے علاوہ ملتا ہے تو اس دن کا پتا ہی نہیں چلتا۔ پھر گھر کے کام بھی اتنے جمع ہو جاتے ہیں۔“

”اور اس انٹرویو کے آخر میں کچھ کہنا چاہیں گی آپ؟“

”ہاں۔۔۔ ضرور میں یہ کہنا چاہوں گی کہ اگر اس ملک میں کسی نے کسی کی دعا لینی ہے تو پلیر پلیر جانوروں سے اچھا سلوک کریں۔ میں درخواست کروں گی کیونکہ آئی ایم آبیٹ لور۔ مجھے جانوروں سے بہت پیار ہے۔ دیکھتے تو اس ملک میں انسانوں کے ساتھ بھی بہت برا سلوک ہو رہا ہے، لیکن جانور جو نیک بے زبان ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا خیال رکھا کریں، کتے اور بلیاں وفا دار جانور ہوتے ہیں، جو گلیوں میں پھر رہے ہوتے ہیں یا تو ان کو ختم کر دیں یا پھر ان کی حفاظت کریں۔ سچ کہہ رہی ہوں کہ ان بے زبان جانوروں کی بددعا اس ملک کو کھا رہی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر کسی ملک کو اچھا دیکھنا ہو تو اس ملک کے جانوروں کو دیکھیں۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ”ممہا تو اب“ سے اجازت چاہی۔



گزشتہ شب بھی  
گزشتہ شب بھی، بہت بڑا ستارہ پوس پوس جھڑ  
رتوں کے یہ سارے قافلے اور ساعتوں کے یہ سب مسافر  
ہواؤں کے ساتھ آتے رہیں گے یوں ہی  
مگر یہ عکسار آمد و رفت ایک نسل سے بیشتر خاک نہیں  
کہ وقت تو ایک جاہل تار سا کی مانند جاوے گا ہے

وقت کا دریا بہتا رہتا ہے۔ کھلی کتاب کے صفحے الٹتے رہتے ہیں۔ آتی جاتی ساعتوں کے ساتھ رتیں بدلتی رہتی ہیں۔ کرب واسے، دوسرے، ازیتیں، خواب، تعبیریں۔۔۔ دل بہت سے موسموں سے گزرتا ہے اور اندر کی رتیں باہر کے موسموں کو بھی بدل دیتی ہیں۔ زندگی اتنی تیزی سے رنگ بدلتی ہے کہ پتا ہی نہیں چل پاتا کیا کھویا، کیا پایا۔ ہاں وقت کی کچھ ساعتیں کچھ حسین بل بل کے آنگن میں اس طرح سر جاتے ہیں کہ کامل خوشی کا احساس نہ کسی، ایک اطمینان سا ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ہمارا سوال اسی حوالے سے ہے۔

1۔ 2014ء میں کوئی ایسا لمحہ آیا جب آپ نے کوئی اچھا کام کر کے گمراہ اطمینان محسوس کیا ہوا؟

2۔ گزرے سال کا وہ لمحہ جب کسی کا کما ایک جملہ، کوئی اچھی بات آپ کے دل میں خوشی کا انمول احساس جگا گئی ہو؟

3۔ زندگی تیزی سے ہاتھ سے نکلنے جا رہی ہے۔ اپنی سے رنجشیں، ناراضیاں زندگی کا حصہ ہیں۔ کوئی ایسی ناراضی اور رنجش جسے آپ اس سال دور کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

4۔ 2014ء میں مذہب، سیاست، میوزک، ڈراما، کھیل اور ادب کے حوالے سے آپ کی پسندیدہ شخصیات کون سی رہیں؟

”ایک کتاب جو آپ کو بہت اچھی لگی اور آپ اسے ہماری قارئین کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں گی۔ آئیے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔“

## ان آنکھوں نے دیکھے ہیں تہ سہالی کی

انست الصبیحہ

روینہ شاہد۔ کراچی

لے آیا اور بولا ”ممایا بہت بھوکا ہے، یہ روٹی اسے دے دیں یہ چلا جائے گا۔“

میں نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے توڑے اور اس کے سامنے دیوار پر رکھ دیے، اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کانٹیں کانٹیں شروع کر دی اور گئی کوئے منڈیر پر آ بیٹھے، میرا بیٹا جلدی سے روٹی کا ڈبہ اٹھا لیا۔ اور میں بالی کی پچی ہوئی ساڑھے تین روٹیاں بھی جلدی جلدی توڑنے لگی اور یوں تمام روٹی کو ڈس کو ڈس کی تعداد بڑھتی رہی، میرا بیٹا خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا اس نے منڈیر پر رکتے مٹی کے کوئڈے میں پانی بھی ڈال دیا۔ تمام کوئڈے

(1) یہ ماہ جنوری کی ایک منجست تھی جب میرے چھوٹے بیٹے نے بالکونی کا دروازہ کھول دیا۔ اور ایک مرد بھونکنے میں میرے چہرے کو چھوا۔

میں نے دھڑائی چہرے تک لے لی تھی، مگر بالکونی کی منڈیر پر بیٹھنے کوئے کی کانٹیں کانٹیں مجھے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی، میں غصے سے اٹھی بیٹے کو ڈانٹا اور اپنے دوسرے کو ڈبیل کر کے کوئے کو شش شش کر کے بھگانے لگی، مگر وہ ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا اور الٹا جب میں دوڑتا مارتی وہ اسے چونچ لے رہا ہوتا، میرا بیٹا انہی دیر میں پچن سے آدھی روٹی







دیکھتی تھی، پر جب سے لیبل پر چینلز کی بہتات ہوئی ہے ڈراموں سے دل ہی اٹھ گیا ہے۔ پھر بھی دو ڈرامے ذرا شوق سے دیکھے وہ بھی آخری چند اقساط ایک تو ”پیارے افضل“ اور دوسرا ”بڑی آیا“ سویرا اندہم کی وجہ سے وہ مجھے اپنی لگتی ہیں۔ کھیل کے حوالے سے اس سال مجھے سب سے زیادہ خوشی گلی ٹکلوں کے ان بچوں نے دی جنہوں نے فٹ بال میں پاکستان کا دنیا بھر میں نام روشن کیا اور ان کے علاوہ جو بھی پاکستان کے لیے بہترین پرفارم کرے کسی بھی کھیل میں مجھے پسند ہے۔

اب کے حوالے سے دسی شاہ اس سال میرے فیورٹ رہے ان کے پروگرامز میں نے بہت شوق سے دیکھے اور دوسرا نام عمیرہ احمد کا ہے پیر کامل کی وجہ سے یہ ناول میں نے اس سال پڑھا اور مجھے بہت زیادہ متاثر کن لگا۔

مسل قی میں ایک نہیں دو کتابیں پڑھنے کا مشورہ دوں گی بہنوں کو۔ ایک تو اشفاق صاحب کی ”زاویہ“ ہے اور

دوسری کتاب عصر حاضر کے صوفی بزرگ جنمیں دنیا سے گزرے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے، واصف علی واصف صاحب کی گفتگو پر مبنی کتاب جس کا نام بھی ”گفتگو“ ہی ہے۔

میری نظر میں آج حضرت انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی مرضی کرنا چاہتا ہے ہر معاملے میں وہ یہ نہیں دیکھتا کہ خدا کی مرضی کیا ہے۔

حرمتِ دروا کرم سے ڈالو! (1) تمام قریب داشتیں کھٹکالنے پر بھی کوئی ایسی بات نہیں

مسلمت کا فیڈنس پہلے سے کہیں زیادہ پایا۔ لیفٹن کریں کہ پہلے کبھی مجبوراً نقاب لگنا پڑ جاتا تھا تو دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا اور اب میں شادیوں میں یا زاروں میں ہونٹوں میں پارک میں رشتے داروں کے گھر جہاں بھی جاؤں مکمل نقاب میں جاتی ہوں۔

(2) ایک ماہ قبل میری رشتے کی ایک نند اپنے شوہر والدین اور بھائیوں کے ساتھ میرے گھر آئیں تو مجھے نقاب میں دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ پھر مکمل نقاب میں ممان داری کرتے دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئیں۔ اور جاتے وقت کہنے لگیں ”خدا ایسی توفیق پر عورت کو دے“ اور میرے ساتھ سب نے کہا آمین۔ ان کی یہ بات میرے دل کو انمول خوشی کا احساس دے گئی۔

(3) دو روز تک بھی کوئی میری نظر میں ایسا نہیں جس کے لیے میرے دل میں ناراضی یا رنجش ہو میرے جیٹھ جیٹھانہاں اور ایک دیو دیو رانی میری ساس اور ہمارے ماشاء اللہ انھارہ بچے ایک جگہ ایک ساتھ رہتے ہیں، میری شادی کو انھارہ سال ہو چکے ہیں جہاں برتن ہوں وہ کھڑکتے بھی ہیں مگر میں نے کبھی ناراضیاں نہیں پالیں۔ اپنی غلطیوں کو مان کر اپنے چھوٹے بھائی سے معافی بھی مانگ لیتی ہوں، اس میں میں نے کبھی شرم محسوس نہیں کی۔

(4) 2014ء میں مذہب کے حوالے سے میری پسندیدہ شخصیت جنید حبشہ کی تھی، ماشاء اللہ وہ کیا تھے اور کیا باریا اللہ نے انہیں۔ سیاست میں مجھے کوئی پسند نہیں میوزک میں مجھے ہمیشہ روبا ملک میوزک پسند ہے۔

جب تک صرف پی پی وی تھا تو بہت شوق سے ڈرامے

مذہبی :- مولانا طارق جمیل اپنے دلنشین اور پراثر انداز بیان کی وجہ سے منفرد ہیں۔

سیاسی سیاسی شخصیات میں مولانا سراج الحق پسند ہیں۔ میوزک راحت فتح علی جو بے حد سریلے ہیں۔

ڈراما عمیرہ احمد کا تحریر کیا ہوا ڈراما (پچھلے سال کا محبت صبح کا ستارہ) اور ان کی ہر تحریر مجھے بے حد پسند ہے۔

کھیل کرکٹ پسند ہے اور پسندیدہ کھلاڑی یو ٹیس خان ہیں۔ تمام بہنوں کو میں آقرآن مجید ترنم کے ساتھ پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔ یوں میری پسندیدہ راسٹر عمیرہ احمد ہیں اور ان کی تحریریں میں بار بار پڑھتی ہوں۔

(رومیتہ آپ نے سروے بہت اچھے انداز میں تحریر کیا ہے افسانوں پر بھی طبع آزمائی کریں۔ آپ اچھا لکھ سکتی ہیں)

کرن نعمان سے کراچی

(1) بالکل امتل جی! 2014ء میں ایک بہت خاص لمحہ میری زندگی میں آیا جس نے میری زندگی کو ایک نیا رنگ دیا۔ ہوا کچھ یوں کہ اس سال رمضان میں سحری کی نشریات جاری تھیں ان ہی باتوں کے دوران ایک رات مفتی صاحب (مجھے ان کا نام یاد نہیں آ رہا) نے باجیا بیکر دار اور پردہ دار عورت کا آخرت میں درجہ بتایا ان کی باتیں سن کر میرے دل میں شدید خواہش جاگی کہ کاش میں بھی ان عورتوں میں شامل ہو جاؤں اور اسی لمحے میں نے شرعی پردے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل پیرا ہو گئی۔ اس سے میں نے صرف اطمینان ہی محسوس نہیں کیا بلکہ اپنی ذات میں

کھانے کے بعد آسمان کی طرف دیکھ کر کامیں کامیں کی جیسے اپنے دہب کا شکر ادا کر رہے ہوں اور اڑتے۔

میرا بیٹا بہت خوش تھا بولا ”ممالو دیکھا آپ نے پرندے مل جتل کر کھاتے ہیں انہیں احساس ہوتا ہے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا۔“

میں بالکل بھول چکی تھی کہ اس بخ بستہ موسم میں ٹھنڈے فرش پر تنگے پیر بنا کسی گرم کپڑے کے کھڑی ہوں، کیونکہ اس وقت میرے ساتھ طمانیت کا ایک احساس تھا اور ساتھ ہی ایک سبق کہ بے زبان پرندے ہم انسانوں کو ایک سبق دے گئے کہ اپنی بھوک کے ساتھ اگر ہم دوسروں کی بھوک کا بھی احساس کریں اور مل بانٹ کر کھائیں تو بھوک و افلاس کے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

(2) کبھی کبھی یکدم موسم بدل جاتے ہیں اور منظر تبدیل ہو جاتے ہیں اور کسی کا کھانا صرف ایک جملہ آپ کی روح میں اتر جاتا ہے اور سب کچھ بدل کے دکھ دیتا ہے۔

ہاں ایک جملہ ”زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اگر ہزار بار بھی ملتی تو میں اپنے پردہ دار سے یہی دعا کرنا کہ ہر بار تم ہی میری جیون ساتھی بنو۔“ یہ جملہ میرے جیون ساتھی نے مجھ سے کہا۔

(3) خدا کا جتنا شکر ادا کریں کہ ہے کیونکہ اس دوڑتی بھاگتی دنیا میں نہ کسی سے کوئی رنجش ہے نہ ناراضی سب ہم سے خوش ہیں اور ہم سب سے خوش ہیں۔

(4) پسندیدہ شخصیات





ہے ہر وارڈ اور اولیٰ ذی مختلف جگہوں پر بنی ہوئی ہیں۔

سول اسپتال میں ہر روز ہزاروں مریض علاج کے لیے آتے ہیں۔ اندرون سندھ کے لوگ بھی بہ غرض علاج وہاں موجود ہوتے ہیں۔ ایک اندرون سندھ سے آئی عورت اپنے بیمار بچے کو گود میں لیے بیٹھی رو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے سر جیکل وارڈ میں جانے کا کہا تھا اور وہ اسے معلوم نہیں تھا کہ کوئی اسے بتا بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے کہا آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں مختلف لوگوں سے آگاہی لیتی سر جیکل وارڈ میں پہنچی۔ بچے کا چیک اپ کر لیا۔ ڈاکٹر نے مختلف ٹیسٹ لکھ کر دیے، میں وہ سب کرائے کے لیے بھی مختلف جگہوں پر اس کے ساتھ گئی۔ جب اس کے سب ایب ٹیسٹ ہو گئے تو میں نے اس سے اجازت چاہی جبکہ اس دوران میرا اپنا ڈاکٹر کے چیک اپ کا نمبر نکل گیا تھا مگر جس طرح مجھے اس عورت نے دعا میں دیں لیکن جانیں ایک انمول خوشی گھر سکون اور اطمینان میں نے محسوس کیا۔

(2) دوران سفر میرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور میں مسلسل اس پر کچھ نہ کچھ ذکر اللہ پڑھتی رہتی ہوں (معبذ کے جانے کے بعد یہ عادت پختہ ہو گئی۔ یہ کہ میں اس کے ایصال ثواب کے لیے زیادہ سے زیادہ کلمہ طیب پڑھ سکوں۔) میں چنگ چر رکشہ میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ میرے برابر ایک عورت آکر بیٹھی اور میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ میں نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بولی کہ بیٹی

(3) میری پسندیدہ کتب ہے تو سب ہی کو پسند گھر اپنی روزمرہ کی روٹین میں ہم بھاگتے دوڑتے اس کتاب سے ہمت دور ہو چکے ہیں۔ برائے کے بجائے بک۔ ریک میں سب سے اوپر یا پھر طاقتوں میں ہی سجاتے ہیں صرف۔ بوٹیں تو سب ہی قارئین کو ”قرآن پاک“ مزے کے ساتھ پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔ اور اس کے علاوہ ”بچپن کا سہارا“ ایک انتہائی خوب صورت اور پڑھی جانے کے لائق کتاب ہے۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ پاک سبھی قارئین بہنوں کے لیے آنے والا سال انتہائی خوب صورت اور مسرتوں کی نوید لے کر آئے۔

شمینہ اکرم مس۔۔۔ ہمارا کالونی لیاری کراچی

(1) گزشتہ برس بہت سے ایسے لمحات آئے۔ ایک

مرتبہ کھار اور کی مصروف سڑک جس کے اطراف کئی اسکول واقع ہیں اور ٹریفک بھی دونوں سائیڈ سے بہت تیزی سے آتی ہے۔ ایک اسکول کا بچہ روڈ کراس کر رہا تھا کہ اہانٹا دوسری سائیڈ سے ایک ہیوی ٹرک آیا نظر آتا۔ میں نے آہ ”اٹا“ بھاگ کر اس بچے کو گھسیٹ لیا اور سیف سائیڈ پر کر دیا۔ جبکہ میں خود چاروں طرف سے گاڑیوں کے بھونکنے میں پھنس گئی۔ بچے کو صحیح سلامت دیکھ کر ایک گھبراہٹ میں محسوس کیا۔۔۔

ورن ڈرائیو پر ہو جاتی تھی۔

اسی طرح میں اکثر اپنے علاج کی غرض سے سول اسپتال لڑائی میں آتی جاتی رہتی ہوں۔۔۔ سول اسپتال بہت بڑا



قریب ہوتی چلی جاتی ہے۔ سو ایسے وقت میں اگر کوئی ناراض ہو تو میرا غصہ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔

زبان کی کڑوی تلخ ضرور ہوں مگر تب تک جب بات دلی میں ہو۔ جو کسی اپنی بھڑاس نکال لی۔ دل پاک صاف ہو جاتا ہے۔ میں کسی کو زیادہ عرصہ بلکہ عرصہ کیا تین دن سے زیادہ ناراض ہی نہیں رہنے دیتی خود سے یاسن جالی ہوں یا پھر منالیتی ہوں۔ مگر کچھ رشتے ایسے بھی ہیں جن کو میں اپنی زندگی میں سب کچھ بار کر بھی یا پھر سب کچھ جیت کر بھی سمجھی معاف نہیں کر پاؤں گی۔ نہ اگلے سال اور نہ ہی آئندہ کبھی مناؤں گی۔

(4) 2014ء میں مذہب کے حوالے سے حریم خان (میری نیٹ فرینڈ) ان کی معلومات نے بہت متاثر کیا۔ سیاست سے مجھے انتہائی حد تک نفرت ہو چکی ہے۔ میوزک کے حوالے سے ”راحت فتح علی خان“ کا ”تیری آنکھوں کے درمیان“ کا ”ایک انتہائی بہترین کلوش تھی اس کے علاوہ کسی گانے نے متاثر نہیں کیا“ اور جہاں تک بات ہے ذرا سے کی تو انداز میں اور ترکی زاراموں کی آمد نے میزبان دی سے دلچسپی انتہائی کم کر دی ہے اور ستم در ستم کہ ہمارے تمام اچھے اچھے نازک کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ذرا سے کے نام پر ”اس نے توئی دی سے دل بالکل ہی اچھا کر دیا ہے۔“ مکمل تو اس سال بھی ”دی لب جند لالہ“ شاہد خان آفریدی کا ہی بہترین تھا کہ میں ان کی بہت بچپن سے فہم بلکہ ”اے سی“ ہوں اور ادب تو اس سال جو براہیا اس میں ”جنت کے پتے“ اتنی سب سے اچھا لگا ”سمو“ ”سمو“ احمد ”کانام“ اولیٰ گی۔

یاد آئی جس سے میں نے خود کو مطمئن پایا ہو۔ کوئی ایسا کام جس سے مجھے خود پر فخر محسوس ہوا ہو یا اطمینان رگ دپے میں سرایت کر گیا ہو۔

دعا ہے 2015ء میں کوئی بڑی نیکی میرے حصے میں لکھ دی جائے۔

(2) 2014ء کا ایک نہیں بہت سے ایسے لمحے ہیں جس میں میری تعریف کی گئی۔ کرن میں فرحانہ ناز ملک آئی کے لیے لکھا جانے والا ”میرا تعزیتی آرٹیکل“ بہت لوگوں کو پسند آیا تاہم مہر اور مونا اور بہت سے لوگوں نے تعریف کی حیا بخاری آئی نے بہت زیادہ تعریف کی۔ ”خصوصاً“ ان کا جملہ ”حرمت آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ہماری رائٹر برادری کا ایک بہت اچھا اضافہ ثابت ہو سکتی ہیں آپ“ ام طیفور آئی نے تو بہت دفعہ تعریف کی۔

تزیلہ رباح آئی نے کہا تھا۔ ”حرمت آپ کی نالج بہت اچھی ہے“ آپ میں اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ موجود ہے۔ ”عام رو بہن میں بھی بہت سے اچھے جملے سننے کو ملتے رہے اپنی ذات کے حوالے سے بھی اور ویسے بھی مثلاً ”حرمت! تم بہت خالص ہو۔ تمہارے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر ہے اور ”حرمت! تم ایک مکمل کتاب کی مانند ہو۔ کوئی باب کسی سے پوشیدہ نہیں“ مگر اس جملے کی صداقت یہ شک ہے کہ بہت سے ایسے راز ہیں جن سے میرے علاوہ کوئی واقف نہیں (ہی ہی ہی)

جہاں سے ان سباز ہوں ناں! حرمت کو اپنے اور دوسروں کے راز رکھنے آتے ہیں۔“

(3) زندگی بل بل گھڑی گھڑی۔ اختتام کے قریب اور





www.books.pk.net عمیرہ احمد



ایلی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔  
 ۱۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون اور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال  
 کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔  
 ۲۔ اسپیلنگ بی کے ہانوسے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چورہویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ۔ منسی  
 نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست  
 اسپیلنگ بتا دی۔ ایک اضافی لفظ کے درست سے بچے نے مزید مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ  
 سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد بچے اور نو سالہ بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ  
 کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان سبے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔  
 ۳۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بدویا نئی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب  
 کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔  
 ۴۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی  
 نے پھر ڈانس کی آفر کی اس نے اسے بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس منزل سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے  
 کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔  
 ۵۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور  
 کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور بالکل نظر آتی ہے۔  
 ۶۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آگے۔ حسب معمول اس  
 کی زوی نے بھی جو تیسری بار اسید سے تھی اس کا ریتا ک استیصال کیا۔ وہ لانا میں اپنی بیوی کو مطمئن و مسرور دیکھ کر  
 مسک رہا ہے کہ اگر وہ چند پیر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ

آب حیات کی کساہی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔  
 ۲۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ حالانکہ امامہ کو انیزرنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ایسے ہی  
 ہیں جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے  
 دل سے قبول کیا۔  
 ۳۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں  
 ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں  
 اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت  
 اس کی فیملی کے حمایت شناسانہ ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس  
 ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور اس معنی میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔  
 ۴۔ رینڈمٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز



ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کے چھ مہرز کے ساتھ پانچ بھنے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ لینا پڑا تھا۔ فیصلے کی زندگی داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزام کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے بنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایر پورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

11۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جمیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گہری جمیل میں وہ صندوق کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساتھ فٹ کے فاصلے پر اس بینک کوٹ ہاں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ٹائم ٹوچ کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان بینک کوٹ ہاں میں داخل ہو گا۔ وہ ایک برو فیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہار کیا گیا ہے۔

12۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجوی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے۔ نجوی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دو سری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

### آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لاسٹ پر ہوا۔ سالار کو لاسٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا رو کھا رویہ محسوس کر رہا ہے سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا رہا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ دراصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے سی فوڈ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان طیبہ اور امتیاز ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ سالار کا ویمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اپنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

### تیسری قسط

”اسلام آباد چلو گی؟“ اس کے اگلے چلے نے امامہ کے ہوش اڑا دیے۔ وہ سب کچھ جو وہ سوچ کر آئی تھی اس کے ذہن سے غائب ہو گیا۔

”اسلام آباد؟“ اس نے بے حد بے یقینی سے سالار کو دیکھا۔

”ہاں میں اس ویک اینڈ پر جا رہا ہوں۔“ سالار نے بڑے نارمل انداز میں کہا۔

”لیکن میں... میں کیسے جا سکتی ہوں؟“ وہ بے اختیار اٹکی۔ ”تمہارے پیپا تو تمہیں منع کر کے گئے ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ اسلام آباد نہ لے کر آنا۔ پھر؟“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”ہاں... اور اب وہی کہہ رہے ہیں کہ اگر میں تمہیں ساتھ لانا چاہوں تو لے آؤں۔“ اس نے بڑی روانی سے کہا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”میری فیملی کو ہتالک سکتا ہے۔“ اس نے لمبی خاموشی کے بعد بالآخر کہا۔

”آج یا کل تو ہتالک ہاں ہے۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔ ”یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ساری عمر تمہیں چھپا کر رکھوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری فیملی نے تمہارے بارے میں فوٹوں سے کہا ہے کہ تم شادی کے بعد بیرون ملک سہیل ہو گئی ہو۔ اب اتنے سالوں کے بعد تمہارے حوالے سے کچھ کریں گے تو خود انہیں بھی اطمینان نہ ہوگی۔ اس لیے مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ کریں گے۔“ وہ مطمئن تھا۔

”تم انہیں نہیں جانتے؟“ نہیں بتا چلا گیا تو وہ چپ نہیں بیٹھیں گے۔ ”وہ پریشان ہونے لگی تھی۔

”وہاں کبھی کبھار جایا کریں گے خاموشی سے جائیں گے اور آجایا کریں گے۔ یا ر! اتنا سوشلائز نہیں کریں گے وہاں۔“ وہ اس کی بے فکری سے چڑی۔

”انہیں بتا چلا تو وہ مجھے لے جائیں گے۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔“ وہ روہانی ہو رہی تھی۔

”فرض کرو امامہ! اگر انہیں اتفاقاً تمہارے بارے میں بتا چلتا ہے یا یہاں لاہور میں تمہیں کوئی دیکھ لیتا ہے تمہیں کوئی نقصان پہنچاتے ہیں تو؟“

”میں بتا چلے گا میں کبھی باہر جاؤں گی ہی نہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تمہارا دم نہیں گھٹے گا اس طرح؟“ اس نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں سیجا جیسی ہمدردی تھی۔

”مجھے عادت ہو گئی ہے سالار۔ اتنا ہی سانس لینے کی۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ جب میں جاب نہیں کرتی تھی تو مہینوں گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ میں اتنے سالوں سے لاہور میں ہوں لیکن میں نے یہاں یا زاروں پارکس اور ریسٹورنٹس کو صرف سڑک پر سفر کرتے ہوئے باہر سے دیکھا ہے یا لی وی اور نیوز ہیپرز میں۔ میں اگر اب ان جگہوں پر جاؤں تو میری سمجھ میں یہی نہیں آئے گا کہ مجھے وہاں کرنا کیا ہے۔ جب ملتان میں تھی تو بھی ہاسٹل اور کالج کے علاوہ دوسری کوئی جگہ نہیں تھی میری زندگی میں۔ اب لاہور آگئی تو یہاں بھی پہلے یونیورسٹی اور گھر۔ اور اب گھر۔ مجھے ان کے علاوہ دوسری ساری جگہیں عجیب سی لگتی ہیں۔ مہینے میں ایک بار میں سعیدہ اماں کے گھر کے پاس ایک چھوٹی سی مارکیٹ میں ان کے ساتھ جاتی تھی وہ میری واحد آؤٹنگ ہوتی تھی۔ وہاں ایک بک شاپ تھی۔ میں پورے مہینے کے لیے بکس لے لیتی تھی وہاں سے۔ کتاب کے ساتھ وقت گزارنا آسان ہوتا ہے۔“

وہ بتائیں اسے کیوں جاتی تھی۔

”ہاں وقت گزارنا آسان ہوتا ہے زندگی گزارنا نہیں۔“

اس نے ایک بار پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ڈرائیو کر رہا تھا۔

”مجھے فرق نہیں پڑتا سالار۔“

”مجھے فرق پڑتا ہے۔ اور بہت فرق پڑتا ہے۔“ سالار نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔ ”میں ایک نارمل



زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ جیسی کبھی تمہاری زندگی تھی۔ تم نہیں چاہتیں یہ سب کچھ ختم ہو جائے۔؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”ابنا رمل لا نفی سہی لیکن میں سینف ہوں۔“

سالار نے بے اختیار اس کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلا دیا۔

”تم اب بھی سینف رہو گی۔ ٹرسٹ نی۔ کچھ نہیں ہو گا۔ میری فیملی تمہیں بروڈی کٹ کر سکتی ہے اور اگر تمہاری فیملی کو اب یہ پتا چلتا ہے کہ تم میری بیوی ہو تو تمنا آسان نہیں ہو گا ان کے لیے تمہیں نقصان پہنچانا۔ جو بھی ہوتا ہے ایک بار کھل کر ہو جائے۔ تمہیں اس طرح چھپا کر رکھوں اور انہیں کسی طرح علم ہو جائے تو وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ایسی صورت میں میں پولیس کے پاس جا کر بھی کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ تم تو سال سے غائب ہو اور وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ وہ خاموش رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سالار نے بولتے بولتے اس کی خاموشی ٹوٹ کر۔

”مجھے تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ کسی کے ساتھ بھی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں نے اپنے ساتھ تمہیں بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ ٹھیک نہیں ہوا۔“ وہ بے حد اپ سیٹ ہو گئی۔

”ہاں اگر تم کسی اور کے ساتھ شادی کرتیں تو یہ واقعی ان لہجہ ہوتا لیکن میری کوئی بات نہیں۔ میں نے تو خیر پہلے بھی تمہاری فیملی کی بہت گالیاں اور بددعائیں لی ہیں اب پھر سہی۔“ وہ بڑی لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔

”تو پھر سیٹ بک کروادوں تمہاری؟“ وہ واقعی ڈھیٹ تھا۔ وہ جب بیٹھی رہی۔

”کچھ نہیں ہو گا امامہ۔ مارک مالی ورڈ۔“ سالار نے اسٹیرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”تم کوئی دلی نہیں ہو۔“ اس نے ہنسی سے کہا۔

اس کے کندھوں سے بازو مٹاتے ہوئے وہ بے اختیار ہنس۔

”اچھا میں نے کب کہا کہ میں دلی ہوں۔ میں تو شاید انسان بھی نہیں ہوں۔“

اس کے اس جملے پر اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اب وہاں اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے اپنے چہرے پر امامہ کی نظریں محسوس کیں۔ ویسے ہی پلپا چاہتے ہیں ہم وہاں آئیں۔“

امامہ نے اس بار جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

\*\*\*

اس شام سالار کو ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی کچھ سنجیدہ لگے تھے اور اس سنجیدگی کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ امامہ بھی کھانے کے دوران بالکل خاموش رہی تھی لیکن اس نے اس کی خاموشی کو گاڑی میں ہونے والی گفتگو کا نتیجہ سمجھا۔

وہ لاؤنچ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب ڈاکٹر سبط علی نے اس موضوع کو چھیڑا۔

”سالار! امامہ کو کچھ شکایتیں ہیں آپ سے۔“ وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ٹھنکا۔ یہ بات اگر ڈاکٹر سبط علی نے نہ کہی ہوتی تو وہ اسے مذاق سمجھتا۔ اس نے کچھ چرائی کے عالم میں ڈاکٹر سبط علی کو دیکھا پھر اپنے برابر بیٹھی امامہ کو۔ وہ چائے کا کپ اپنے گھٹنے پر رکھے چائے پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال گاڑی

میں ہونے والی گفتگو کا آیا لیکن امامہ نے کس وقت ڈاکٹر صاحب کو گاڑی میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تھا۔؟ وہ بے حد حیران ہوا۔

”جی۔؟“ اس نے کپ واپس پرچ میں رکھ دیا۔

”امامہ آپ کے رویے سے ناخوش ہیں۔“ ڈاکٹر سبط علی نے اگلا جملہ بولا۔

سالار کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

”جی۔؟“ اس نے بے اختیار کہا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ امامہ پر طنز کرتے ہیں۔؟“ وہ پلکیں جھپکے بغیر ڈاکٹر سبط علی کو دیکھتا رہا۔ بمشکل سانس لے کر چند لمحوں بعد اس نے امامہ کو دیکھا۔

”یہ آپ سے امامہ نے کہا؟“ اس نے اسے بے یقینی سے دیکھتے ہوئے ڈاکٹر سبط علی سے کہا۔

”ہاں آپ اس سے ٹھیک سے بات نہیں کرتے۔“

سالار نے گردن موڑ کر ایک بار پھر امامہ کو دیکھا۔ وہ اب بھی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

”یہ بھی آپ سے امامہ نے کہا؟“ اس کے تو جیسے چوہہ طبق روشن ہو رہے تھے۔

ڈاکٹر سبط علی نے سر ہلایا۔ سالار نے بے اختیار اپنے ہونٹ کا ایک کونا کاٹتے ہوئے چائے کا کپ سینئر ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا ذہن بری طرح چکرا گیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے پریشان کن صورت حال میں سے ایک تھی۔

امامہ نے چائے کے کپ سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے بے حد شرمندگی اور پچھتاوے کے عالم میں اس کو گلا صاف کرتے ہوئے کہتے سنا۔ ”اور۔۔۔؟“

جو کچھ ہو رہا تھا یہ امامہ کی خواہش نہیں تھی، حماقت تھی، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

”اور یہ کہ آپ نہیں جانتے ہوئے اسے انکار نہیں کرتے۔ پرسوں آپ جھگڑا کرنے کے بعد اسے سعیدہ من کی طرف چھوڑ گئے تھے۔“ اس بار سالار نے پہلے کلثوم آنٹی کو دیکھا پھر ڈاکٹر سبط علی کو۔ پھر امامہ کو۔ اگر آسمان اس کے سر پر گراتا تب بھی اس کی یہ حالت نہ ہوتی جو اس وقت ہوئی تھی۔

”جھگڑا۔؟ میرا تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔“ اس نے بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

”اور امامہ نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ سعیدہ ہاں کے گھر رہنا چاہتی ہے اور میں تو پچھلے چار دنوں سے کہیں۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

اس نے امامہ کی سسکی سنی تھی۔ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر امامہ کو دیکھا۔ وہ اپنی ناک رگڑ رہی تھی۔ کلثوم آنٹی اور ڈاکٹر صاحب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ سالاریات جاری نہیں رکھ سکا۔ کلثوم آنٹی اٹھ کر اس کے پاس آکر اسے دلاسا دینے لگیں۔ وہ ہکا بکا بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر سبط علی نے ملازم کو پانی لانے کے لیے کہا۔

سالار کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس وقت وہاں اپنی صفائیاں دینے اور وضاحت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا، ”الو کا پٹھا ہے کیونکہ پچھلے چار دنوں سے اس کی چھٹی حس جو سنگلن بار بار دے رہی تھی وہ بالکل ٹھیک تھی۔ صرف اس نے خوش فہمی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا تھا۔“

پانچ دس منٹ کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب تقریباً ”آدھے گھنٹے تک سالار کو سمجھاتے رہے۔ وہ خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے ان کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے برابر بیٹھی امامہ کو بے حد دامت ہو رہی تھی۔ اس کے بعد سالار کا کیلے میں سامنا کرنا کتنا مشکل تھا۔ یہ اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی ڈاکٹر سبط علی کے گھر کے گیٹ



سے باہر نکلتے ہی امامہ نے اسے کہتے سنا۔  
”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں یقین نہیں کر سکتا۔“

اسے اس سے اسی رد عمل کی توقع تھی۔ وہ وہند اسکرین سے نظر آتی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی اس وقت بے حد ندوس ہو رہی تھی۔

”میں تم پر طنز کرتا ہوں۔ تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔ تمہیں بتائے بغیر جاتا ہوں۔ تمہیں سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ گیا تھا۔ جھگڑا کیا۔ تم نے ان لوگوں سے جھوٹ بولا؟“

امامہ نے بے اختیار اسے دیکھا۔ وہ جھوٹ کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسے انتہا برا نہ لگتا۔

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ اس نے بے حد خفگی سے کہا۔

”میں تم پر طنز کرتا ہوں؟“ سالار کی آواز میں تیزی آ گئی۔

”تم نے اس رات میری اندھیرے میں سونے کی عادت کو ”عجیب“ کہا۔“ وہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

”وہ طنز تھا؟ وہ تو بس ایسے ہی ایک بات تھی۔“

”مگر مجھے اچھی نہیں لگی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”تم نے بھی تو جواباً ”میری روشنی میں سونے کی عادت کو عجوبہ کہا تھا۔“ وہ اس بار چپ رہی۔ سالار واقعی بہت زیادہ ناراض ہو رہا تھا۔

”اور میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔“ وہ اگلے الزام پر آیا۔

”مجھے لگا تھا۔“ اس نے اس بار بدافعالانہ انداز میں کہا۔

”لگا تھا۔؟“ وہ مزید خفا ہوا۔ ”تمہیں صرف ”لگا“ اور تم نے سیدھا ڈاکٹر صاحب سے جا کر کہہ دیا۔“

”میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ سعیدہ اماں نے سب کچھ کہا تھا۔“ اس نے وضاحت کی۔

وہ چند لمحے صدمے کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکا۔

”یعنی تم نے ان سے بھی یہ سب کچھ کہا ہے؟“ وہ چپ رہی۔

وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔ اسے اب سعیدہ اماں کی اس رات کی بے رخی کی وجہ سمجھ میں آرہی تھی۔

”اور میں کہاں جاتا ہوں جس کے بارے میں میں نے تمہیں نہیں بتایا۔؟“ سالار کو یاد آیا۔

”تم سحری کے وقت مجھے بتا کر گئے؟“ سالار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

”امامہ! میں مسجد جاتا ہوں اس وقت فرقان کے ساتھ۔ اس کے بعد جم اور پھر واپس گھر آ جاتا ہوں۔ اب میں مسجد بھی تمہیں بتا کر جایا کروں؟“ وہ جھنجھلا یا تھا۔

”مجھے کیا پتا تم اتنی صبح کہاں جاتے ہو۔؟ مجھے تو اپ سیٹ ہونا ہی تھا۔“ امامہ نے کہا۔

اس کی وضاحت پر وہ مزید تپ گیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں رمضان میں سحری کے وقت کہاں جا سکتا ہوں۔؟ کسی ٹائٹ کلب۔؟ کیا کسی

مسٹر فرنڈ سے ملنے۔؟ کوئی احمق بھی جان سکتا ہے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔“ وہ احمق کے لفظ پر بری طرح تلملائی۔

”ٹھیک ہے، میں واقعی احمق ہوں۔ بس۔“

”اور سعیدہ اماں کے گھر میں رہنے کا تم نے کہا تھا۔ کہا تھا نا۔ اور کون سا جھگڑا ہوا تھا تمہارا؟“

وہ خاموش رہی۔

”اتنے زیادہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں؟“ وہ اس بار اس کی بات پر رد ہانسی ہو گئی۔

”بار بار مجھے جھوٹا مت کہو۔“

”امامہ! جو جھوٹ ہے، میں اسے جھوٹ ہی کہوں گا۔ تم نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کیا سوچ رہے ہوں گے وہ میرے بارے میں۔؟“ وہ واقعی بری طرح اب سیٹ تھا۔

”اچھا اب یہ سب ختم کرو۔“ اس نے امامہ کے گالوں پر یک دم بننے والے آنسو دیکھ لیے تھے اور وہ بری طرح جھنجھلا یا تھا۔ ”ہم جس ایڈیٹر پر ”بات“ کر رہے ہیں امامہ! اس میں رونے دھونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ روئی رہی۔

”یہ ٹھیک نہیں ہے امامہ! تم نے ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی یہی کیا تھا میرے ساتھ۔“

اس کا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا تھا لیکن جھنجھلا ہٹ بڑھ گئی تھی۔ جو کچھ بھی تھا وہ اس کی شادی کا چوتھا دن تھا اور وہ ایک گھنٹے میں دو سری باریوں زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی لڑکی یوں رو رہی ہوئی تو وہ پریشان ہوتا یہ تو خیر امامہ تھی۔ وہ بے اختیار نرم پڑا۔ اس کے کندھے پر اپنا بازو پھیلا کر اس نے جیسے اسے چپ کروانے کی کوشش کی۔ امامہ نے ڈیش بورڈ پر بڑے نشوونما سے ایک نشوونما نکال کر اپنی سرخ ہوتی ہوئی ناک کو رگڑا اور سالار کی صلیب کی کوششوں پر پالی پھیرتے ہوئے نما۔

”میں اسی لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے پتا تھا تم میرے ساتھ ہی طرح کا سلوک کرو گے۔“ وہ اس کے جنبلے پر ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا پھر اس نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

”کیسا سلوک۔۔ تم وضاحت کرو گی؟“ اس کے لمبے میں پھر خفگی اتر آئی ”میں نے آخر کیا کیا ہے تمہارے ساتھ۔“

وہ ایک بار پھر پچکیوں سے رونے لگی۔ سالار نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کیں۔ وہ ڈرائیونگ نہ کر رہا ہوتا تو یقیناً ”سر بھی پکڑ لیتا۔ باقی رستے دونوں میں کوئی بھی بات نہیں ہوتی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر چپ ہو گئی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔

اپارٹمنٹ میں آ کر بھی دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ بیڈ روم میں جانے کے بجائے لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ سالار بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ کپڑے بدل کر بیڈ روم میں آیا وہ تب بھی اندر نہیں آئی تھی۔ ”اچھا ہے“ اسے بیٹھ کر اپنے دل سے کہنے میں کچھ دیر سوچنا چاہیے۔“ اس نے اپنے بیڈ پر لیٹتے ہوئے سوچا۔ وہ سوتا چاہتا تھا اور اس نے بیڈ روم کی لائٹس آف نہیں کی تھیں لیکن غیندیک دم اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی۔ اب ٹھیک ہے بندہ سوچے لیکن اتنا بھی کیا سوچنا۔ مزید پانچ منٹ گزرنے کے باوجود اس کے نمودار نہ ہونے پر وہ بے اختیار جھنجھلا یا۔ لاؤنج مزید گزرنے کے بعد وہ بیڈ روم سے نکل آیا۔

وہ لاؤنج کے صوفے کے ایک کونے میں دونوں پاؤں اوپر رکھے، کشن گود میں لیے بیٹھی تھی۔ سالار نے سکون کا سانس لیا۔ کم از کم وہ اس وقت رو نہیں رہی تھی۔ سالار کے لاؤنج میں آتے پر اس نے سر اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اسی طرح کشن گود میں لیے اس کے دھاگے کھینچتی رہی۔ وہ اس کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ کشن کو ایک طرف رکھتے ہوئے امامہ نے بے اختیار صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ سالار نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔

”یہیں بیٹھو۔“ اس نے حکمانہ انداز میں اس سے کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے بازو چھڑانے کا سوچا، پھر رازہ بدل دیا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی لیکن اس نے اپنے بازو سے سالار کا ہاتھ ہٹا دیا۔



”میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن آئی ایم سوری۔“ اس نے مصالحت کی پہلی کوشش کا آغاز کیا۔  
امامہ نے حلقے سے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا منتظر رہا لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بی الحال اس کی معذرت قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔  
”تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تم سے ٹھیک سے بات نہیں کر رہا۔؟ امامہ! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔“ اس نے اس کے خاموش رہنے پر کہا۔

”تم مجھے انور کرتے رہے۔“ ایک لمحے توقف کے بعد اس نے بالآخر کہا۔  
”انور؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔ ”میں تمہیں۔“ تمہیں ”انور کرتا رہا۔ میں کر سکتا ہوں؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔ امامہ نے اس سے نظریں نہیں ملائیں۔  
”تم سوچ بھی کیسے سکتی ہو یہ۔؟ تمہیں ”انور“ کرنے کے لیے شادی کی تھی میں نے تم سے؟ تمہیں انور کرنے کے لیے اتنے سالوں سے خوار ہوتا پھر رہا ہوں میں۔“  
”لیکن تم کرتے رہے۔“ وہ اپنی بات پر مصر تھی۔ ”تم زبان سے ایک بات کہتے ہو لیکن تم۔“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ”تمہاری زندگی میں میری کوئی۔ کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔“  
”رکومت“ کہتی رہو۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ میں ایسا کیا کر رہا ہوں جس سے تمہیں میرے بارے میں اتنی غلط فہمیاں ہو رہی ہیں۔“ اس نے اس کی آنکھوں کی نمی کو نظر انداز کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔  
”میں نے تمہیں صبح مسجد جاتے ہوئے نہیں بتایا۔ آفس جاتے ہوئے بھی نہیں بتایا۔ اور؟“ اس نے گفتگو شروع کرنے کے لیے اسے کیڑی۔

”تم نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم انتظار پر دیر سے آؤ گے۔ تم چاہتے تو جلدی بھی آسکتے تھے۔“ وہ رک گیا۔  
”اور۔؟“ سالار نے کوئی وضاحت کیے بغیر کہا۔  
”میں نے تمہارے کہنے کے مطابق تمہیں میسج کیا لیکن تم نے مجھے کال نہیں کی۔ اپنے پیرش کو ریسیو کرنے یا چھوڑنے کے لیے تم مجھے بھی ایروورٹ لے جاسکتے تھے لیکن تم نے مجھ سے نہیں کہا۔ ٹھیک ہے میں نے کہا تھا کہ مجھے سعیدہ اماں کے گھر چھوڑ دو لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔ میری کتنی بے عزتی ہوئی ان کے سامنے۔“

وہ بے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔  
وہ ہلکے جھپکے بغیر یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ پانی اب اس کی آنکھوں سے ہی نہیں، ناک سے بھی بہنے لگا تھا۔ وہ پوری دل جمعی سے رو رہی تھی۔ سالار نے سینٹر میبل کے ٹیوٹا کس سے ایک شوہر نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔  
اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر خود ایک شوہر نکال لیا۔ اس نے ناک دگڑی تھی، آنکھیں نہیں۔  
”اور۔؟“ سالار نے بڑے قحط کے ساتھ ایک بار پھر کہا۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس نے اسے شادی کا کوئی گفت تک نہیں دیا۔ اس کی ایک دھکتی رگ یہ بھی تھی لیکن اس سے بچنے کا ذکر کرنا اسے اپنی توہین لگی۔ اس نے تجھے کا ذکر نہیں کیا۔ کچھ دیر وہ اپنی ناک دگڑتی مسکیوں کے ساتھ رو رہی۔ سالار نے بالآخر اس سے پوچھا۔  
”بس یا ابھی کچھ اور بھی جرم ہیں میرے؟“  
”مجھے پتا تھا کہ تم شادی کے بعد میرے۔“  
سالار نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”ساتھ یہی کوئے۔ مجھے پتا ہے، تمہیں میرے بارے میں سب کچھ پہلے سے ہی پتا چل جاتا ہے۔“ وہ اس

کے جملے پر بری طرح جڑا تھا۔ ”اس کے بلو جود اب تم مجھے کچھ کہنے کا موقع دو گی۔“ وہ چپ بیٹھی اپنی ناک دگڑتی رہی۔  
”اگر میں شادی کے اگلے دن آفس سے جلدی آسکتا تو آجاتا۔ آج آیا ہوں نا جلدی۔“

”تم اپنے پیرش کے لیے تو آگئے تھے۔“ امامہ نے مداخلت کی۔  
”اس دن میری پریزنٹیشن تھی اور میں نے تمہیں کال کی تھی۔ ایک بار نہیں آئی بار۔ تم اپنا سیل فون دیکھو یا میں دکھاؤں۔“ سالار نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔  
”میرے میسج کرنے پر تو نہیں کی تھی نا؟“

”اس وقت میں میٹنگ میں تھا، میرا سیل میرے پاس نہیں تھا۔ بورڈ روم سے نکل کر پہلی کال میں نے تمہیں ہی کی تھی، ریسیو کرنا تو ایک طرف تم نے توجہ تک نہیں دی۔ میں نے سعیدہ اماں کے گھر بھی تمہیں کالز کیں، تم نے وہاں بھی یہی کیا بلکہ سیل ہی آف کر دیا۔ تو مجھے بھی ناراض ہونا چاہیے تھا، مجھے کہنا چاہیے تھا کہ تم مجھے انور کر رہی ہو لیکن میں نے تو ایسا نہیں کیا۔ میں نے تو سوچا تک نہیں اس چیز کے بارے میں۔“ وہ اب اسے سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

”تمہیں اپنے ساتھ ایروورٹ لے کر جانا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ ایروورٹ ایک طرف ہے۔ پیرش میں میرا آفس ہے۔ اور دوسری طرف گھر۔ میں پہلے یہاں آتا۔ تمہیں لے کر پھر ایروورٹ جاتا۔ دگنا ٹائم لگتا۔ اور تمہارے لیے انہیں ایروورٹ جا کر ریسیو کرنا ضروری بھی نہیں تھا۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر بولا۔  
”اب میں شکایت کروں تم سے؟“

امامہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔  
”تم نے سعیدہ اماں کے گھر پھر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا، مجھ سے پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی۔“ اس کی آنکھوں میں سیلاب کا ایک نیار پڑا آیا۔  
”میرا خیال تھا، تم مجھے وہاں رہنے ہی نہیں دو گے، لیکن تم تو تنگ آئے ہوئے تھے مجھ سے۔ تم نے مجھے ایک بار بھی ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔“  
سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

”مجھے کیا پتا تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہاری خواہش ہے، مجھے پوری کرنی چاہیے۔ چلو ٹھیک ہے، میری غلطی تھی۔ مجھے کہنا چاہیے تھا تمہیں چلنے کے لیے، لیکن کم از کم تمہیں مجھے خدا حافظ کہنے کے لیے باہر تک تو آنا چاہیے تھا۔ میں پند بہ منٹ صحن میں کھڑا انتظار کرتا رہا لیکن تم نے ایک لمحہ کے لیے بھی باہر آنے کی زحمت نہیں کی۔“

”میں ناراض تھی اس لیے نہیں آئی۔“  
”ناراضی میں بھی کوئی فارمیٹھی تو ہوتی ہے نا۔؟“ وہ خاموش رہی۔

”تم نے فرقان کے حوالے سے ضد کی کہ مجھے وہاں نہیں جانا۔ خواہ خواہ کی ضد تھی۔ مجھے برا لگا تھا لیکن میں نے تمہیں اپنی بات ماننے پر مجبور نہیں کیا۔“ وہ ایک لمحہ کے لیے رکا۔ ”فرقان میرا سب سے زیادہ کلوڈ فرینڈ ہے۔ فرقان اور بھابھی نے ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا ہے اور یہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے کہ میری وائف اس فیملی کی عزت مند کرے۔“

اس کی آنکھوں میں ایل تے سیلاب کے ایک اور ریلے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا۔ امامہ نے اس بار کوئی وضاحت نہیں دی تھی۔



”میں نے تم سے یہ گلہ بھی نہیں کیا کہ تم نے میرے پیرئٹس کو ایک دفعہ بھی کال کر کے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ٹھیک سے پہنچ گئے یا ان کی فلائٹ ٹھیک رہی۔“ وہ بڑے قحط سے کہہ رہا تھا۔ وہ جڑ بڑھوٹی۔

”میرے پاس ان کا نمبر نہیں ہے۔“

”تم مجھ سے لے لیتیں اگر تم واقعی ان سے بات کرنے میں انٹرنیٹ ہو تم میں وہ تمہارے لیے یہاں آئے تھے تو تمہاری اتنی ذمہ داری تو بنتی تھی نا کہ تم ان کی فلائٹ کے بارے میں ان سے پوچھتیں یا ان کے جانے کے بعد ان سے بات کرتیں۔“

”تو تم مجھ سے کہہ دیجئے۔ کیوں نہیں کہا۔؟“

”میں نے اس لیے نہیں کہا کیونکہ یہ میرے نزدیک کوئی ایٹور نہیں ہیں۔ یہ معمولی باتیں ہیں۔ یہ ایسے ایٹور نہیں ہیں کہ جن پر میں تم سے ناراض ہونا چاہوں یا جھگڑا کروں۔“ وہ بول نہیں سکی۔

”لیکن تم نے یہ کیا کہ میرے خلاف کیس تیار کرتی رہیں۔۔۔ ہر چھوٹی بڑی بات دل میں رکھتی رہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔ لیکن سیدہ اماں کو سب کچھ بتایا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو بھی۔۔۔ کسی دوسرے سے بات کرنے سے پہلے تمہیں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی۔۔۔ کئی چاہیے تھی نا۔۔۔؟“

اس کے آنسو تھمنے لگے۔ وہ اسے بڑے قحط سے سمجھا رہا تھا۔

”اگر میں تمہاری بات نہ سنتا تو پور بات تھی۔ پھر تم کہتیں کسی سے بھی مجھے اعتراض نہ ہوتا۔“ وہ خاموش رہی۔ اس کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔

”تم سو نہ رہی ہو تم تو یقیناً تمہیں بتا کر ہی گھر سے لگتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں لیکن ایک سوئے ہوئے بندے کو صرف یہ بتانے کے لیے اٹھاؤں کہ میں جا رہا ہوں یہ تو میں کبھی نہیں کر سکتا۔“

وہ کچھ بول نہ سکی۔

”اگنور۔۔۔؟ میں حیران ہوں امامہ! کہ یہ خیال تمہارے دماغ میں کیسے آگیا۔ میں چار دن سے ساتویں آسمان پر ہوں اور تم کہہ رہی ہو میں تمہیں اگنور کر رہا ہوں۔“

”لیکن تم نے ایک بار بھی میری تعریف نہیں کی۔“ امامہ کو ایک اور ”خطا“ یاد آئی۔

سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کس چیز کی تعریف؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ ایک بے حد احمقانہ سوال تھا لیکن اس سوال نے امامہ کو شرمندہ کیا تھا۔“

”اب یہ بھی میں بتاؤں؟“ وہ بری طرح جگری تھی۔

”تمہاری خوب صورتی کی؟“ سالار نے کچھ الجھ کر اندازہ لگایا۔ وہ مزید خفا ہوئی۔

”میں کب کہہ رہی ہوں خوب صورتی کی کز۔ کسی بھی چیز کی تعریف کر دیتے میرے کپڑوں کی کر دیتے۔“

اس نے کہہ تو دیا لیکن وہ یہ شکایت کرنے پر پچھتائی۔ سالار کے جوابی سوالوں نے اسے بری طرح شرمندہ کیا تھا۔ سالار نے ایک نظر اسے پھر اس کے کپڑوں کو دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا اور بے اختیار ہنسا۔

”امامہ! تم مجھے اپنے منہ سے اپنی تعریف کرنے کے لیے کہہ رہی ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ جیسے اس کے لیے مذاق تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”مت کرو میں نے کب کہا ہے۔“

”نہیں! تو آؤ راست۔ میں نے واقعی ابھی تک تمہیں کسی بھی چیز کے لیے نہیں سراہا۔ مجھے کرنا چاہیے تھا۔“

وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے امامہ کی شرمندگی محسوس کر لی تھی۔

اس کے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے اس نے امامہ کو اپنے قریب کیا۔ اس بار امامہ نے اس کا ہاتھ نہیں جھکا تھا۔ اس کے آنسو اب ختم چکے تھے۔ سالار نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بڑی نرمی کے ساتھ سلاتے ہوئے بولا۔

”ایسی شکایتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں صرف چند دن کا ساتھ ہو لیکن جہاں زندگی بھر کی بات ہو وہاں یہ سب کچھ بہت سیکندری ہو جاتا ہے۔“ اسے اپنے ساتھ لگائے وہ بہت نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”تم سے شادی میرے لیے بہت معنی رکھتی تھی“ اور معنی رکھتی ہے۔ لیکن آئندہ بھی کچھ معنی رکھے گی“ اس کا انحصار تم پر ہے۔ مجھ سے جو گلہ ہے اسے مجھ سے کرو دوسروں سے نہیں۔ میں صرف تم کو جوادہ ہوں امامہ! کسی اور کے سامنے نہیں۔“ اس نے بڑے پنے تلے لفظوں میں اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”ہم کبھی دوست نہیں تھے لیکن دوستوں سے زیادہ بے تکلفی اور صاف گوئی رہی ہے ہمارے تعلق میں۔ شادی کا رشتہ اسے کمزور کیوں کر رہا ہے؟“

امامہ نے نظراٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں بھی وہی سنجیدگی نظر آئی جو اس کے لفظوں میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ ”وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا“ اس کے دل نے اعتراض کیا۔

”تم میری زندگی میں ہر شخص اور ہر چیز سے بہت زیادہ امپورٹنس رکھتی ہو۔“ سالار نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ایک جملہ میں تمہیں ہر روز نہیں کہہ پاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے لیے تمہاری امپورٹنس کم ہو گئی ہے۔ میری زندگی میں تمہاری امپورٹنس اب میرے ہاتھ میں نہیں تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ تمہیں ملے کرنا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تم اس امپورٹنس کو برہاؤ کی یا کم کر دو گی۔“

اس کی بات سننے ہوئے امامہ کی نظر اس کے اس ہاتھ کی پشت پر پڑی جس سے وہ اس کا ہاتھ سہارا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پشت بے حد صاف ستھری تھی۔ ہاتھ کی پشت اور کلائی پر بال نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہاتھ کی انگلیاں کسی مصور کی انگلیوں کی طرح لمبی اور عام مردوں کے ہاتھوں کی نسبت پتلی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر سبز اور نیلی رنگیں بہت نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں۔ اس کی کلائی پر رست واچ کا ہلکا سا نشان تھا۔ وہ یقیناً بہت یا قاعدگی سے رست واچ پہنتا تھا۔ وہ آج پہلی بار اس کے ہاتھ کو اتنے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کے ہاتھ بہت اچھے لگے۔ اس کا دل کچھ اور موم ہوا۔

اس کی توجہ کہاں تھی سالار کو اندازہ نہیں ہو سکا۔ وہ اسے اسی طرح سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

”محبت یا شادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں پارٹنرز ایک دوسرے کو اپنے ہاتھ کی مٹھی میں بند کر کے رکھنا شروع کر دیں۔ اس سے رشتے مضبوط نہیں ہوتے دم گھٹنے لگتا ہے۔ ایک دوسرے کو لپیٹیں دینا ایک دوسرے کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنا ایک دوسرے کی آزادی کے حق کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔“ امامہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ دیکھا وہ اب بے حد سنجیدہ تھا۔

”ہم دونوں اگر صرف ایک دوسرے کے عیب اور کوتاہیاں ڈھونڈتے رہیں گے تو بہت جلد ہمارے دل سے ایک دوسرے کے لیے عزت اور لحاظ ختم ہو جائے گا۔ کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا گیا ہو اگر عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں محبت کے گھر کی چار دیواری ہیں چار دیواری ختم ہو جائے تو گھر کو بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔“

امامہ نے بڑی حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر مسکرایا۔

”اچھی فلاسفی ہے نا۔؟“

copied From W

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM



امامہ کی آنکھوں میں نمی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بیک وقت آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔  
سالار نے اسے اپنے کچھ اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

”میں اللہ کا رب کھٹ بندہ نہیں ہوں تو تمہارا پر فیکٹ شو ہر کیسے بن سکتا ہوں امامہ! شاید اللہ میری کوتاہیاں نظر انداز کر دے تو تم بھی معاف کر دیا کرو۔“

وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی وہ واقعی اس سالار سکندر سے ناواقف تھی۔ سالار نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سوچے ہوئے پونوں کو اپنی پوروں سے چھوا۔  
”کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنی آنکھوں کا۔؟ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا؟“  
وہ بڑی ملائمت سے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے جواب دینے کے بجائے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ وہ اب بے حد پرسکون تھی۔ اس کے گرد اپنا ایک بازو جمائے کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے اور گردن پر آئے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے اس نے پہلی بار تو اس کی آنکھوں کے بعد زیادہ اچھی لگتی ہے لیکن اس سے یہ بات کہنا اپنے پاؤں پر کھلاڑی مارنے والی بات تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ اس کے ٹائٹل کی شرٹ پر بنے یلین پر غیر محسوس انداز میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”موو کلر اچھا لگتا ہے تم پر۔“ اس نے بے حد دمانیک انداز میں اس کے کپڑوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس کے سینے پر حرکت کرتا اس کا ہاتھ یک دم رکا۔ امامہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سالار نے اس کی آنکھوں میں غلطی دیکھی تھی مسکرایا۔

”تعریف کر رہا ہوں تمہاری۔“  
”یہ نی پنگ ہے۔“

”اوہ اچھا۔“ سالار نے گڑبڑا کر اس کے کپڑوں کو دوبارہ دیکھا۔  
”یہ نی پنگ ہے؟ میں نے اصل میں موو کلر بہت عرصے سے کسی کو پہنے نہیں دیکھا۔“ سالار نے وضاحت کی۔

”کل موو ہسنا ہوا تھا میں نے۔“ امامہ کی آنکھوں کی غلطی بڑھی۔  
”لیکن میں تو اسے پہل سمجھا تھا۔“ سالار مزید گڑبڑایا۔

”وہ جو سامنے دیوار پر پینٹنگ ہے نا اس میں ہیں پر پل فلاورز۔“ امامہ نے کچھ قفل کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

سالار اس پینٹنگ کو گھورتے ہوئے اسے یہ نہیں بتا سکا کہ وہ ان فلاورز کو بلو کلر کا کوئی شیڈ سمجھ کر لایا تھا۔ امامہ اب اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ سالار نے کچھ بے چارگی کے انداز میں گہرا سانس لیا۔

”میرا خیال ہے اس شادی کو کامیاب کرنے کے لیے مجھے اپنی جیب میں ایک شیڈ کارڈ رکھنا پڑے گا۔“ وہ پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔



وہ پہلی صبح تھی جب اس کی آنکھ سالار سے پہلے کھلی تھی الارم سیٹ ٹائم سے بھی دس منٹ پہلے چند منٹوں سے اسی طرح بستر میں پڑی رہی۔ اسے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ رات کا کون سا پہرہ ہے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا الارم کلاک اٹھا کر اس نے ٹائم دیکھا پھر ساتھ ہی الارم آف کر دیا۔ بڑی احتیاط سے وہ اٹھ کر بستر میں بیٹھی۔ سائیڈ ٹیبل

کا لیپ بڑی احتیاط سے آہن کرتے ہوئے اس نے سلیپر ڈھونڈے پھر اس نے کھڑے ہوتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کا لیپ آف کیا۔ تب اس نے سالار کی سائیڈ کے لیپ کو آہن ہوتے دیکھا۔ وہ کس وقت بیدار ہوا تھا؟ امامہ کو اندازہ نہیں ہوا تھا۔

”میں سمجھی تم سو رہے ہو۔“ اس نے سالار کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔  
”میں ابھی اٹھا ہوں کمرے میں آہٹ کی وجہ سے۔“

وہ اسی طرح لیٹے لیٹے اب اپنا سیل فون دیکھ رہا تھا۔  
”لیکن میں نے تو کوئی آواز نہیں کی۔ میں تو کوشش کر رہی تھی کہ تم ڈسٹرب نہ ہو۔“ امامہ کچھ حیران ہوئی تھی۔

”میری نیند زیادہ گہری نہیں ہے امامہ! کمرے میں ہلکی سے ہلکی آہٹ بھی ہو تو میں جاگ جاتا ہوں۔“ اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سیل سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

”میں آئندہ احتیاط کروں گی۔“ اس نے کچھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔  
”ضرورت نہیں مجھے عادت ہے اسی طرح کی نیند کی۔ مجھے اب فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے بیڈ پر پڑا ایک اور

تکیہ اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ واش روم میں جانے سے پہلے چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ ہر انسان ایک کتاب کی طرح ہوتا ہے۔ کھلی کتاب جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے۔ سالار بھی اس کے لیے ایک کھلی کتاب تھا لیکن چائنیز زبان میں لکھی ہوئی کتاب۔

اس دن اس نے اور سالار نے سحری اٹھنے کی اور ہر روز کی طرح سالار، فرقان کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ شاید پچھلے کچھ دنوں کی شکایتوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امامہ کا موڈ رات کو ہی بہت اچھا ہو گیا تھا اور اس میں مزید بہتری اس کی اس ”توجہ“ نے کی۔

مسجد میں جانے سے پہلے آج پہلی بار اس نے اسے مطلع کیا۔  
”امامہ! تم میرا انتظار مت کرنا۔ نماز پڑھ کر سو جانا میں کافی لیٹ آؤں گا۔“

اس نے جاتے ہوئے اسے تاکید کی لیکن وہ اس کی تاکید کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

وہ ساڑھے آٹھ بجے اس کے آفس جانے کے بعد سوئی تھی۔ دوبارہ اس کی آنکھ گیارہ بجے ڈور بیل کی آواز پر کھلی۔ نیند میں اپنی آنکھیں ملے ہوئے اس نے بیڈ روم سے باہر نکل کر اپنا نمٹ کاوا خلی دروازہ کھولا۔ چالیس

پینتالیس سالہ ایک عورت نے اسے بے حد پر تجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا۔  
”مجھے نوشین باجی نے بھیجا ہے۔“ اس نے اپنا تعارف کروایا۔

امامہ کو یک دم یاد آیا کہ اس نے نوشین کو صفائی کے لیے ملازمہ کو کل کے بجائے اگلے دن بھیجنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسے راستہ دیتی ہوئی دروازے سے ہٹ گئی۔

”اتنی خوش ہوئی جب نوشین باجی نے مجھے بتایا کہ سالار صاحب کی بیوی آگئی ہے۔ مجھے تو بتا ہی نہیں چلا کہ کب شادی کر لی سالار صاحب نے۔“ امامہ کے پیچھے اندر آتے ہوئے ملازمہ کی باتوں کا آغاز ہو گیا تھا۔

”کہاں سے صفائی شروع کرنی ہے تم نے؟“  
امامہ کی فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے صفائی کے بارے میں کیا ہدایات دے۔

”باجی! آپ فکر نہ کریں۔ میں کر لوں گی آپ چاہے آرام سے سو جاؤ۔“ ملازمہ نے اسے فوری آفر کی۔ یہ شاید اس نے اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔





”نہیں، ہم لاؤنج سے صفائی شروع کرو میں ابھی آتی ہوں۔“  
 تقریری نہیں تھی اسے واقعی بہت نیند آ رہی تھی لیکن وہ اس طرح اسے گھر میں کام کرنا چھوڑ کر سو نہیں سکتی تھی۔

واش روم میں آکر اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، کپڑے تبدیل کر کے بال سمیٹے اور لاؤنج میں نکل آئی۔  
 ملازمہ ڈسٹنگ میں مصروف تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں کے بلائینڈراب ہٹے ہوئے تھے۔ سورج ابھی پوری طرح نہیں ٹھکا تھا لیکن اب دھند نہ ہونے کے برابر تھی۔ لاؤنج کی کھڑکیوں سے باہر پورے دیکھ کر اسے انہیں پالی دینے کا خیال آیا۔

ملازمہ ایک بار پھر گھنگو کا آواز کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اسے بالکونی کی طرف جاتے دیکھ کر چپ ہو گئی۔  
 جب وہ پودوں کو پالی دے کر فارغ ہوئی تو ملازمہ لاؤنج صاف کرنے کے بعد اب سالار کے اس کمرے میں جا چکی تھی جسے وہ اسٹڈی روم کی طرح استعمال کرتا تھا۔  
 ”سالار صاحب بڑے اچھے انسان ہیں۔“

تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے میں اپارٹمنٹ کی صفائی کرنے کے بعد امامہ نے اس سے چائے کا پوچھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے ملازمہ نے ایک بار پھر اس سے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ امامہ اس کے بھرمے پر صرف مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

”آپ بھی ان کی طرح جہولتی نہیں ہیں؟“ ملازمہ نے اس کے بارے میں اپنا پسلا انداز لگایا۔

”اچھا سالار بھی نہیں بولتا۔“ امامہ نے جان بوجھ کر اسے موضوع گھنگو بتایا۔

”کہاں جی۔ حمید بھی یہی کہتا ہے صاحب کے بارے میں۔“

ملازمہ نے شاید سالار کے ملازم کا نام لیا تھا۔

”لیکن باجی! بڑی حیا ہے آپ کے آدمی کی آنکھ میں۔“

اس نے ملازمہ کے جملے پر جیسے بے حد حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ ملازمہ بڑی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔

”جیسے فرقان صاحب ہیں ویسی ہی عادت سالار صاحب کی ہے۔ فرقان صاحب تو خیر سے پال بچوں والے ہیں لیکن سالار صاحب تو اکیلے رہتے تھے اوہر۔ میں تو کبھی بھی اس طرح اکیلے مردوں والے گھروں میں صفائی نہ کروں۔ بڑی دنیا دیکھی ہے جی میں نے، لیکن یہاں کام کرتے ہوئے ابھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا صاحب نے مجھے میں کئی بار سوچتی تھی کہ بڑے ہی نصیب والی عورت ہوگی، بنو اس گھر میں آئے گی۔“  
 ملازمہ فراموشی سے بول رہی تھی۔

بٹر کے سامنے صوفے پر نیمہوار امامہ اس کی باتیں سنتی کسی سوچ میں گم رہی۔ ملازمہ کو حیرت ہوئی تھی کہ باجی اپنے شوہر کی تعریف پر خوش کیوں نہیں ہوئی۔ ”باجی“ کیا خوش ہوئی کہ کم از کم اسے اتنی توقع تو تھی اس سے کہ وہ گھر میں کام کرنے والی کسی عورت کے ساتھ بھی انوالو نہیں ہو سکتا۔ وہ مردوں کی کوئی بڑی ہی بدترین قسم ہوتی ہو گی جو گھر میں کام کرنے والی ملازمہ پر بھی نظر رکھتے ہوں گے اور سالار کم از کم اس قسم کے مردوں میں شمار نہیں ہو سکتا تھا۔

ملازمہ اس کی مسلسل خاموشی سے کچھ ہزار ہو کر جلد ہی چائے پی کر فارغ ہو گئی۔ امامہ اس کے پیچھے دروازہ بند کرنے لگی تو ملازمہ نے باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر اس سے کہا۔  
 ”باجی! اکل ذرا جلدی آجاؤں آپ کے گھر؟“

امامہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر یقیناً ”کوئی ایسا تاثر تھا جس نے ملازمہ کو کچھ بوکھلا دیا تھا۔“  
 ”باجی! مجھے چھوٹے بچے کو ہسپتال لے کر جانا ہے اس لیے کہہ رہی تھی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔  
 ”ہاں، ٹھیک ہے۔“ امامہ نے بمشکل جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ کل جلدی آنے کے مطالبے نے اسے ساکت نہیں کیا تھا بلکہ اسے ساکت کیا تھا اس کے تین لفظوں نے۔ ”آپ کے گھر؟“ یہ ”اس کا گھر“ تھا جس کے لیے وہ اتنی سالوں سے خوار ہوتی پھر رہی تھی۔ جس کی آس میں وہ کتنی بار جلال انصر کے پیچھے گرد گزرائے گئی تھی۔ یہ بے یقینی سے لاؤنج میں آکر ان دیواروں کو دیکھ رہی تھی جنہیں دنیا ”اس کے گھر“ کے نام سے شناخت کر رہی تھی وہ واقعی اس کا گھر تھا۔ وہ پناہ گاہیں نہیں تھیں جہاں وہ اتنے سال سر جھکا کر منوں واحسان مندیں کر رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک ریلا آیا تھا اس کی آنکھوں میں۔ بعض اوقات انسان سمجھ نہیں پاتا کہ وہ روئے یا نہیں۔ روئے تو کتنا روئے۔ بنے تو کتنا بنے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی کسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح ہر کمرے کا دروازہ کھول کھول کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہی تھی۔ وہ جا سکتی تھی وہاں۔ جو چاہے کر سکتی تھی۔ یہ اس کا گھر تھا۔ یہاں کوئی جگہ اس کے لیے ”علاقہ غیر“ نہیں تھی۔ اسے بس اتنی سی دنیا ہی چاہیے تھی اپنے لیے۔ کوئی ایسی جگہ جہاں وہ استحقاق کے ساتھ رہ سکتی ہو۔ سالار یک دم جیسے کہیں پیچھے چلا گیا تھا۔ گھر کے معاملے میں عورت کے لیے ہر مرد پیچھے رہ جاتا ہے۔

سالار نے اسے دوبارہ نئے وقفے سے سیل پر کال کی لیکن امامہ نے ریسیو نہیں کی۔ سالار نے تیسری بار پھر ٹی ٹی سی ایل پر کال کی اس بار امامہ نے ریسیو کی لیکن اس کی آواز سننے ہی سالار کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ اسے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“

وہ دوسری طرف جیسے اپنے آنسوؤں اور آواز پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 ”کیوں رو رہی ہو؟“

سالار کی واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ رات ہر جگہ بے حد خوشگوار انداز میں ہوا تھا۔ وہ صبح دروازے تک مسکرا کر اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ پھر اب؟ وہ الجھ رہا تھا۔  
 دوسری طرف امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے رونے کا کیا جواز پیش کرے۔ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس لیے رو رہی ہے کہ کسی نے اسے ”گھروالی“ کہا ہے۔ سالار یہ بات نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کوئی بھی مرد نہیں سمجھ سکتا۔  
 ”مجھے ای اور ابویاد آ رہے ہیں۔“ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔

یہ وجہ سمجھ میں آئی تھی۔ وہ ایک دم پر سکون ہوا۔ ادھر وہ بالکل خاموش تھی۔ سالار باپ کا ذکر کیا تھا جھوٹ بولا تھا لیکن اب رونے کی جیسے ایک اور وجہ مل گئی تھی۔ جو آنسو پلے تھم رہے تھے وہ ایک بار پھر سے برسنے لگے تھے۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ فون پر اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا۔

وہ اس غیر ملکی بینک میں انویسٹمنٹ بینکنگ کو ہیڈ کرتا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا انویسٹمنٹ scam پکڑ سکتا تھا۔ خسارے میں جاتی بڑی سے بڑی کمپنی کے لیے تیل آؤٹ پلان تیار کر سکتا تھا۔ کمپنیز کے مارجن بکھڑ تیار کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ انویسٹمنٹ دن پر منشن کی پریسینشن کے ساتھ ورلڈ اسٹاک مارکیٹس کے ٹریڈرز کی پیش بینی کر سکتا تھا۔ مشکل سے مشکل سرمایہ کار کے ساتھ سوداے کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا لیکن شادی کے اس ایک ہفتے کے دوران ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ امامہ کو رووتے ہوئے چپ نہیں کرا سکتا۔ نہ وہ ان



آنسوؤں کی وجہ ڈھونڈ سکتا تھا نہ انہیں روکنے کے طریقے آتے تھے وہ کم از کم اس میدان میں بالکل اناڑی تھا۔

”ملازمہ نے گھر صاف کیا تھا آج؟“ ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے امامہ کی توجہ روکنے سے ہٹانے کے لیے جس موضوع اور جملے کا انتخاب کیا وہ احمقانہ تھا۔ امامہ کو جیسے یقین نہیں آیا کہ یہ بتانے پر کہ اسے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں سالار نے اس سے یہ پوچھا ہے۔ پچھلی رات کے سالار کے سارے لیکچرز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے ریسیور کرپل پر فون کیا اور فون منقطع ہوتے ہی سالار کو اپنے الفاظ کے غلط انتخاب کا احساس ہو گیا تھا۔ اپنے سیل کی ماریکا سکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

اسکے پانچ منٹ وہ سیل ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا اس نے اب کال کی تو وہ ریسیور نہیں کرے گی پانچ منٹ کے بعد اس نے دوبارہ کال کی۔ خلاف توقع امامہ نے کال ریسیو کی۔ اس بار اس کی آواز میں خفگی تھی لیکن وہ بھرائی ہوئی نہیں تھی۔ وہ یقیناً ”رونا بند کر چکی تھی۔“

”آئی ایم سوری! سالار نے اس کی آواز سنتی ہی کہا۔

امامہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس وقت اس کی معذرت نہیں سن رہی تھی۔ وہ صرف ایک ہی بات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی ”اے سالار پر غصہ کیوں آجاتا تھا؟ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ اتنے سالوں میں جس ایک احساس کو وہ عمل طور پر بھول گئی تھی وہ غصے کا احساس ہی تھا۔ یہ احساس اس کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔ اتنے سالوں سے اس نے اللہ کے علاوہ کسی سے کبھی کوئی گلہ کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ کسی سے ناراض ہونا یا کسی کو خفگی دکھانا تو بہت دور کی بات ہے۔ پھر اب یہ احساس اس کے اندر کیوں جاگ اٹھا تھا۔ سعیدہ ماں ڈاکٹر سبط علی اور ان کی فیملی۔ اس کے کلاس فیلو۔ گونگیز۔ ان میں سے کبھی کسی پر اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ ہاں! کبھی کبھار شکایت ہوئی تھی لیکن وہ شکایت کبھی لفظوں کی شکل اختیار نہیں کر سکی پھر اب کیا ہو رہا تھا اسے؟

”امامہ پلیز بولو۔ کچھ کہو۔“ وہ چونکی۔

”نماز کا وقت نکل رہا ہے مجھے نماز پڑھنی ہے۔“ اس نے اسی الجھے ہوئے انداز میں اس سے کہا۔

”تم خفا تو نہیں ہو؟“ سالار نے اس سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے مدھم آواز میں کہا۔

وہ نماز کے بعد دیر تک اسی ایک سوال کا جواب ڈھونڈتی رہی اور اسے جواب مل گیا۔ نو سال میں اس نے پہلی بار اپنے لیے کسی کی زبان سے محبت کا اظہار سنا تھا۔ وہ احسان کرنے والوں کے جھوم میں تھی پہلی بار کسی محبت کرنے والے کے حصار میں آئی تھی۔ گلہ، شکوہ، تاز، غم، غصہ، خفگی یہ سب کیسے نہ ہوتا اسے ”پتا تھا کہ جب وہ روٹھے گی تو اسے منالے گا“ خفا ہوگی تو وہ اسے وضاحتیں دے گا، مان تھایا گمان۔ لیکن جو کچھ بھی تھا غلط نہیں تھا۔ اتنے سالوں میں جو کچھ اس کے اندر جمع ہو گیا تھا وہ کسی لاوے کی طرح نکل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ نارمل ہو رہی تھی۔

\*\*\*

شام کو سالار اسے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ یہ خلاف توقع تھا خاص طور پر وہ ہر والے واقعہ کے بعد۔ لیکن اس رات وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا۔ وہ بے حد نروس تھی لیکن بے حد ایکسائٹڈ بھی۔ وہ کتنے سالوں کے بعد یوں کسی ریسیورنٹ کے اوپن ایئر حصہ میں بیٹھی باہر کی کھارہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ دونوں بونڈو شاپنگ کی نیت سے مارکیٹ چلے آئے۔ سالار نے بڑی نرمی اور توجہ سے اسے

خود کو سنبھالنے کا موقع دیا تھا۔ وہ اس سے ملکی پھلکی باتیں کر رہا تھا کھانا ختم کرنے تک وہ نارمل ہو چکی تھی۔ عید کی خریداری کی وجہ سے مارکیٹ میں اس وقت بھی بڑی گہما گہمی تھی۔ وہ بہت عرصہ کے بعد وہاں آئی تھی۔ مارکیٹ کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ وہ بے حد حیرت سے ان نیو برانڈز اور وکالوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی جو آٹھ نو سال پہلے وہاں نہیں تھیں۔ ڈاکٹر سبط علی کی بیٹیاں باسعیدہ ماں کے بیٹے اپنی فیملی کے ساتھ جب بھی اوٹنگ کے لیے باہر نکلتے تھے اسے بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے لیکن ان کے ساتھ باہر نہ جانے کا فیصلہ اس کا اپنا ہوتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کے لیے مزید کسی مصیبت کا باعث نہیں بننا چاہتی تھی۔ شادی کو وہ صرف رہنے کی جگہ کی تبدیلی سمجھ رہی تھی حالات کی تبدیلی کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن معجزات ہوتے ہیں۔ شاذ و نادر سے لیکن ہوتے ضرور ہیں۔

”کچھ لوگی؟“ سالار کی آواز رو بہ اختیار ہو گئی۔

”ہاں۔“ کالی۔ ”اس نے جھجک کر کہا۔

”میں شاپنگ کی بات کر رہا تھا۔“ اس نے کہا۔

”نہیں میرے پاس سب کچھ ہے۔“ امامہ نے مسکرا کر کہا۔

”وہ تو اب میرے پاس بھی ہے۔“ اس کے چہرے پر بے اختیار سرخی بڑھتی تھی۔

”تمہیں میری تعریف اچھی لگی۔“

”سالار! باز تو میں نے تمہیں یہاں تعریف کرنے کو کہا تھا؟“ یہ بے ساختہ جھہنپ۔

”نہ نے جگہ نہیں بتائی تھی صرف یہ کہا تھا کہ مجھے تمہاری تعریف کرنی چاہیے۔“ وہ اسے چھیڑتے ہوئے محفوظ ہو رہا تھا۔

امامہ نے اس بار گردن موڑ کر اسے نظر انداز کیا۔ اس کے ساتھ چلتے چلتے ایک شوکیس میں ڈسپلے پر لگی ایک ساڑھی دیکھ کر وہ بے ساختہ رک گئی۔ کچھ دیر متاثری نظروں سے وہ اس گلابی رنگ کی ساڑھی کو دیکھتی رہی۔ وہاں شوکیس میں لگی یہی وہ شے تھی جس کے سامنے وہ یوں ٹھنک کر رک گئی تھی۔ سالار نے ایک نظر اس ساڑھی کو دیکھا پھر اس کے چہرے کو اور بڑی سہولت کے ساتھ کہا۔

”مجھے لگتا ہے یہ ساڑھی تم پر بہت اچھی لگے گی،“ اویلتے ہیں۔ ”وہ گلاس ڈور کھولتے ہوئے بولا۔

”نہیں میرے پاس بہت سے فینسی کپڑے ہیں۔“ امامہ نے اس کے ہانڈ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

”لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیا تمہیں شادی پر اس لیے کچھ دینا چاہتا ہوں۔“

وہ اس بار بول نہیں سکی۔ وہ ساڑھی اسے واقعی بہت اچھی لگی تھی۔

اس بوتھک سے انہوں نے صرف وہ ساڑھی ہی نہیں خریدی بلکہ چند اور سوٹ بھی لیے تھے۔ وہ سری بوتھک سے گھر میں پہننے کے لیے کچھ ریڈی میڈ بلوسات، کچھ سویٹرز اور جوتے۔

”مجھے پتا ہے تمہارے پاس کپڑے ہیں لیکن تم میرے خریدے ہوئے پہنوں گی تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔ یہ سب میں اپنی خوشی کے لیے کر رہا ہوں، تمہیں خوش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔“

اس کے پہلے اعتراض پر سالار نے بے حد رسانیت سے کہا تھا۔

امامہ نے اس کے بعد اعتراض نہیں کیا۔ اسے کچھ جھجک تھی لیکن تھوڑی دیر میں یہ جھجک بھی ختم ہو گئی۔ پھر اس نے ساری چیزیں اپنی پسند سے لی تھیں۔

”مجھے تم پر ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ سو تم مجھ سے مت پوچھو۔“ اس نے سالار کی پسند پوچھی تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔



”لاؤنج کی کھڑکیوں پر کرنل (بروئے) لگا لیں۔“ امامہ کو یاد آیا۔

”بلا سٹڑ سے کیا ایٹھو ہے تمہیں؟“ وہ چونکا۔

”کوئی نہیں لیکن مجھے کرنل اچھے لگتے ہیں۔ خوب صورت سے۔“

”کیوں نہیں۔“ سالار نے اپنے دلی تاثرات چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اسے پردوں سے چڑھ گئی۔

رات پونے بارہ بجے ایک کینے میں کافی اور میز میسویک کھانے کے بعد وہ تقریباً ”ساڑھے باپہ بجے گھر واپس آئے۔ لاہور تک ایک بار پھر دھند میں ڈوب چکا تھا لیکن زندگی کے راستے سے دھند چھٹنے لگی تھی۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ بے مقصد ان چیزوں کو گھول کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ کتنے سالوں بعد وہ ملنے والی کسی چیز کو تشکر اور احسان مندی کے بوجھ کے ساتھ نہیں بلکہ استحقاق کے احساس کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

عورت کے لیے بہت ساری نعمتوں میں سے ایک نعمت اس کے شوہر کا اس کی ذات پر پیسہ خرچ کرنا بھی ہے اور یہ نعمت کیوں تھا وہ اسے آج سمجھ پائی تھی۔

ڈاکٹر سبط علی اور ان کی بیوی ہریزن کے آغاز میں اسے کپڑے اور دوسری چیزیں خرید کر دیتے تھے۔ سعیدہ اماں بھی اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی تھیں۔ ان کے بیٹے اور ڈاکٹر سبط علی کی بیٹیاں بھی اسے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی تھیں لیکن ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے ایسی خوشی یا سکون محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ خیرات نہیں دیتی تھی لیکن وہ حق بھی نہیں تھا وہ احسان تھا اور وہ اتنے سالوں میں بھی اپنے وجود کو احسانوں کا عادی نہیں بنا سکی تھی۔ بے شک وہ اس کی زندگی کا حصہ ضرور بن گئے تھے۔

یہ کیسا احساس تھا جو ان چیزوں کو گود میں لیے اسے ہو رہا تھا۔ خوشی؟ آزادی؟ طمینان؟ سکون۔؟ یا کوئی ایسی شے تھی جس کے لیے اس کے پاس لفظ نہیں تھے۔

”کیا دیکھ رہی ہو تم؟“

سالار کپڑے تبدیل کر کے واش روم سے نکلا تھا اور ڈریسنگ روم کی لائٹ آف کر کے کمرے میں آتے ہوئے اس نے امامہ کو اسی طرح صوفے پر وہ ساری چیزیں پھیلائے بیٹھے دیکھا۔ وہ حیران سا ہوا۔ وہ جب سے آئی تھی اس وقت سے ان چیزوں کو لے کر جیٹھی ہوئی تھی۔

”کچھ بھی نہیں میں بس رکھنے ہی لگی تھی۔“ امامہ نے ان چیزوں کو سینٹا شروع کر دیا۔

”ایک وارڈ روب میں نے خالی کر دی ہے تم اپنے کپڑے اس میں رکھ لو۔ اگر کچھ اور جگہ کی ضرورت ہو تو گیسٹ روم کی ایک وارڈ روب بھی خالی ہے۔ تم اسے استعمال کر سکتی ہو۔“

وہ اپنے کمرے سے کچھ ڈھونڈتا ہوا اس سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے سعیدہ اماں کے گھر سے اپنا سامان لانا ہے۔“ امامہ نے ساری چیزوں کو دو باہر ڈالوں اور بیگنوں میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیسا سامان؟“ وہ ابھی تک دراز میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

”میرے جینز کا سامان۔“ امامہ نے بڑی رسائی سے کہا۔

”مثلاً؟“ وہ دراز سے نکالے گئے کچھ پیپر دیکھتے ہوئے چونکا۔

”برتن ہیں“ الیکٹرونکس کی چیزیں ہیں۔ فریج چر بھی ہے لیکن وہ شوروم پر ہے۔ اور بھی کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔“

وہ ان پیپر ڈکوریٹ میں رکھ کر اس کی بات سنتا رہا۔

”تمہارے ذاتی استعمال کی کوئی چیز ہے وہاں۔؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ سب میری ذاتی چیزیں ہیں۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”وہ جینز کا سامان ہے۔“ سالار نے اسے جتانے والے انداز میں کہا۔

”اب تم کہو گے تمہیں جینز نہیں چاہیے۔“ وہ کچھ جزیبہ ہو کر بولی۔

”مجھے کسی بھی قسم کا سامان نہیں چاہیے۔“ سالار نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”تمہیں لگتا ہے اس اپارٹمنٹ میں پہلے ہی کسی چیز کی کمی ہے۔؟ تم چاہتی ہو یہاں ہر چیز دو دو کی تعداد میں ہو۔ رکھیں گے کہاں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ امامہ سوچ میں پڑ گئی۔

”اتنے سالوں سے چیزیں میں خریدتی رہی ہوں اپنے لیے لیکن زیادہ سامان ابو کے پیسوں سے آیا ہے۔ وہ ناراض ہوں گے۔“ وہ اب بھی تیار نہیں تھی۔

”ڈاکٹر صاحب نے اپنی تینوں بیٹیوں کو جینز دیا؟“ وہ اب پوچھ رہا تھا۔ ”نہیں دیا نا؟“

”تمہیں کیسے پتا؟“ وہ چند لمحے بول نہیں سکی۔

”انہوں نے ہمیں خود بتایا تھا۔“ اس نے کہا۔

”ان کی تینوں بیٹیوں کی شادیاں فیملی میں ہوئی ہیں اس لیے۔“ امامہ نے کہا۔

”ٹرسٹی۔ میں بھی جینز لے کر نہ آئے ہر تم سے برا سلوک نہیں کروں گا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا تحفہ ہوتا تو میں ضرور رکھتا لیکن یہ انہوں نے تمہاری سیکورٹی کے لیے دیا تھا کیونکہ تمہاری شادی کسی ایسی فیملی میں ہو رہی تھی جن کے بارے میں وہ مکمل طور پر نہیں جانتے تھے لیکن میرے بارے میں تو وہ بھی جانتے ہیں اور تم بھی۔“ سالار نے اس سے کہا۔

”میرے برتن، بیڈ شیٹیں اور کپڑے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کتنی چیزیں ہیں جو میں اتنے سالوں سے جمع کر رہی ہوں۔ اب کیسے دے دوں یہ سب کچھ؟“ وہ ناخوش تھی۔

”اوکے جو چیز تم نے اپنی بے سے لی ہے وہ لے آؤ پاتی چھوڑ دو سب کچھ۔ وہ کسی خیراتی ادارے کو دے دیں گے۔“ سالار نے ایک اور غل ٹکالا۔ وہ اس بار کچھ سوچنے لگی۔

”میں صبح اٹھ جاتے ہوئے تمہیں سعیدہ اماں کی طرف چھوڑ دوں گا اور آٹھس سے آج ذرا جلدی آجاؤں گا۔ تمہاری پیکنگ بھی کروا دوں گا۔“

وہ ہاتھ میں کچھ پیپر لیے ہوئے اس کی طرف آیا۔ صوفے پر اس کے پاس پڑی چیزوں کو ایک طرف کرتے ہوئے وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”یہ جس جگہ پر کر اس کا نشان ہے اس پر اپنے سائن کر دو۔“

اس نے کچھ پیپر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک پین اسے تھمایا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے کچھ حیران ہو کر ان پیپر ڈکوریٹ دیکھا۔

”میں اپنے بینک میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا رہا ہوں۔“

”لیکن میرا اکاؤنٹ تو پہلے ہی کھلا ہوا ہے۔“

”ہلو ایک اکاؤنٹ میرے بینک میں بھی سہی۔ برے نہیں ہیں ہم، اچھی سروس دیتے ہیں۔“ اس نے مذاق کیا۔ امامہ نے پیپر ڈکوریٹ کرنا شروع کر دیا۔

”پھر وہ اکاؤنٹ بند کروں؟“ امامہ نے سائن کرنے کے بعد کہا۔

”نہیں اسے ویس رہنے دو۔“ سالار نے پیپر اس سے لیتے ہوئے کہا۔



”تمہیں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کتنی رقم کا چیک دوں؟“  
امامہ کا خیال تھا کہ وہ غیر ملکی بینک ہے۔ یقیناً ”اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ملکی بینک کی نسبت کچھ زیادہ رقم کی ضرورت ہوگی۔“

”تمہارا حق مہر ہے کرنا ہے مجھے اسی رقم سے کھول دوں گا۔“  
سالار نے ہنسی رائے لگائی اور کہا۔

”اس پر ایک ٹیکو لکھو۔“  
امامہ نے حیرانی سے اس رائٹنگ پیڈ کو دیکھا جو اس نے اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ”کیسی فکر؟“ وہ ابھی۔  
”کوئی بھی فکر اپنی مرضی کے کچھ ڈیجٹس (ہندسے)۔“ سالار نے کہا۔

”کیوں؟“ وہ مزید ابھری۔  
سالار نے اس کے ہاتھ میں ہین تھمایا۔ اس نے دوبارہ ہین پکڑ لیا لیکن اس کا ذہن مکمل طور پر خالی تھا۔  
”کتنے ڈیجٹس کا فکر۔“ امامہ نے چند لمحوں بعد اس کی مدد چاہی۔

وہ یکدم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔  
”اگر تم اپنی مرضی سے کوئی فکر لکھو گی تو کتنے ڈیجٹس لکھو گی۔“  
”سیون ڈیجٹس۔“ امامہ سوچ میں پڑ گئی۔

”آل رائٹ۔“ لکھو پھر۔“ سالار کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آئی۔  
امامہ چند لمحوں کے بعد اس صاف کانڈ کو دیکھتی رہی پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔ 3752960۔ اس نے رائٹنگ پیڈ سالار کی طرف بڑھادیا۔ کانڈ پر نظر ڈالتے ہی وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سکتہ میں آیا پھر کانڈ کو پیڈ سے الگ کرتے ہوئے بے اختیار ہنسا۔

”کیا ہوا؟“ وہ اس کے رد عمل سے کچھ اور ابھری۔  
”کچھ نہیں۔ کیا ہونا تھا؟“ کانڈ کو تھمہ کرتے ہوئے اس نے امامہ کے چہرے کو مسکراتے ہوئے بے حد گہری لیکن عجیب نظروں سے دیکھا۔

”اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟“ وہ اس کی نظروں سے ابھری۔  
”تمہارا شوہر ہوں دیکھ سکتا ہوں تمہیں۔“

امامہ کو احساس نہیں ہوا وہ بڑی صفائی سے بات بدل رہا تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے وہ غیر محسوس انداز میں کانڈ بھی اس لفافے میں ڈال چکا تھا۔

”تم نے مجھے ساڑھی پہن کر نہیں دکھائی؟“  
رات کے اس وقت میں تمہیں ساڑھی پہن کر دکھاؤں؟“ وہ بے اختیار ہنسی۔  
وہ اس کے پاس سے اٹھتے اٹھتے رک گیا۔ وہ پہلی بار اس طرح کھلکھلا کر ہنسی تھی یا پھر شاید وہ اتنے قریب سے پہلی بار اسے ہنستے دیکھ رہا تھا۔ ایک بیک کے اندر ڈبے رکھتے ہوئے امامہ نے اپنے چہرے پر اس کی نظریں محسوس کیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ واقعی اسے دیکھ رہا تھا۔

”اب کیا ہے؟“  
”میں ایک بات سوچ رہا تھا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔  
”کیا؟“

”کہ تم صرف روتے ہوئے ہی نہیں ہنستے ہوئے بھی اچھی لگتی ہو۔“

اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت آئی پھر جبک اور پھر خوشی۔ سالار نے ہر تاثر کو پہچانا تھا یوں جیسے کسی نے اسے غلیظ کارڈ دکھائے ہوں۔ پھر اس نے اسے نظریں چراتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔  
”ہیکے اس کے کان کی لوئیں سرخ ہوئیں پھر اس کے گال ہلکے اور شاید اس کی گردن بھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی عورت یا مرد کو اتنے واضح طور پر رنگ بدلتے نہیں دیکھا تھا جس طرح اسے۔ نو سال پہلے بھی دو تین بار اس نے اسے غصے میں اسی طرح سرخ ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے لیے عجیب سی لیکن یہ منظر دلچسپ تھا۔ اور اب وہ اسے محبوب ہوتے ہوئے بھی اسی انداز میں سرخ ہوتے دیکھ رہا تھا یہ منظر اس سے زیادہ دلچسپ تھا۔ یہ کسی بھی مرد کو پاگل کر سکتی ہے۔“ اس کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے اعتراف کیا اس نے اپنی زندگی میں آنے والی کسی عورت کو اتنے ”بے ضرر“ جتنے راتنا شرماتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور اس کو شکایت تھی کہ وہ اس کی تعریف نہیں کرتا۔ سالار کا دل چاہا وہ اسے کچھ اور چھیڑے۔ وہ بظاہر بے حد سنجیدگی سے اسے نظر انداز کیے ہوئے چیزیں بیک میں ڈال رہی تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ اس کی نظروں سے یقیناً کنبھور ہو رہی تھی۔

کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں گھر میں لانے کے بعد آپ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ انہیں کہاں رکھیں، کیونکہ آپ انہیں جہاں بھی رکھتے ہیں اس چیز کے سامنے وہ جگہ بے حد بے مایہ سی لگتی ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں گھر میں لانے کے بعد انہیں جہاں بھی رکھیں وہی جگہ سب سے انمول اور قیمتی ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا امامہ اس کے لیے ان چیزوں میں سے کون سی چیز تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھا وہ کچھ بے اختیار ہو کر اس کی طرف جھکا اور اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اس کے دائیں گال کو چھوا وہ کچھ حیا سے سہمی۔ اس نے اسی نرمی کے ساتھ اس کا دایاں کندھا چوما اور پھر امامہ نے اسے ایک گہرا سانس لے کر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی سالار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ ان پیچیدہ کواب اپنی ہیڈ سائڈ ٹیبل کی بورڈ میں رکھ رہا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو شاید امامہ کی نظریں اسے حیران کر دیتیں۔ اس نے پہلی بار اس کے کندھے کو چوما تھا اور اس لمس میں محبت نہیں تھی۔ ”احترام“ تھا۔ اور کیوں تھا یہ وہ سمجھ نہیں سکی۔

\*\*\*

وہ اگلے دن تقریباً ”دس بجے سعیدہ اماں کے گھر آئے۔ امامہ کا مسکراتا ”مطمئن“ چہرہ دیکھ کر فوری رد عمل یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف سالار کے سلام کا جواب دیا بلکہ اس کے سر پر ہار دیتے ہوئے اس کا ہاتھ بھی چوما۔

”یہ سب لے کر جانا ہے۔“ وہ اسے اپنے کمرے میں لائی تھی وہاں کتابوں کی دو الماریاں تھیں اور ان میں تقریباً ”تین چار سو کتابیں تھیں۔“

”یہ بکس؟“ سالار نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔  
”نہیں یہ ایرل کیونس اور پینٹنگ کا سارا سامان بھی۔“ امامہ نے کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ پڑے پینٹنگ کے سامان اور کچھ اور ری پینٹنگز کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ سب کچھ زیادہ نہیں ہے بکس ہی تقریباً“ وہ کارٹن میں آئیں گی۔“  
سالار نے ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے انداز لگایا۔

”نہیں یہ اتنی ہی بکس نہیں ہیں اور بھی ہیں۔“ امامہ نے کہا۔  
اس نے اپنا دایاں ہاتھ کر بیڈ پر رکھ دیا اور پھر گھٹنوں کے بل کارٹ پر بیٹھتے ہوئے بیڈ کے نیچے سے ایک کارٹن کھینچنا شروع کیا۔



”نصیر! میں نکالتا ہوں۔“ سالار نے اسے روکا اور خود جھک کر اس کا رٹن کو کھینچنے لگا۔

”بیڈ کے نیچے جتنے بھی بے ہیں، وہ سارے نکال لو۔ ان سب میں بیس ہیں۔“ امامہ نے اسے ہدایت دی۔ سالار نے جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں مختلف سائز کے کم از کم سات آٹھ ڈبے موجود تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک ڈبا نکالتا گیا۔

”بس...؟“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے امامہ سے پوچھا۔

وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ کمرے میں موجود کپڑوں کی الماری کے اوپر ایک اسٹول پر چڑھی کچھ ڈبے اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سالار نے ایک بار پھر اسے ہٹا کر خود وہ ڈبے نیچے اتارے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کتابوں کی آخری کھوپڑی ہے کیونکہ کمرے میں اسے ڈبا رکھنے کی کوئی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ وہ اب الماری کو کھولے اس کے اندر موجود ایک خانے سے کتابیں نکال کر بیڈ پر رکھ رہی تھی۔ وہ کم از کم سو کتابیں تھیں جو اس نے الماری سے نکالی تھیں۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ الماری کے بعد بیڈ سائیڈ ٹیبل کی درازوں کی باری تھی، ان میں بھی کتابیں تھیں۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل کے بعد ڈسٹنگ نیبل کی درازوں اور خانوں کی باری تھی۔ کمرے میں موجود کپڑے کی جس باسکٹ کو وہ لاندری باسکٹ سمجھتا تھا، وہ بھی کتابیں اسٹور کرنے کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا، اسے کمرے کی مختلف جگہوں سے کتابیں برآمد کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بیڈ پر موجود کتابوں کا ڈھیر اب شایف پر لگی کتابوں سے بھی زیادہ ہو چکا تھا لیکن وہ اب بھی بڑی شدت کے ساتھ کمرے کی مختلف جگہوں پر رٹھی ہوئی کتابیں نکال رہی تھی۔ اس نے ان کھڑکیوں کے پردے ہٹائے جو صحن میں کھلتی تھیں۔ اس کے بعد سالار نے اسے باری باری ساری کھڑکیاں کھول کر ان میں سے بھی کچھ کتابیں نکالتے ہوئے دیکھا جو پلاسٹک کے شاپرز میں بند تھیں۔ شاید یہ احتیاط کتابوں کو مٹی اور نمی سے بچانے کے لیے کی گئی تھی۔

”بس اتنی ہی کتابیں ہیں۔“ اس نے بالآخر سالار کو مطلع کیا۔ سالار نے کمرے میں چاروں طرف بھرے ڈبوں اور ڈبل بیڈ پر بڑی کتابوں کے ڈھیر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑے تحمل سے پوچھا۔

”کوئی اور سامان بھی ہے...؟“

”ہاں! میرے کچھ اور کینوس اور پینٹنگز بھی ہیں میں لے کر آتی ہوں۔“

وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

سالار نے ڈبل بیڈ پر بڑی کتابوں کے ڈھیر سے ایک کتاب اٹھائی، وہ ایک ناول تھا۔ گھنیا رومانس لکھنے والے ایک بہت ہی مشہور امریکن رائٹر کا ناول۔ اس نے ٹائٹل پر نظر ڈالی اور بے اختیار اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آئی۔ اگر وہ اس ناول کا نام امامہ کے سامنے لیتا تو وہ سرخ ہو جاتی۔ اس نے ناول کھولا۔ کتاب کے اندر پہلے ہی خالی صفحے پر امامہ نے اپنا نام لکھا تھا۔ جس تاریخ کو وہ کتاب خریدی گئی، وہ تاریخ جس جگہ سے خریدی گئی، وہ جگہ۔ جس تاریخ کو کتاب پڑھنا شروع کیا اور جس تاریخ کو کتاب ختم کی، وہ تاریخ۔ اس طرح کے ناول کو وہ فضول سمجھتا تھا۔ وہ شاید یہ کبھی پسند نہ کرے کہ اس رائٹر کے کسی ناول کو کوئی اس کے ہاتھ میں دیکھے مگر اس نے اس ناول پر اتنی سنجیدگی سے اپنا نام اور ڈش لکھی ہوئی تھیں جیسے وہ بے حد اہم کتاب ہو۔ اس نے ناول کے چند اور صفحے لکھے اور پھر کچھ بے یقینی کے عالم میں پلٹتا ہی چلا گیا۔ ناول کے اندر جگہ جگہ رنگین مارکرز کے ساتھ مختلف لائنز والی لائٹ کی گئی تھیں۔ بعض لائنز کے سامنے اشارے اور بعض کے سامنے ڈبل اشارے لگائے گئے تھے۔ وہ بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

ان لائنز میں بے ہودہ رومانس، بے حد پے ٹوٹک، سوٹی باتیں، ذہنی ڈانٹ لگتے تھے۔ ان پر اشارے ہوتے تھے اور وہ نشان زدہ تھے۔

سالار نے وہ ناول رکھتے ہوئے دو سرے ناول اٹھایا۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ پانچواں۔ چھٹا۔ ساتواں۔ وہ سب کے سب رومانٹک تھے۔ ایک ہی طرح کے رومانٹک ناولز اور وہ سب بھی اسی طرح ہائی لائینڈ تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار رومانٹک اور وہ بھی ملز اینڈ یونز اور بار بار کارٹ لینڈ کی ٹائپ کے رومانس کے اتنے ”سنجیدہ قاری“ سے مل رہا تھا اور کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھتے ہوئے اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ ”کتابیں“ نہیں بڑھتی تھیں بلکہ صرف یہی ناولز بڑھتی تھیں۔ کمرے میں موجود ان ڈھیر دو ہزار کتابوں میں اسے صرف چند پینٹنگز، ٹمگری اور شاعری کی کتابیں نظر آئی تھیں، باقی سب انکشاف ناولز تھے۔

”اور یہ لے کر جاتی ہیں۔“ ایک ناول دیکھتے ہوئے وہ امامہ کی آواز پر بے اختیار چونکا۔

وہ کمرے میں دو تین چکر لگے دوران کچھ مکمل اور کچھ ادھوری پینٹنگز کا ایک چھوٹا سا ڈھیر بھی بنا چکی تھی۔ سالار اس دوران ان کتابوں کے جائزے میں مصروف رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ناول واپس کتابوں کے اس ڈھیر پر رکھ دیا جو بیڈ پر پڑا تھا۔ کارپٹ پر بڑی ان پینٹنگز پر نظر ڈالتے ہوئے سالار کو احساس ہوا کہ سعیدہ اماں کے گھر میں جا بجا لگی ہوئی پینٹنگز بھی اسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں اور یقیناً ”ان پینٹنگز کے کسی دیوار پر لگانا نہ ہونے کا سبب مزید خالی جگہ کا دستیاب نہ ہونا تھا۔

”بیٹا! یہ سارا کاٹھ کباڑ کیوں اٹھا کر لیا، یہ لے کر جاؤ گی ساتھ؟“

سعیدہ اماں کمرے میں آتے ہی کمرے کی حالت دیکھ کر جو نکلیں۔

”اماں! یہ ضروری چیزیں ہیں میری۔“

امامہ سالار کے سامنے اس سامان کو کاٹھ کباڑ قرار دے جانے پر کچھ جڑ ہوئی۔

”کیا ضروری ہے ان میں؟ یہ کتابیں تو روٹی میں دے دیتیں۔ اتنا ڈھیر لگا لیا ہے اور تصویریں وہیں رہنے دیتیں؟ جہاں بڑی تھیں۔ چھوٹا سا گھر ہے تم لوگوں کا وہاں کہاں پورا آئے گا یہ سب کچھ۔“ سعیدہ اماں کتابوں کے اس ڈھیر کو دیکھ کر متحش ہو رہی تھیں۔ یقیناً ”انہوں نے بھی امامہ کی ساری کتابوں کو پہلی بار اکٹھا سمجھا تھا اور یہ ان کے لیے کوئی خوشگوار نظارہ نہیں تھا۔

”نہیں! آجائے گا پورا یہ سب کچھ۔“ تین بیڈ رومز میں ”ان میں سے ایک کو استعمال کریں گے یہ سامان رکھنے کے لیے، لیکن دو مری چیزوں کو بیس رکھنا پڑے گا۔ کبل، کونٹنس، رگزار اور کشنوز وغیرہ کو۔“ وہ ایک سیکنڈ میں تیار ہو گئی تھی۔

”لیکن بیٹا! یہ سارا سامان تو کام کا ہے۔ گھر سبانا اس سے... یہ کتابوں کے ڈھیر اور تصویریں کا کیا کرو گی تم؟“ سعیدہ اماں اب بھی معترض تھیں۔

”کوئی بات نہیں! ان کی کتابیں ضروری ہیں۔ ابھی کچھ اور کارٹن یا شاپرز ہیں جنہیں پیک کرنا ہے۔“ سالار نے اپنے سویٹر کی آستینوں کو موڑتے ہوئے آخری جملہ امامہ سے کہا۔

تین بچے کے قریب وہ سارا سامان سالار کے گھر پر گیسٹ روم میں بکھرا ہوا تھا۔ فرقان نے اس دن بھی انہیں اذیت دے کے لیے اپنی طرف مدعو کیا ہوا تھا لیکن سالار نے معذرت کر لی۔ فی الحال اس سامان کو ٹھکانے لگانا زیادہ اہم تھا۔

ایک اسٹور میں سالار نے کچھ عرصے پہلے ایلو مینیم اور شیشے کے ریکس والی کچھ الماریاں دیکھی تھیں۔ یہ اتفاق ال تھا کہ وہاں لگایا ہوا چکر بے کار نہیں گیا۔ چھ فٹ اونچی اور تین فٹ چوڑی ایک ہی طرح کی تین الماریوں نے



گیسٹ روم کی ایک پوری دیوار کو کور کر کے ایک دم اسے اسٹڈی روم کی شکل دے دی تھی لیکن امامہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ان تین الماریوں میں اس کی تقریباً ساری کتابیں سما گئی تھیں۔ ان کتابوں کو اتنے سالوں میں پہلی بار کوئی ڈھنگ کی جگہ نصیب ہوئی تھی۔ اس کے ایرل اور ریکس لائڈز کی دیوار پر بنی ریکس پر سمیٹے گئے تھے۔

وہ چیز کے سامان میں برتنوں اور بیڈ شیٹس کے علاوہ اور کچھ نہیں لائی تھی تب اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی قسمت میں اس سامان میں سے صرف ان ہی چیزوں کا استعمال لکھا تھا۔

سالار کا بچن امیر یا اب پہلی بار ایک آباد جگہ کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ برتنوں کے لیے بنے ریکس کے شیٹوں سے نظر آتی تھی کراکری اور کاؤنٹر کی سلیب پر بچن کے استعمال کی چھوٹی موٹی نئی چیزوں نے بچن کی شکل کو بالکل بدل کر رکھ دیا تھا۔

وہ لوگ رات کے دس بجے جب فارغ ہوئے تو اپارٹمنٹ میں آنے والا نیا سامان سمیٹا جا چکا تھا۔ ان کے لیے فزقان کے گھر سے کھانا آیا تھا لیکن اس رات امامہ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ نئی کراکری میں سرو کیا تھا۔

”اچھا لگ رہا ہے نا ایسے؟“ امامہ نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس سے پوچھا۔  
سالار نے اپنے سامنے موجود نئی برائڈ ڈرنپلیٹ اور اس کے اطراف میں لگی چمکتی ہوئی کٹلری کو دیکھا اور پھر کلانا اٹھا کر اسے بغور دیکھتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم کسی ریسٹورنٹ کی اوپننگ والے دن سب سے پہلے اور اکلوتے کسٹمر ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے امامہ! کہ یہ کراکری اور کٹلری اتنی نئی ہے کہ اس میں کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ میں پرانے برتنوں میں نہیں کھا سکتا۔“

امامہ کا سوڈا بری طرح آف ہوا۔ کم از کم یہ وہ جملہ نہیں تھا جو وہ اس موقع پر اس سے سنتا چاہتی تھی۔  
”لیکن یہ بہت خوب صورت ہیں۔“ سالار نے فوراً اپنی غلطی کی تصحیح کی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فی الحال وفاق کو سرائے کے موڈ میں نہیں تھی۔ امامہ کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔  
اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے سالار نے کہا۔ ”کھانے کے بعد ہمیں کافی پینے چلیں گے۔“ اس بار اس کے چہرے پر کچھ نرمی آئی۔

”بچن کا سامان لینا ہے۔“ اس نے فوراً کہا۔  
وہ چاول کا بیج منہ میں ڈالتے ڈالتے رک گیا۔ ”ابھی بھی کوئی سامان لینا باقی ہے؟“ وہ حیران ہوا۔  
”گرو سری چاہیے۔“

”کیسی گرو سری؟“ بچن میں سب کچھ تو ہے۔  
”آٹا، چاول، دالیں، مسالے کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔“ امامہ نے جواباً پوچھا۔  
”ان کو میں نے کیا کرنا ہے؟ میں نے کبھی کھانا نہیں پکایا۔“ سالار نے گندھے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔  
”لیکن میں تو پکاؤں گی نا۔ ہمیشہ تو وہ سروں کے گھر سے نہیں کھا سکتے ہم۔“ امامہ نے سنجیدگی سے کہا۔  
”جارڈ اور کنٹینرز بھی چاہیں۔“ امامہ کو یاد آیا۔

”فی الحال آج میرا اس صبح کی خریداری کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“ سالار کراہا۔

”اچھا ٹھیک ہے، کل خرید لیں گے۔“ امامہ نے کہا۔  
اس رات وہ کافی کے لیے قریبی مارکیٹ تک ہی گئے تھے۔ گاڑی فورٹریس کے گرد گھماتے ہوئے انہوں نے

وہیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے کافی لی۔

”شکر ہے کتابوں کو تو جگہ مل گئی۔“

سالار کافی پیتے ہوئے چونکا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیر شاہس کو دیکھتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔ اس کے لاشعور میں اب بھی کہیں وہ کتابیں ہی انگی ہوئی تھیں۔

”وہ کتابیں نہیں ہیں۔“ سالار نے سنجیدگی سے کہا۔

کافی کا گھونٹ بھرتے اس نے چونک کر سالار کو دیکھا۔

پچانوے فیصد ناؤز ہیں۔ وہ بھی چپ رومز میں۔ پانچ دس میں کچھ سکنا ہوں۔ چلو اتنے سالوں میں سو سو سو بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ڈیڑھ دو ہزار اس طرح کے ناؤز؟ تمہارا کتنا اسٹیمنا ہے اس طرح کی برش پڑھنے کے لیے اور تم نے باقاعدہ مارک کر کے پڑھا ہے ان ناؤز کو۔ میرا خیال ہے پاکستان میں چپ رومز کی سب سے بڑی کلمکشن اس وقت میرے گھر پر ہے۔“

وہ خاموش رہی۔ کافی پیتے کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

سالار کچھ دیر اس کی طرف سے کسی رد عمل کا انتظار کرتا رہا، پھر اس کی لمبی خاموشی پر اسے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ برا نہ مان گئی ہو۔ اپنا بایاں بازو اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے جیسے خاموش معذرت پیش کی۔  
”ٹھیک ہے، چپ رومز ہے، لیکن اچھا لگتا ہے مجھے یہ سب کچھ۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ دیر بعد بولی۔

”وہاں لوگ ہمیشہ مل جاتے ہیں۔ کوئی کسی سے چھڑتا نہیں ہے۔ میرے لیے ونڈر لینڈ ہے یہ۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جیسے کہیں اور پچی ہوئی تھی۔

وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا اور اسے مستند رہا۔

”جب اپنی زندگی میں کچھ بھی اچھا نہ ہو رہا ہو تو کسی ایسی دنیا میں جانا اچھا لگتا ہے جہاں سب کچھ ریفیکٹ ہو۔ وہاں وہ کچھ ہو رہا ہو جو آپ چاہتے ہیں۔ وہ مل رہا ہو جو آپ سوچتے ہوں۔ جھوٹ ہے یہ سب کچھ لیکن کوئی بات نہیں، اس سے میری زندگی کی گڑواہٹ تھوڑی کم ہوتی تھی۔ جب میں جاب نہیں کرتی تھی تب زیادہ بڑھتی تھی ناؤز۔ کبھی کبھار سارا دن اور ساری رات۔ جب میں یہ ناؤز پڑھتی تھی تو مجھے کوئی بھی یاد نہیں آتا تھا۔ امی ابو، بہن بھائی، بھتیجیاں، بھانجے بھانجیاں۔ کوئی نہیں۔ درندہ بہت مشکل تھا سارا دن یا رات کو سونے سے پہلے اپنی فیملی کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا، اپنی زندگی کے علاوہ کسی اور کے بارے میں پریشان ہونا، میں خوف ناک خواب دیکھتی تھی اور پھر میں نے ان ناؤز کے ذریعے خوابوں کی ایک دنیا بسائی۔ میں ناؤل کھولتی تھی اور یک دم زندگی بدل جاتی تھی۔ میری فیملی ہوتی تھی اس میں۔ میں ہوتی تھی۔ جلال ہوتا تھا۔“

سالار کافی کا گھونٹ نہیں لے سکا۔ اس کے لبوں پر اس وقت اس ”مخلص“ کا نام سن کر کتنی اذیت ہوئی تھی اسے۔ نہیں، اذیت بہت ہی چھوٹا سا لفظ ہے ایسی تکلیف انسان کو شاید مرتے وقت ہوتی ہوگی۔ یاں اگر یہ ناؤز اس کی ”کال دنیا“ اور اس کا ونڈر لینڈ تھے تو اس میں جلال انصر ہی ہوتا ہوگا سالار سکندر نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مذہباً اور قانوناً ایک رشتے میں بندھی تھی، دل کے رشتے میں کہاں بندھی تھی۔ دل کے رشتے میں تو شاید ابھی تک۔ اور وہ تو ماضی تھا جہاں جلال انصر کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ رنجیدگی سے سوچ رہا تھا اور امامہ کو بولتے ہوئے شاید احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے جلال کا نام لیا اور کس پیرائے میں لیا تھا؟ احساس ہوتا تو وہ ضرور اکتی یا کم از کم ایک بار سالار کا چہرہ ضرور دیکھ لیتی۔ وہ ابھی بھی کھڑکی سے



باہر دیکھ رہی تھی۔ ابھی بھی کہیں ”اور“ تھی۔ ابھی بھی ”کسی“ کا صبر آزما رہی تھی۔

”اچھا لگتا تھا مجھے اس دنیا میں رہنا۔ وہاں امید تھی۔ روشنی تھی۔ انتظار تھا لیکن لا حاصل نہیں، تکلیف تھی مگر اب دی نہیں“ آنسو تھے مگر کوئی پونچھ دیتا تھا اور واحد کتابیں تھیں جن میں امام باہم ہوتی تھی ”آمنہ نہیں۔ ہر بار ان کتابوں پر اپنا نام لکھتے ہوئے میں جیسے خود کو یاد دلاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ دوبارہ کتاب کھولنے پر جیسے کتاب مجھے بتاتی تھی کہ میں کون ہوں۔ وہ مجھے میرے پرانے نام سے بلاتی تھی۔ اس نام سے جس سے اتنے سالوں میں مجھے کوئی اور نہیں بلاتا تھا۔ تاریکی میں بعض دفعہ اتنی روشنی بھی بہت ہوتی ہے جس سے انسان بے شک اپنے آپ کو نہ دیکھ پائے لیکن اپنا وجود محسوس کرنے کے تو قابل ہو جائے۔“

اس کی آواز اب بھٹکنے لگی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے کپوں میں کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور وہ اسے اب پینا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ اب ڈیش بورڈ پر بڑے نشوونما سے نشوونما نکال کر اپنی آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ سالار نے کچھ کے بغیر اس کے ہاتھ سے کافی کا کپ لے لیا۔ ایک ڈسپینسر میں دونوں کپ پھینکنے کے بعد وہ دوبارہ گاڑی میں آکر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے امام سے پوچھا۔

”اور کافی چاہیے نہیں؟“

”نہیں۔“ واپسی کا راستہ غیر معمولی خاموشی میں طے ہوا تھا۔



”مجھے آفس کا کچھ کام ہے تم سو جاؤ۔“ وہ کپڑے تبدیل کر کے سونے کے بجائے کمرے سے نکل گیا۔

”میں انتظار کروں گی۔“ امام نے اس سے کہا۔

”نہیں“ مجھے ذرا دیر ہو جائے گی۔“ اس نے امام کے ہاتھ میں پکڑے ناول کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا جو وہ رات کو پڑھنے کے لیے لے کر آئی تھی۔

اسے واقعی آفس کے کچھ کام نمٹانے تھے مگر اسٹڈی ٹیبل پر بیٹھتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ آخری کام جو وہ آج کرنا چاہتا تھا وہ یہ تھا۔ کچھ دیر وہ لیپ ٹاپ آن کیے اپنی ٹیبل پر بیٹھا رہا پھر یک دم اٹھ کر گیٹ روم میں آ گیا۔ لائٹ آن کرتے ہی کتابوں سے بھری ہوئی سامنے دیوار کے ساتھ لگی الماریاں اس کی نظروں کے سامنے آئیں۔ اس نے ان کتابوں کو وہاں کچھ گھنٹے پہلے ہی رکھا تھا بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ۔ مصنف کے نام کے اعتبار سے ان کی مختلف ریکس پر گروپنگ کی تھی۔ تب تک وہ اس کے لیے صرف ”امام کی کتابیں“ تھیں لیکن اب وہ ان تمام کتابوں کو اٹھا کر بحیرہ عرب میں ڈبو دینا چاہتا تھا یا کم از کم راوی میں تو پھینک ہی سکتا تھا۔ وہ اب کتابیں نہیں ردی تھی۔

امام کی وہ تصوراتی پرفیکٹ زندگی جو وہ جلال انصر کے ساتھ گزارتی رہی تھی۔ وہ ڈیڑھ دو ہزار روپے ان کرداروں کے روپے نہیں تھے جو ان ٹائمر میں تھے۔ وہ صرف دو کرداروں کا روپے تھا۔ امام اور جلال کا۔ اعلا ظرف بننے کے لیے کھلے دل یا برداشت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ دماغ کا کام نہ کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ وہ ریکس پر لگی ان کتابوں کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ امام کے اس اعتراف کے بعد کوئی شوہر بھی برداشت نہ کر پاتا وہ بھی اس کا شوہر تھا۔ وہ ان کتابوں کو گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور وہ ایسا کر سکتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ ردی دھوتی، ناراض ہوئی لیکن اتنی با اختیار نہیں تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر ان کتابوں کو وہاں رکھ سکتی۔ وہ عورت تھی۔ ضد کر سکتی تھی، منوا نہیں سکتی تھی۔ وہ مروت تھا اسے اپنی مرضی کے لیے ضد جیسے کسی حربے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کا گھر تھا یہ اس کی دنیا تھی۔ وہ شرائط کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ایسے جی سکتا ہے۔ وہ

مراعات کے ساتھ دنیا میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ دنیا میں رہتا ہے۔

تو آسمان حل یہ تھا جو اسے معاشرہ اور اس کا ذہن بتا رہا تھا۔ مشکل حل وہ تھا جو اس کا دل اس سے کہہ رہا تھا اور دل کہہ رہا تھا۔ ”چھوڑو جانے دو یا را یہ زہر کا گھونٹ ہے لیکن پی جاؤ۔“ اور دل نہ بھی کہتا تھا۔ ”اس چیز کو اپنے گھر سے نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا جو امام کی ملکیت تھی۔ جو کبھی اس کے دکھوں کے لیے مرہم بنی تھی۔ ان کتابوں کے کرداروں میں وہ جس کسی کو بھی سوچتی رہی تھی لیکن ان کتابوں پر لکھا ہوا نام اس کا اپنا تھا اور یہ وہ نام تھا جو اس کی روح کا حصہ تھا۔ صبر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور کوئی بھی قسم آسان نہیں ہوتی وہاں کھرے اس نے سوچا اور لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

وہ رمضان میں کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسٹڈی روم میں واپس آکر اس نے سگریٹ سلگایا تھا۔ اس وقت خود کو نارمل کرنے کے لیے یہی واحد حل اس کی سمجھ میں آیا۔ ایک سگریٹ پینے کی نیت سے بیٹھے ہوئے اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنے سگریٹ پی چکا ہے۔

”سالار!“ امام کی آواز پر وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے چونکا۔ غیر محسوس انداز میں ہاتھ میں پکڑا سگریٹ اس نے الٹش ٹرے میں سلا۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی اور یقیناً ”اس کے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ چکی تھی۔ نہ بھی دیکھتی تھی تب بھی کمرے میں پھیلی سگریٹ کی بو اسے بتا دیتی۔

”تم اسوکنگ کرتے ہو؟“ وہ جیسے کچھ پریشان اور شاکڈ انداز میں آگے بڑھی۔

”نہیں“ ہنس کبھی کبھار۔ جب آپ سیٹ ہوتا ہوں تو ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں۔“

”کتنے ہوئے سالار کی نظر الٹش ٹرے پر پڑی۔ وہ سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی۔

”آج کچھ زیادہ ہی پی گیا۔“

وہ بڑبڑایا پھر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم سوئیں نہیں ابھی تک؟“

”تم میری بوجھ سے آپ سیٹ ہو؟“ اس نے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

تو اس نے محسوس کر لیا؟ سالار نے اس کا چہرہ دیکھا اور سوچا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف اور اضطراب تھا۔ وہ نائچی میں ملبوس، اولی شال اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ سالار جواب دینے کے بجائے راکنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے اسے دیکھا رہا۔ اس نے گری کو ہلانا بند کر دیا تھا۔ اس کی خاموشی نے جیسے اس کے اضطراب میں اور اضافہ کیا۔

”تمہاری فیملی نے کچھ کہا ہے؟۔ یا میری فیملی نے کچھ کیا ہے؟“

وہ کیا سوچ رہی تھی؟ سالار نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ کاش ”یہ“ وجہ ہوتی ”وہ“ نہ ہوتی جو تھی۔

”کیا کے کی میری فیملی۔؟ یا کیا کرے گی تمہاری فیملی۔؟“ اس نے مدھم آواز میں اس سے پوچھا۔ وہ اسی طرح اٹھی ہوئی یوں چپ کھڑی رہی جیسے اسے خود بھی اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا لیکن وہ خاموش اسے دیکھتی رہی یوں جیسے اسے یقین ہو کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ وہ حیران تھا کہ وہ کیسے کیسے خدشات ذہن میں لیے بیٹھی ہے۔

وہ راکنگ چیئر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے اس وقت امام پر جیسے ترس آتا تھا۔

”یہاں آؤ!“ اس نے سیدھے ہوتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ جھنجکی، خشکی پھر اس کی آغوش میں آئی۔

سالار نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اس کی شال کے اندر کرتے ہوئے اس کی شال کو اس کے گرد اور اچھی طرح سے لپیٹے ہوئے کسی ننھے بچے کی طرح اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے تھپکا اور اس کا سر جوہا۔





"کوئی کچھ نہیں کہہ رہا۔ اور کوئی کچھ نہیں کر رہا۔ ہر کوئی اپنی زندگی میں مصروف ہے اور اگر کچھ ہو گا تو میں دیکھ لوں گا سب کچھ۔ تم اب ان چیزوں کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑو۔"

وہ اسے گود میں لیے کنبہ دیوارہ را کنگ چیسر پر جھول رہا تھا۔

"پھر تم اپ سیٹ کیوں ہو؟"

"میں۔۔۔ میرے اپنے بست سے مسکے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

امامہ نے گردن اوپر کرتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔ اتنے دنوں میں وہ پہلی بار اسے اتنا سنجیدہ لگا تھا۔

"سالار! تم۔۔۔"

"میں پریشان نہیں ہوں اور اگر ہوں بھی تو تم اس کی وجہ نہیں ہو۔ اب دوبارہ مجھ سے یہ سوال مت کرنا۔"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے کچھ سخت لہجے میں جھڑکنے والے انداز میں اس کی بات کاٹ کر سوال سے پہلے جواب دیا۔ وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچھ بول نہیں سکی۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا اور سالار کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے کہ کچن کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔؟" اس نے اس بار بے حد نرمی کے ساتھ موضوع بدلا۔

امامہ نے ایک بار پھر اسے ان چیزوں کے نام بتائے۔

"نکل چلیں گے رات کو گروسری کے لیے۔"

امامہ نے اس بار کچھ نہیں کہا۔ اس کے سینے پر سر رکھے وہ دیوار پر اس سوفا بورڈ پر لکھے بست سے نوٹس ڈیڈ لائنز اور کچھ عجیب سے انڈیکسز والے چارٹس دیکھتی رہی پھر اس نے سالار سے پوچھا۔

"تم بینک میں کیا کرتے ہو؟"

وہ ایک لمحہ کے لیے چونکا پھر اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بورڈ پر نظر ڈالی۔

"میں بے کار کام کرنا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔

"مجھے بینکرز کبھی اچھے نہیں لگے۔" امامہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ اس نے کتنے غلط وقت پر یہ تبصرہ کیا ہے۔

"جانتا ہوں تمہیں ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں۔" سالار کے لہجے میں خنکی آئی تھی۔

"ہاں مجھے ڈاکٹرز اچھے لگتے ہیں۔" امامہ نے سادہ لہجے میں بورڈ کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی محسوس کیے بغیر اس کے سینے پر سر رکھے اس کی تائید کی۔ یہ کہتے ہوئے اسے جلال کا خیال نہیں آیا تھا لیکن سالار کو آیا تھا۔

"تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم بینک میں کیا کرتے ہو؟" امامہ نے دوبارہ پوچھا۔

"میں پبلک ریلیشننگ میں ہوں۔" اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا وہ خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ امامہ نے بے اختیار اطمینان بھرا سانس لیا۔

"یہ پھر بھی بہتر ہے۔ اچھا ہے تم ڈائریکٹ میننگنگ میں نہیں ہو۔ تم نے کیا پڑھا تھا سالار؟"

"اس کیونیکیشنز۔" وہ ایک کے بعد ایک جھوٹ بول رہا تھا۔

"مجھے یہ سب جیکٹ بست پسند ہے۔ تمہیں کچھ اور بتانا چاہیے تھا۔"

"یعنی ڈاکٹر؟" سالار سگائیں امامہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"اس کیونیکیشنز پڑھ کر تو ڈاکٹر نہیں بن سکتے۔" سالار نے جواب نہیں دیا۔ اگر وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو اتنی بے تکلفی کے ساتھ یہ سارے بھرے نہ کر رہی ہوتی۔

"میں ڈاکٹروں سے نفرت کرتا ہوں۔" سالار نے سرو لہجے میں کہا وہ بے اختیار سالار سے الگ ہوئی۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے سالار کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ بے تاثر تھا کم از کم امامہ اسے پڑھ نہیں سکی۔

"ایسے ہی۔" سالار نے کندھے اچکاتے ہوئے بڑی سرو مہری سے کہا۔

"ایسے ہی کیسے۔؟ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔" وہ جزیر ہوئی۔

"تمہیں کیوں نا پسند ہیں بینکرز؟" سالار نے ترکی بہ ترکی جواب کہا۔

"بددیانت ہوتے ہیں۔" امامہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"بینکرز؟" سالار نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں۔" اس بار وہ سنجیدہ تھی۔

وہ سالار کا ہاندا اپنے گرو سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سالار نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب قریب جا کر بورڈ کو دیکھ رہی تھی۔ اس پر لگائے ہوئے نوٹس اور ڈیڈ لائنز پڑھ رہی تھی۔

"بینکرز لوگوں کا پیسہ اثاثہ محفوظ رکھتے ہیں۔"

اس نے اپنے عقب میں سالار کو بڑے خٹانے والے انداز میں کہتے سنا۔

"اور پیسہ لوگوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"اس کے باوجود لوگ ہمارے پاس آتے ہیں۔" سالار نے اسی انداز میں کہا۔ اس بار امامہ ہلٹی۔

"لیکن وہ آپ پر بھروسہ نہیں کرتے۔"

وہ مسکرا رہی تھی مگر سالار نہیں۔ اس نے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"ایک بددیانت بینکر صرف آپ کا پیسہ لے سکتا ہے لیکن ایک بددیانت ڈاکٹر آپ کی جان لے سکتا ہے تو پھر زیادہ خطرناک کون ہوا؟"

اس بار امامہ بول نہیں سکی۔ اس نے چند منٹ تک جواب دھونڈنے کی کوشش کی لیکن اسے جواب نہیں ملا۔

پھر اس نے یکدم سالار سے کہا۔

"اگر میں ڈاکٹر ہوتی تو پھر بھی تمہیں ڈاکٹرز سے نفرت ہوتی۔؟"

وہ اب اسے جذباتی دباؤ میں لے رہی تھی۔ یہ غلط تھا لیکن اب وہ اور کیا کرتی؟

"میں ممکنات پر کوئی نتیجہ نہیں نکالتا۔" زمینی حقائق پر نکالتا ہوں۔ جب "اگر" ایگزسٹ نہیں کرتا تو میں اس پر رائے بھی نہیں دے سکتا۔" اس نے کندھے اچکا کر صاف جواب دیا۔

امامہ کا رنگ کچھ پھیکا ہو گیا۔ جواب غیر متوقع تھا کم از کم سالار کی زبان سے۔

"زمینی حقائق یہ ہیں کہ تم میری بیوی ہو اور تم ڈاکٹر نہیں ہو۔ میں بینکر ہوں اور میں ڈاکٹرز سے نفرت کرتا ہوں۔"

اس کے لہجے کی ٹھنڈک پہلی بار امامہ تک پہنچی تھی لہجے کی ٹھنڈک یا پھر آنکھوں کی سرو مہری۔ وہ بول نہیں سکی اور نہ ہی مل سکی۔ ایک ہفتے میں اس نے اس طرح تو کبھی اس سے بات نہیں کی تھی۔

"رات بہت ہو گئی ہے سونا چاہیے ہمیں۔"

وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اسے دیکھے بغیر کرسی سے اٹھ کر چلا گیا۔

وہ دیوار کے ساتھ لگی جھولتی ہوئی کرسی کو دیکھتی رہی وہ اس کے بدلتے موڈ کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ وہ کوئی ایسی بات تو نہیں کر رہے تھے جس پر وہ اس طرح کے الفاظ کا استعمال کرتا۔ وہ وہاں کھڑی اپنی اور اس کے درمیان



ہونے والی گفتگو کو شروع سے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے بینکرز کے بارے میں میرے کمشنس اچھے نہیں لگے۔ وہ جیسے تجزیہ کر رہی تھی۔

جب وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو کمرے کی لائٹ آن تھی لیکن وہ سوچا تھا۔ وہ اپنے بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ سارا دن کام کرتی رہی تھی لیکن بری طرح تھک جانے کے باوجود اس وقت اس کی نیند یک دم غائب ہو گئی تھی۔ سالار کے بارے میں سارے اندیشے جو اس کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ہفتے نے سلاسیے تھے ایک دم پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ وہ اس کی طرف کروٹ لیے ہوئے سو رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ اس سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا، کم از کم نیند کی حالت میں پرسکون لگ رہا تھا۔

”آخر مرد اتنی جلدی کیوں بدل جاتے ہیں؟ اور اتنے ناقابل اعتبار کیوں ہوتے ہیں؟“ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس نے سوچا اس کی رنجیدگی میں اضافہ ضرور ہوا تھا۔ زندگی اتنی محفوظ نہیں ہوتی جتنی وہ کچھ گھنٹے پہلے تک سمجھ رہی تھی۔

”آج لائٹ آن کر کے سوچ کی کیا؟“ سالار کروٹ لیتے ہوئے بڑبڑایا۔

وہ یقیناً ”گہری نیند میں نہیں تھا۔ امامہ نے ہاتھ بڑھا کر لائٹس آف کر دیں لیکن وہ سونے کے لیے نہیں لیٹتی۔“ اندھیرے میں سالار نے دوبارہ اس کی طرف کروٹ لی۔

”تم سو کیوں نہیں رہیں؟“

”ابھی سو جاؤں گی۔“

سالار نے ہاتھ بڑھا کر اپنا بیڈ سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کر دیا۔ امامہ نے کچھ کمرے بغیر کبل خود پر کھینچا اور سیدھے لیٹتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سالار چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھا پھر اس نے لیمپ دوبارہ آف کر دیا۔ امامہ نے دوبارہ آنکھیں کھول لیں۔

”تمہیں سحری کے وقت بھی اٹھنا ہے امامہ!“

اسے حیرت ہوئی اس نے اندھیرے میں اسے آنکھیں کھولتے ہوئے کیسے دیکھ لیا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے سالار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی اسے کچھ نظر نہ آیا۔

”تمہیں پتا ہے سالار! دنیا کا سب سے بے ہودہ کام کون سا ہے؟“ اس نے سالار کی طرف کروٹ لے کر کہا۔

”کیا...؟“

”شادی۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

چند لمحوں خاموشی کے بعد اس نے سالار کو کہتے سنا۔

”I agree“

امامہ کو بے اختیار دکھ ہوا۔ کم از کم سالار کو اس بات سے اتفاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے سالار کا بازو اپنے گرد جاملے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اب اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”گڈ نائٹ۔“ یہ اسے سلائے کی ایک اور کوشش تھی۔

وہ چند لمحوں خاموش رہی پھر اس نے کچھ بے چین ہو کر کہا۔

”سالار!“

سالار نے بے اختیار گہرا سانس لیا اور آنکھیں کھول دیں۔

”تمہیں کیا ہوا ہے۔؟“

”کچھ نہیں۔“ جھوٹ ”ضروری“ تھا، لیکن سچ بے حد ”معذرت“ تھا۔

”تم میرے ساتھ اتنے روز ہوئے۔“ اس نے بالا خرشا کایت کی۔

”انس کے کسی پر ابلم کی وجہ سے میں کچھ آپ سیٹ تھا شاید اسی لیے روڑ ہو گیا۔“ اس نے معذرت کی تو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔

”کیسا پر ابلم؟“

”ہوتے رہتے ہیں امامہ۔۔۔ you just don't worry اگر آئندہ کبھی بھی میرا ایسا موڑ ہو تو تم پریشان مت ہونا نہ ہی مجھ سے زیادہ سوال جواب کرنا۔ میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

امامہ کی سمجھ میں اس کی توجہ نہیں آئی تھی لیکن وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

”میں اس لیے پریشان ہو رہی تھی کیونکہ مجھے لگا کہ شاید تمہیں میری کوئی بات بری لگی ہے۔ میں نے بینکرز کو برا کہا تھا اس لیے۔“

”تمہیں تو سات خون معاف کر سکتا ہوں میں یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔“

اس نے ایک بار پھر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک سمجھتے ہو ڈاکٹرز میں بھی بہت سی برائیاں ہوتی ہیں لیکن مجھے بس اچھے لگتے ہیں وہ۔ بس محبت ہے مجھے ڈاکٹرز سے۔ میں بھی ان کی ساری خامیاں انور کر سکتی ہوں۔“ سالار کی آنکھوں سے نیند یک دم غائب ہو گئی۔ وہ کسی اور حوالے سے وضاحت دے رہی تھی اس نے اسے کسی اور پیرائے میں لیا۔

”تمہیں واقعی ڈاکٹرز سے نفرت ہے؟“ وہ اب بے یقینی کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

”جو چیز تمہیں پسند ہو میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں۔؟ مذاق کر رہا تھا میں۔“ امامہ کے ہونٹوں پر مطمئن مسکراہٹ آئی۔

اس نے بھی سالار کے گرد اپنا بازو جامل کر تے ہوئے کہا۔

”اب مجھے نیند آرہی ہے تم بھی سو جاؤ۔“

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ محبوب کی خصوصیات یونیورسل ہوتی ہیں۔ وہ بے نیاز ہوتا ہے۔ اور اپنی بے نیازی سے بے خبر بھی۔ اور یہ دونوں خصوصیات اس کے محبوب میں بھی تھیں۔ جلال العصر سے اسے ایک بار پھر شدید قسم کا حسد محسوس ہوا۔ لیکن رشک اسے اپنے آپ پر آیا کہ وہ اس کے ”پاس“ تھی۔ اور اس کی تھی۔

\*\*\*

”ساحب نے نیوز پیپرز کا کہا تھا کہ آپ سے پوچھ لوں اور یہ میگزین ہیں ان میں سے جو پسند ہیں چن لیں میں لے آیا کروں گا۔“

نیوز ہار کرنے اسے ایک کاغذ تمھاتے ہوئے کہا جس پر اخبارات اور میگزینز کی ایک لسٹ تھی۔ وہ نیند میں نل نہ ہونے کی آواز پر اٹھ کر آئی تھی۔ کچھ دیر تک تو سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ سالار کے گھر اس نے صرف اخبار کو اخبار دیکھا تھا وہ بھی سالار نے ہا کر سے خود لیا تھا۔ وہ خود آفس میں ہی اخبار دیکھا تھا۔ اب وہ یقیناً ”اس کی“ سے اخبار لگوا رہا تھا۔ ایک نظر اس لسٹ پر ڈال کر اس نے ہا کر کو ایک اخبار اور ایک میگزین کا بتایا۔ وہ اخبار اسے تمھارے چلا گیا۔ وہ جمائیاں لیتے ہوئے اخبار اندر لائی اور رکھ دیا۔ وہ نیچے والے تھے کھڑکی سے باہر دھند پڑ رہی تھی لیکن ابھی بھی کچھ تھی۔



جتنی دیر میں ملازمہ آئی وہ اخبار دیکھ چکی تھی۔ ملازمہ آج اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ مالی بھی تھا۔ وہ فرقان کے پودے دیکھنے آیا تھا۔ وہ سالار کے پودے اتوار کے دن دیکھنے آتا تھا یا پھر نو شین خود اس کے ساتھ وہاں آتی تھی۔ سالار کے اپارٹمنٹ کی ایک چابی ان کے پاس بھی تھی۔ آج نو شین نے یہاں امامہ کی موجودگی کی وجہ سے اسے بھیج دیا تھا۔

وہ اس کے ٹیرس پر جانے کے کچھ دیر کے بعد خود بھی باہر نکل آئی۔ مالی کیپاس کھڑے خاموشی سے اسے دیکھتے رہنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ اسے کسی قسم کی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ماہرانہ انداز میں اپنا کام کر رہا تھا وہ واپس اندر آگئی۔ ملازمہ نے بڑے پر جوش انداز میں کچن میں رکھے ہوئے برتنوں کو نوٹس کرنے کے بعد تعریف کی۔ امامہ نے اختیار خوش ہوئی۔

”باجی! اب یہ گھر گھر لگ رہا ہے۔“ اس نے امامہ سے کہا۔ وہ سالار کی اسٹڈی کو دیکھ کر رہی تھی۔ امامہ مسکراتی ہوئی سالار کی اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ڈسٹ صاف کرنے لگی۔

”باجی! میں کرتی ہوں آپ رہتے ہیں۔“ ملازمہ نے اسے روکا۔

”نہیں تم باقی سب کر لیتا۔ میں ابھی فارغ ہوں اس لیے کر رہی ہوں۔“ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکی کہ وہ نہیں چاہتی کہ سالار کا کوئی کانڈ اوہرا دھر ہو جائے لیکن یہ سوچتے ہوئے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس گھر میں اس اسٹڈی ٹیبل کو اتنے عرصے سے وہ ملازمہ ہی صاف کر رہی ہے۔

میل ٹرے دعوتی کارڈز کے بند اور کھلے لفافوں سے تقریباً بھری ہوئی تھی۔ امامہ نے ایک لفافہ کھول کر دیکھا۔ وہ کسی افطار پارٹی کا انونٹیشن تھا۔ ایک کے بعد ایک وہ سارے لفافے کھول کر دیکھتی گئی۔ سب کارڈ کسی نہ کسی افطار پارٹی یا تقریب سے متعلق تھے اور بعض کارڈز میں تو وہ دو یا تین جگہوں پر بھی انونٹیشن تھا۔ وہ یقیناً بے حد سوشل زندگی گزار رہا تھا۔ یہ اس کا اندازہ تھا یقیناً وہ اس کے گھر آ جانے کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے ان پارٹیز میں نہیں جا رہا تھا۔ یہ اس کا ایک اور تجربہ تھا۔ پندرہ بیس کارڈز دیکھنے کے بعد اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے کارڈز اٹھا کر واپس رکھ دیے۔ کچھ اور کارڈز دیکھتی یا نیچے میل کے کسی لفافے کے ایڈریس پر نظر ڈال لیتی تو شاید اسے سالار کا شعبہ نظر آ جاتا کہ وہ انونٹیشن میں تھا۔ لی آرمش نہیں۔ کم از کم وہ یہ جھوٹ تو ضرور پکڑ سکتی تھی۔

”باجی! رات کو کوئی مہمان آئے تھے؟“ وہ ملازمہ کی آواز پر چونکی۔ وہ ایش ٹرے ہاتھ میں لیے کچھ حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں۔“ امامہ نے سوال سمجھے بغیر کہا۔

”تو یہ سگریٹ کس نے پیے ہیں؟ سالار صاحب تو سگریٹ نہیں پیتے۔“ ملازمہ بے حد حیران تھی۔

امامہ کچھ دیر بول نہیں سکی۔ ملازمہ جیسے سالار کے بیان کی تصدیق کر رہی تھی۔ یعنی وہ واقعی عادی نہیں تھا جو ایک آدھ سگریٹ وہ بھی کبھی کبھار پیتا ہو گا اسے ملازمہ کسی مہمان کا پیا ہوا سگریٹ سمجھ لیتی ہوگی۔

”اوہ! ہاں۔ اس کے کچھ دوست آئے تھے مجھے یاد ہی نہیں تھا۔“ امامہ نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی ڈور ٹیل بجی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ امامہ اس سے کہہ کر باہر نکل آئی۔

”لانڈری کو لیکٹ کرنے آئے ہیں۔“

دروازے پر ایک لڑکا سالار کے کچھ ڈرائی کلینڈ اور دھلے ہوئے کپڑوں کے بینگز لپے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کی طرف ایک بل کے ساتھ بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔

”کپڑے چیک کر لیں۔“

بل کے ساتھ لانڈری کے لیے بھیجے گئے کپڑوں کی لسٹ بھی تھی۔ امامہ نے بینگز لاؤنچ میں لانے کے بعد باری باری لسٹ اور کپڑوں کو ملانا شروع کیا کپڑے پورے تھے۔

ملازمہ تب تک باہر نکل آئی تھی۔ امامہ بل کے پیسے لینے اندر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس نے ملازمہ کو دروازے پر لانڈری ہوائے کو ایک لانڈری بیگ بٹھاتے ہوئے دیکھا۔ جس کے اوپر ایک لسٹ چسپاں تھی۔ یقیناً وہ ان کپڑوں کی لسٹ تھی جو لانڈری کے لیے دیے جا رہے تھے۔ ملازمہ نے ہوائے ایک رائٹنگ پیڈ پر کچھ اندراج کر رہا تھا۔

”باجی! آپ نے بھی دینے ہیں کپڑے؟“ ملازمہ نے اسے آتے دیکھ کر کہا۔

”نہیں میں یہ بل دینے آئی ہوں۔“ امامہ نے بل کی رقم اس لڑکے کی طرف بڑھائی۔ اس نے جواباً ایک رسید اس کی طرف بڑھادی۔

”بل تو مہینے کے شروع میں اکٹھا ہی جاتا ہے۔“ ملازمہ نے اسے روکا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آگئی۔ امامہ نے رسید پر نظر ڈالی۔ وہ سالار کے کپڑوں کی لسٹ تھی جو وہ لے کر گیا تھا۔

”تم نے لانڈری کے کپڑے کہاں سے لیے ہیں؟“ امامہ نے اس لسٹ کو پڑھتے ہوئے ملازمہ کو روکا۔

”سالار صاحب کپڑے بیگ میں ڈال کر اوپر لسٹ رکھ جاتے ہیں۔ لانڈری میں ہی رکھتے ہیں بیگ۔“ ملازمہ یہ کہہ کر دوبارہ اندر چلی گئی۔

امامہ نے بل پر نظر ڈالی۔ لانڈری تو وہ خود بھی کر سکتی تھی۔ ہر ہفتے اتنے پیسے اس پر خرچ کرنا فضول خرچی تھی اس نے سوچا۔

ملازمہ ابھی وہیں تھی جب ایک آوی وہ پروے لے کر آیا تھا جو اس نے بننے کے لیے دیے تھے۔

”باجی! آپ نے کوئی پروے بننے کے لیے دیے ہیں؟“

ملازمہ نے انٹرکام کی بیل بجنے پر ریسپورڈ اٹھا کر ان سے پوچھا۔

امامہ کچھ حیران ہوئی۔ ”ہاں۔ کیوں؟“

”وہ نیچے گیٹ پر ایک آوی لے کر آیا ہے۔“ سالار کا کام پر پوچھ رہا ہے۔ ہاں! بھیج دو باجی نے پروے بنوائے ہیں۔“ ملازمہ نے اس کو جتا کر ریسپورڈ پر گارڈ سے کہا۔ ریسپورڈ رکھ کر وہ دوبارہ لاؤنچ صاف کرنے میں لگ گئی تھی۔

چنگ کاؤنٹرر گلاس سیٹ کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے امامہ کو عجیب طرح کا احساس کمتری ہوا۔ اس نے اتنے دنوں وہاں چلتے پھرتے کئی بار انٹرکام کو دیکھا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس انٹرکام کی وہاں کیا افادیت ہے، جبکہ دینڈا نہ اتنا قریب تھا۔ ملازمہ اس گھر کی ہر چیز کو اس سے زیادہ ذہانت، پھرتی اور سہولت کے ساتھ استعمال کر رہی تھی۔

”سالار! لاؤنچ اب اچھا لگ رہا ہے نا؟“

سالار نے لاؤنچ کی کھڑکیوں پر لگے نئے پردوں پر ایک نظر ڈالی۔ وہ ابھی چند لمحے پہلے گھر آیا تھا۔ امامہ نے بے حد خوشی کے عالم میں آتے ہی اسے اطلاع دی۔ وہ نہ بھی وقتی تب بھی لاؤنچ میں پہلا قدم رکتے ہی وہ اس ”واضح“ تہذیبی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”بہت۔“ اس نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ امامہ نے فخریہ انداز میں پردوں کو دیکھا۔

وہ آج بھی افطاری راستے میں ہی کر آیا تھا۔ امامہ نے افطاری فرقان کے گھر پر کی تھی اور اب وہ دونوں ایک ساتھ دفتر کر رہے تھے۔



”تو جناب کا آج کا دن کیسا گزرا؟“

کھانا شروع کرتے ہوئے سالار نے اس سے پوچھا۔ وہ اسے پورے دن کی ایک ٹیٹو شیز بتانے لگی۔ آج ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔ سالار نے اسے دن میں دو بار ایک یا ڈیڑھ منٹ کے لیے کال کی تھی مگر بات صرف حال احوال تک ہی رہی تھی۔

”یعنی آج بہت کام کر پڑا۔“ سالار نے اس کے دن کی تفصیل سن کر کہا۔

”کیا کام...؟ میں نے کیا کیا...؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ امامہ نے اس کی بات پر کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”جتنا بھی کیا ہے بہت ہے۔“

”میں تمہاری لائڈری خود کر دیا کروں گی اگلے ہفتے سے۔“ امامہ نے سالار کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اور پریس بھی کر دیا کروں گی۔“

”نہیں مہربس کپڑے دھونے کے لیے نہیں لے کر آیا۔“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”مجھے پتا ہے لیکن میں فارغ ہوتی ہوں سارا دن اور پھر مجھے اپنے کپڑے بھی تو دھونے ہیں تو تمہارے بھی دھو سکتی ہوں۔“

”تم اپنے کپڑے بھی کیوں دھوؤ گی۔ لائڈری دین ہر ہفتے آتی ہے۔ تم اپنے بھی دے دیا کرو۔“ سالار نے کھانا کھاتے کھاتے رک کر کہا۔

”میرے ضائع ہوں گے۔“ اس نے بے اختیار کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ سالار نے اسی انداز میں کندھے اچکا کر کہا۔

امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اور میں سارا دن کیا کروں؟“

”وہی جو دوسری عورتیں کرتی ہیں۔ سویا کروٹی دی دیکھو فون پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگاؤ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرے کوئی دوست نہیں ہیں۔“ وہ یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

سالار نے کچھ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”کوئی تو ہو گا۔؟“

”نہیں کوئی بھی نہیں ہے۔“

”کیوں؟“

وہ کھانا کھاتے کھاتے کچھ سوچنے لگی تھی پھر اس نے کہا۔

”کلج اور یونیورسٹی میں تو میں اتنی خوف زدہ رہتی تھی کہ کسی کو دوست بنانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ دوستی ہوتی تو پھر سوال ہوتے۔ میرے بارے میں۔ فیملی کے بارے میں۔ پھر اگر کوئی گھر آتا اور ابو کی فیملی کو کوئی پہلے ہی سے جانتا ہوتا تو۔ یا سعیدہ اماں کو ہی۔ دوستی اس وقت بڑی مشکل چیز تھی میرے لیے۔ میں انور ڈھیس کر سکتی تھی۔ پھر آفس جاب میں کوئیگز کے ساتھ تھوڑی بہت گپ شپ ہوتی تھی لیکن مجھے اکیلے رہنے کی اتنی عاریت ہو گئی تھی کہ میں لوگوں کے ساتھ کبھی بھی کمفوٹیبل نہیں رہتی تھی۔ میں ان کے ساتھ گھوم پھر نہیں سکتی تھی۔ ان کے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ اپنے گھر نہیں بلا سکتی تھی۔ کیسے دوستی ہوتی پھر۔ اسی لیے مجھے کتابیں پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ پینٹ کرنا اچھا لگتا تھا۔“

”لوگوں سے میل جول ہونا چاہیے دوست ہونے چاہئیں۔ پہلے کی بات اور تھی لیکن اب تمہیں تھوڑا

سوشلائز کرنا چاہیے۔ اب تمہارا گھر ہے تم کو لیگز کو انوائٹ کر دیا کم از کم ان سے فون پر ہی بات کر لیا کرو۔“ اسے بڑی سنجیدگی سے سمجھا رہا تھا۔

”تم خود سوچنا ہو اس لیے کہہ رہے ہو۔“ امامہ نے جواب دیا۔

”ہاں میری جاب کی ضرورت ہے سوشل ہونا۔ ماہ رمضان کے بعد کچھ فنکشنز ہیں۔ دُزر بھی ہیں کچھ۔ تمہیں ملواؤں گا کچھ دوستوں سے بھی۔ اچھا لگے گا تمہیں۔“ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے تمہارے ڈیسک پر دیکھے ہیں افطار ڈنرز کے کارڈز۔ تم میری وجہ سے نہیں جا رہے؟“ امامہ نے کہا۔

”نہیں میں افطار پارٹیز یا ڈنرز میں نہیں جاتا۔“ سالار نے سرسری انداز میں کہا۔

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ پارٹیز ماہ رمضان کی اسپرٹ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ میں ماہ رمضان میں کسی کے گھر افطار پر نہیں جاتا۔“

”لیکن تم فرقان کے گھر تو جاتے ہو۔“ امامہ نے بے ساختہ کہا وہ مسکرا دیا۔

وہ اس وقت بھی فرقان کے گھر سے آیا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔

”میں فرقان کے گھر ماہ رمضان سے پہلے بھی کھانا کھاتا رہا ہوں اور اگر وہ مجھے افطار یا ڈنر کے لیے بلاتا ہے تو کھانے میں کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو اس کے گھر میں عام دنوں میں پکتا ہے لیکن عام دنوں میں اس کے گھر میں یہ نہیں پکتا۔“ سالار نے ٹیبل پر پڑی تین چار چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

”پھرب؟“ وہ مزید حیران ہوئی۔

”یہ سارا اہتمام فرقان اور بھابھی تمہارے لیے کر رہے ہیں کیونکہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے تو تمہارے لیے سحری اور افطاری میں بھی اہتمام ہو رہا ہے ورنہ تو ہم سارا کھانا کھاتے ہیں۔ ماہ رمضان میں ہم لوگ اپنے کچن کے لیے گروسری پر عام مہینوں کی نسبت آدھا خرچا کرتے ہیں اور آدھے پیسوں سے ہم کسی اور فیملی کو پورے مہینے کا راشن منگوا دیتے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تمہارا۔“ سالار نے اسے متوجہ کیا وہ خود کھانا ختم کر کے اب بیٹھا کھا رہا تھا۔

یہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر کی روایت تھی۔ ماہ رمضان میں ان کے گھر آٹے والا راشن آدھا ہو جاتا تھا۔ گھر کے دو ملازموں کے ماہ رمضان کا راشن اس باقی راشن کی قیمت سے آتا تھا۔

”امامہ؟“ سالار نے پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔

وہ کھانا کھانے لگی۔ سالار بیٹھا بھی ختم کر چکا تھا اور اب ختم تھا کہ وہ کھانا ختم کر لے۔ وہ خود ساتھ ساتھ ٹیبل پر مسلسل میسجوز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ کس حد تک بدل گیا تھا اور اس کے اندر آنے والی تبدیلی کس حد تک ڈاکٹر صاحب کی مہربان منت تھی اور کس حد تک اس کی اپنی سوچ کی فونڈاز لگانا مشکل تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے ہیٹ اس کے کھانا شروع کرنے کا انتظار کرتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے کچھ نہ کچھ اس کی پلیٹ میں ضرور رکھتا تھا اور اس کے کھانا ختم کرنے کے بعد ہی کھانے کی ٹیبل سے اٹھتا۔ وہ یہ باتیں نوٹس نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ یہ نوٹس کیسے بغیر بھی رہ نہیں سکتی تھی۔ وہ عجیب تھا۔ ”عجیب؟“ اس کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ امامہ کے ذہن میں نہیں آیا۔

ڈنر کے بعد وہ رات کو کچن کا سودا سلف خریدنے کے لیے گئے تھے۔ امامہ نے اگر سالار کی یہ گفتگو نہ سنی ہوتی تو اچھا ”وہ کچن کے لیے ایک لمبی چوڑی لسٹ بنائے بیٹھی تھی لیکن اس نے خریداری کرتے ہوئے بہت احتیاط



سے کام لیا۔ خریدی جانے والی زیادہ تر اشیاء کنٹینرز اور جارز ہی تھیں۔ کھانے پکانے کا سامان اس نے بہت کم خریدا تھا۔

آج انہوں نے ایک اور جگہ سے کافی پی تھی۔  
 ”تمہارا وہ برائلم حل ہو گیا؟“ امامہ کو گاڑی میں اچانک یاد آیا۔  
 ”کون سا برائلم؟“ سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔  
 ”وہ جس کی وجہ سے تم کل رات پریشان تھے“ امامہ نے اسے یاد دلایا۔  
 ”بے اختیار ہڑپٹا۔“ کاش ہو جاتا۔“  
 ”یعنی نہیں ہوا۔“ امامہ متفکر ہوئی۔  
 ”ہو جائے گا۔“ سالار نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”برسوں میں کراچی جا رہا ہوں۔“ سالار نے بات بدل دی۔  
 ”گتے دن کے لیے؟“ وہ چونکی۔  
 ”صبح جاؤں گا اور رات کو آجاؤں گا۔ میں مہینے میں دو تین بار جاتا ہوں کراچی۔ تم چلوگی ساتھ۔“ وہ ہنسا۔  
 امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔  
 ”ایک دن کے لیے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“  
 ”تم آفس کے کام سے جا رہے ہو؟“ امامہ نے کہا۔  
 ”تم انیتا کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلی جانا وہ تمہیں گھمانے پھرانے کی کراچی۔ کبھی گئی ہو پہلے وہاں؟“ سالار پوچھ رہا تھا۔  
 ”نہیں۔“ وہ کچھ ایکسائٹڈ ہونے لگی تھی۔ سمندر اسے پسند تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے سمندر دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔  
 ”انیتا سے ٹائی اپ کرتا ہوں پروگرام۔ میں آفس میں تم میری بہن کے ساتھ بازاروں میں۔ ہم تو اسی طرح کا ہی مون مناسکتے ہیں فی الحال۔“ وہ اسے پھر چھیڑ رہا تھا۔  
 وہ ہنس پڑی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکی کہ جس زندگی کو وہ گزار کر آئی تھی اس کے مقابلے میں یہ آزادی اسے جنت جیسی محسوس ہو رہی ہے۔

\*\*\*

”یہ کیا ہے؟“  
 وہ خریدا ہوا سودا سلف، جارز اور کنٹینرز میں ڈالنے میں مصروف تھی جب سالار اپنے اسٹڈی روم سے ایک لفافہ لے کر بچن اریا میں آیا۔  
 ”اس میں تمہاری چیک بک ہے۔“ سالار نے اسے بتایا اور لفافہ کاؤنٹر پر رکھ کر چلا گیا۔  
 امامہ نے لفافہ کھول کر اندر موجود چیک بک نکالی۔ اس کے ساتھ ایک بے سلف بھی نکل آئی۔ وہ تمیں لاکھ کی تھی۔ امامہ کو لگا کہ اسے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے سلف کو دوبارہ دیکھا۔ وہ واقعی تمیں لاکھ ہی کی تھی۔ اس نے اس کے اکاؤنٹ میں تمیں لاکھ کیوں جمع کروائے؟ یقیناً اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔  
 وہ لفافہ پکڑے اسٹڈی روم میں آگئی۔ سالار اپنے کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔

”سالار! تمہیں پتا ہے تم نے کتنا بڑا بلینڈر کیا ہے؟“ امامہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔  
 ”کیسا بلینڈر؟“ وہ چونکا۔

امامہ نے اس کے قریب آکر بے سلف اس کے سامنے کی۔  
 ”اسے دیکھو ذرا۔۔۔ یہ کیا ہے؟“  
 ”بے سلف ہے۔“ سالار نے ایک نظریں پر ڈالتے ہوئے دوبارہ ڈیسک ٹاپ پر نظروں ڈالنا شروع کر دی۔  
 ”کتنی رقم جمع کروائی ہے تم نے میرے اکاؤنٹ میں؟“  
 ”تمیں لاکھ۔“ وہ حیران ہوئی۔  
 ”ابھی کچھ رہتی ہے سات لاکھ اور کچھ۔۔۔ چند ماہ میں وہ بھی دے دوں گا۔“  
 وہ کچھ ٹائپ کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔  
 ”لیکن کیوں دو گے مجھے۔۔۔؟ کس لیے؟“ وہ حیران تھی۔  
 ”تمہارا حق مہر ہے۔“ سالار نے اسی انداز میں کہا۔  
 ”میرا حق مہر لاکھ روپے ہے۔“ امامہ کو لگا کہ شاید وہ بھول گیا ہے۔  
 ”وہ آتمہ کا تھا تمہیں تمہیں تریا حق مہر دینا چاہتا ہوں۔“ سالار نے کندھے اچکا کر کہا۔  
 ”لیکن یہ تو بہت ہی زیادہ ہے سالار۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہوئی۔ ”تم سے کس نے کہا ہے مجھے اتنی رقم دے؟“

”تم نے خود مجھے لکھ کر دی تھی یہ رقم۔“  
 سالار نے اس بار مسکراتے ہوئے مائٹرس ہٹا کر اسے دیکھا۔  
 ”میں نے کب۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ”وہ فکرو تم اس لیے لکھوا رہے تھے۔؟“ اسے یاد آیا۔  
 ”ہاں۔“ اس کی لاپرواہی اب بھی برقرار تھی۔  
 ”تمہیں گل ہو۔“ امامہ کو بے اختیار ہنسی آئی۔  
 ”شاید۔“ سالار نے بے ساختہ کہا۔  
 ”اچھا میں ایک ارب لکھ دیتی تو کیا کرتے؟“ وہ اب طنز کر رہی تھی۔  
 ”تو ایک ارب بھی دے دیتا۔“ کیا نیا ضعی تھی۔  
 ”کہاں سے دیتے۔۔۔؟ فرق تو کرتے؟“ وہ بے ساختہ ناراض ہوئی۔  
 ”کیوں کرتا۔۔۔؟ کما کر دیتا۔“ سالار نے اس کی بات کا برا مانا۔  
 ”ساری عمر کما تے ہی رہتے پھر؟“  
 ”اچھا ہوتا ساری عمر تمہارا قرض دار رہتا۔ واقعی اچھا ہوتا تو ایک ارب چاہیے کیا۔؟“  
 وہ جیگھی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ امامہ کو کئی سال پہلے والے سالار کی جھلک نظر آئی۔  
 ”کیوں دے رہے ہو؟“ اس نے سنجیدگی سے کچھ دیر اسے دیکھ کر کہا۔  
 ”بیوی ہو تم اس لیے۔“  
 ”اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“  
 ”امامہ! میری سیونگز ہیں یہ۔“ سالار نے بے حد تحمل سے کہا۔  
 ”سیونگز ہیں تو مجھے کیوں دے رہے ہو؟“ وہ کچھ خفا ہوئی۔  
 ”میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں دوں۔ اگر یہ پوری دنیا میری ہوتی تو میں یہ ساری دنیا تمہیں دے دیتا۔ میں کما رہا



ہوں اور یہی آجائے گا میرے پاس۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیا شاہانہ انداز تھا۔  
 ”لیکن اتنی زیادہ رقم۔“ سالار نے اس کی بات کاٹی۔

”میں اتنی زیادہ رقم نہیں دینا چاہتا تھا لیکن تمہاری مرضی کا حق مہربان چاہتا تھا اس لیے تم سے ایک فیکو لکھنے کو کہا۔ تمہیں پتا ہے جو فیکو تم نے لکھی تھی اس دن میرے اکاؤنٹ میں ایگزیکٹ اتنی ہی لمباؤنٹ تھی۔“ وہ اب رقم دہراتے ہوئے ہنس رہا تھا۔

”اب اس کو تم کیا کوئی اتفاق۔؟ مجھے اتفاق نہیں لگا مجھے لگا وہ رقم میرے پاس تمہاری امانت تھی۔ یا حق تھا۔ اس لیے تمہیں دے رہا ہوں۔ تمیں لاکھ دیا ہے کچھ رقم کا ادھار کر لیا ہے تم سے۔ ورنہ اگلے دو تین ماہ ادھار دھر سے مانگ رہا ہوتا۔ اس لیے تم آرام سے رکھو یہ پیسے مجھے اگر کبھی ضرورت ہوئی تو تم سے مانگ لوں گا۔ اب میں ٹھوڑا سا کام کر لوں؟“

امامہ نے کچھ نہیں کہا تھا وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ ڈائنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر وہ ایک بار پھر اس بے سلب کو دیکھنے لگی۔ وہ اس شخص کو کبھی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ کبھی نہیں۔ وہ لایا بلی نہیں تھا۔ کم از کم اتنے دن میں اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ سمجھ دار بھی نہیں تھا۔ کم از کم وہ بے سلب اسے یہی بتا رہی تھی۔ وہ اگر اسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ تو وہ نہیں ہوئی تھی۔ احسان مند نہ دیکھنا چاہتا تھا تو ہاں اس کے کندھے جھکنے لگے تھے۔ ایسی چاہ اس نے زندگی میں کسی اور شخص سے چاہی تھی۔ ایسی نوازشات کی طلب اسے کہیں اور سے تھی۔ اس کے وجود کو گیلی لکڑی وہ پیسہ نہیں بنا رہا تھا بلکہ وہ فیاضی بنا رہی تھی جو وہ دکھا رہا تھا۔ وہ اس سے برابری چاہ رہی تھی۔ برابر نہیں ہو پارہی تھی۔ اس شخص کا قد لمبا نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس کا اپنا ہی وجود سکڑنے لگا تھا۔

\*\*\*

”امامہ! ہم کل صبح کے بجائے آج شام کو جا رہے ہیں۔ رات کراچی میں رکیں گے اور پھر کل رات کو ہی واپس آجائیں گے۔ سات بجے کی فلائٹ ہے۔ میں شام ساڑھے پانچ بجے تمہیں پک کر دوں گا تم پیکنگ کر لو۔“ اس نے بارہ بجے کے قریب فون کر کے آفس سے کراچی کا نیا پروگرام بتایا تھا۔ وہ یکدم نموس ہونے لگی۔ اتنی جلدی پیکنگ نہیں ہے وہ ایک رات کے لیے جا رہے تھے۔ پھر بھی۔ وہ اب اسے اپنے ان کپڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا جو وہ ساتھ لے کر جانا چاہتا تھا۔ وہ پیکنگ کرتے ہوئے بے حد بولا لاتی ہوئی تھی۔

وہ ساڑھے پانچ بجے وہاں موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے گاڑی میں روزہ افطار کر لیا ہو گا لیکن پھر بھی وہ ایک باکس میں اس کے لیے کھانے کی چند چیزیں اور جوس لے کر آئی تھی۔ ایئر پورٹ تک کی ڈرائیو میں وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ساتھ وہ چیزیں بھی کھاتے رہے۔

وہ ساڑھے چھ بجے ایئر پورٹ پر پہنچے۔ بورڈنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ فرسٹ کلاس سے سڑ کر رہے تھے۔ اسی لیے ٹرانک کی وجہ سے کچھ لیٹ ہونے کے باوجود سالار مطمئن تھا۔

ایگزیکٹو لاؤنج سے جہاز میں سوار ہونے ہوئے سالار کی فرسٹ کلاس کے کچھ اور پنجرے سے سلام دعا ہوئی۔ چند ایک سے اس نے امامہ کا بھی تعارف کروایا۔ وہ سب کارپوریٹ سیکٹر سے تعلق رکھتے تھے یا پھر سالار کے کسٹمرز تھے۔

جہاز کے ٹیک آف کے چند منٹوں کے بعد کسی دوسری کمپنی کا کوئی ایگزیکٹو سالار سے کوئی معاملہ دسکس کرنے کے لیے اس کے پاس آیا۔ چند لمحوں سے باتیں کرنے کے بعد سالار اس سے معذرت کر کے اس

میں خواتین ڈائجسٹ 72 جنوری 2015

ایگزیکٹو کے ساتھ اس کی سیٹ پر چلا گیا۔ وہ کچھ دیر اس کے انتظار میں بیٹھی رہی پھر کچھ بور ہو کر اس نے ایک میگزین اٹھا لیا۔  
 سالار کی ڈائریکٹ لینڈنگ کے اعلان کے پانچ منٹ بعد ہوئی۔ وہ ”سوری“ کہتا ہوا اس کے پاس بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگا۔

”تم بور تو نہیں ہوئیں؟“

”نہیں۔ مجھے تو بہت مزہ آ رہا تھا۔“ اس نے نیچے جھٹکی سے جواب دیا۔

اس نے میگزین سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ سالار نے بڑے آرام سے اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر پاس سے گزرتی ایئر ہوسٹس کو تھما دیا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے چلی گئی۔

”یہ بد تمیزی ہے۔“ اس نے اس کے جانے کے بعد کچھ دلی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔

”ہاں۔۔۔ ہے تو سہی لیکن تم مجھے دیکھ نہیں رہی تھیں۔“ اس نے اطمینان اور ڈھٹائی کے ساتھ کہہ کر امامہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے خفا ہو یا نہیں۔

”جتنی باتیں تم ان لوگوں سے کر رہے تھے تم نے مجھ سے کبھی نہیں کیں۔“

وہ اس کے شکوے پر ہنسنا۔ ”بینک کے کسٹمرز ہیں۔ یہ ان باتوں کے پیسے دیتے ہیں۔“

اس نے کچھ ملامت بھری نظروں سے سالار کو دیکھا۔ ”تم کتنے materialistic (ماہ پرست) ہو۔“

”ہاں تو ہوں۔“ اس نے آرام سے جواب دیا۔

”میں بھی بڑے سکتی ہوں تمہیں پیسے۔“ وہ اس کے جملے پر چونکا۔

”ارے میں تو بھول ہی گیا تھا ائی اچال تو تم مجھ سے زیادہ امیر ہو۔ میرے بینک کی کسٹمر بھی ہو اور میں تمہارا قرض دار بھی ہوں تو تم سے باتیں کرنا تو فرض ہے میرا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”بینکرز۔۔۔“ وہ کچھ کہنے لگی تھی۔ سالار نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے اسے رد کا اور کہا۔

”میں اپنا ٹرپ خراب نہیں کرنا چاہتا امامہ۔! تم سے واپسی پر سنوں گا کہ بینکرز کیسے ہوتے ہیں۔“ اس نے یکدم کچھ سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

امامہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس میں سنجیدہ ہونے والی کیا بات تھی اس نے سوچا۔ ایرپورٹ پر ہوٹل کی گاڑی نے انہیں پک کیا تھا۔

”میں نے سوچا تھا کہ ہم انیتا کے گھر پر ٹھہریں گے۔“ امامہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں کبھی انیتا کے گھر نہیں ٹھہرا میں ہوٹل میں رہتا ہوں۔“ سالار نے اسے بتایا۔ ”کراچی اکثر آتا جاتا ہوں نہیں۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اس سے کہہ رہا تھا۔ ”بعض دفعہ تو یہاں آکر انیتا سے بات تک نہیں ہو

والی۔“

امامہ نے اس کا چہرہ دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ وہ مسلسل سیل پر کچھ میسجز کرنے میں مصروف تھا۔ وہ ساتھ ساتھ اسے سڑک کے دونوں اطراف آنے والے علاقوں کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔

”گھر مجھے تمہارے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے۔“

سالار نے اس کے اچانک اس طرح کہنے پر اسے ٹوکا۔

”تو اس ساتھ لے کر آنا مجھے اچھا لگ رہا ہے اور تمہیں انیتا کی فیملی سے ملوانے کے لیے یہاں لے کر آنا ہی تھا۔“ امامہ نے اس کا چہرہ غور سے پرہنے کی کوشش کی۔

خواتین ڈائجسٹ 73 جنوری 2015

copied From Web





”سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے امامہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں میرے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟“ سالار نے یک دم اس سے پوچھا وہ مسکرا دی۔

”آپ اپنی ہوائی جہاز کے ساتھ پہلی بار یہاں ٹھہر رہے ہیں۔“

ہوٹل میں چیک ان کرتے ہوئے رہسپشن پر موجود لڑکے نے مسکراتے ہوئے سالار سے کہا۔

اس فائیو اسٹار ہوٹل کے چند کمرے مستقل طور پر سالار کے بینک کے بک کے ہوئے تھے اور ان کمروں میں باقاعدگی سے ٹھہرنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا لیکن آج وہ پہلی بار اس کی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔

سالار نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور سائن کرنے لگا۔ وہ لڑکا اب امامہ سے کچھ خوشگوار جملوں کا تبادلہ کر رہا تھا۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ اس کے گرد موجود ساری سلاخیں گرا رہا ہو۔ وہ باہر کی اس دنیا سے مسور ہو رہی تھی جس سے وہ سالار کی وجہ سے متعارف ہوئی تھی۔

بیچ لگژری پر انیٹا اور اس کی فیملی نے ان کے لیے ڈرائیج کر رکھا تھا۔ وہ لوگ آدھے گھنٹے میں تیار ہونے کے بعد تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہاں پہنچے۔ انیٹا اور اس کے شوہر کے علاوہ اس کے سسرال کے بھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ یہ سالار اور اس کے بیوی کے لیے ایک فیملی ڈرائیج تھا۔ اس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا گیا۔ اس کی گھبراہٹ ابتدائی چند منٹوں کے بعد ختم ہونا شروع ہو گئی۔ وہ کافی لیل فیملی تھی اور ان دونوں کی شادی کے حوالے سے ہونے والی رسمی گفتگو کے بعد گفتگو کے موضوعات بدل گئے تھے۔ امامہ چیف گیسٹ تھی لیکن وہاں کسی نے اسے ٹیبل سکوپ کے نیچے نہیں رکھا تھا اور اس چیز نے امامہ کے اعتماد میں اضافہ کیا۔ کھانا ابھی سرو نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈر نکس لیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ امامہ گفتگو میں ایک مسکراتے ہوئے خاموش سامع کا رول ادا کر رہی تھی۔ اس کی زیادہ توجہ بیچ لگژری ویو کے گرد نظر آنے والے سمندر اور شہر کی روشنیوں پر تھی۔ وہ لوگ انہیں ایر میں تھے۔ کراچی میں لاہور جیسی سردی نہیں تھی لیکن یہاں اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ سالار نے آتے سے پہلے اسے گرم شال لینے کا نہ کہا ہوتا تو یقیناً اس وقت اس کے دانت بیچ رہے ہوتے۔ وہاں موجود تمام خواتین سویٹرز کے بجائے اسی طرح کی شالیں اپنے کندھوں پر ڈالے ہوئے تھیں۔

”سالار! میں وہاں آگے جا کر نیچے سمندر دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے سالار کی طرف جھکتے ہوئے دم آواز میں سرگوشی کی۔

”تو جاؤ۔“ سالار نے اطمینان سے کہا۔

”میں کیسے جاؤں۔؟ اس طرح اکیلے۔ تم ساتھ آؤ میرے۔“ اس نے اس کے مشورے پر جبر ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تم خود جاؤ۔ دیکھو۔ اور بھی لوگ کھڑے ہیں، تم بھی جا کر دیکھ آؤ۔“ سالار نے اس سے کہا۔ وہ اب اس کی گود میں بڑا بیک اٹھا کر نیچے زمین پر رکھتے ہوئے بلند آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔

امامہ نے کچھ جھجکتے ہوئے اس لمبی فیملی کے گرد موجود افراد پر نظر ڈالی وہ سب گفتگو میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کچھ مستی پاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے کیا میں یہی انیٹا اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”وہاں سے جا کر دیکھو وہاں سے زیادہ اچھا ویو ہے۔“ انیٹا نے اشارے سے اسے گائیڈ کیا۔ امامہ نے سر ہلایا۔ وہاں اس وقت ان کے علاوہ اور بھی کچھ فیملیز موجود تھیں اور سالار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی وقتاً فوقتاً اٹھ کر اسی طرح اس عرشہ نما جگہ کے کنارے کھڑے ہو کر سمندر کو دیکھنے لگتا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے نروس تھی لیکن پھر وہ نارمل ہونا شروع ہو گئی۔

سالار وہیں بیٹھا کوئلہ ڈرنک پیتے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ امامہ نے دوبارہ پلٹ کر کچھ نروس ہو کر اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں بار مسکرا دیا۔ یہ نو سال پہلے کی وہ برائیتوں کی نہیں تھی جو آدھی رات کو اپنے گھر کی دیوار کو دھکے دینے کے کمرے میں آگئی تھی۔ اس سے شادی کی تھی پھر گھر سے چلی گئی تھی۔

وہ سیم کی اس۔ سیم کے بارے میں وہ سیم سے بہت کچھ سن چکا تھا لیکن پچھلے دس دنوں سے وہ جس لڑکی کو دیکھ رہا تھا یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ سیم نے جتنی توڑ پھوڑ اس کی زندگی میں پیدا کی تھی اس سے زیادہ توڑ پھوڑ اس نے عرشے کی طرف جاتی ہوئی اس لڑکی کی زندگی میں پیدا کی تھی۔ اس کی اندازاً طور ہی تبدیل ہو گئے تھے۔ نو سال اگر کسی شخص کو اس کے گھر والوں سے الگ کر دیا جائے خوف اور دباؤ کے ساتھ چند جگہوں تک محدود کر کے پانی دنیا سے کاٹ دیا جائے تو وہ کس حد تک کنفیوزڈ، ڈنل، مائینڈڈ، غیر محفوظ اور۔۔۔ ڈیپنڈنٹ ہو سکتا ہے۔ وہ اس کا مکمل مظاہرہ امامہ کی اس حالت میں دیکھ رہا تھا اور یہ چیز اسے تکلیف پہنچا رہی تھی۔ وہ کم از کم اسے اس حالت میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

”سالار۔ سالار۔“ وہ انیٹا کی آواز پر بے اختیار چوٹا۔

اس نے پوری قوت سے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔

”یا تو اسے وہاں بھیجتے نہ اب بھیج ہی دیا ہے تو دو چار منٹوں کے لیے کسی اور چیز کو بھی دیکھ لو۔“ وہ اب اسے ڈانٹ رہی تھی۔ وہ مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔ اس کا ہنسنی عقراں اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

ہو امامہ کے بالوں کو بکھیر رہی تھی۔ وہ انہیں بار بار کالوں کے پیچھے کر کے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن انہیں کھلا چھوڑ کر آنے پر مجبورت بھی رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں وہ شیفلون کے دوپٹے کو سر پر ٹکانے کی کوشش چھوڑ چکی تھی ہاں وہ پشیمین شال اس کی مہین شیفلون کی قمیص کو اڑنے سے توروک نہیں پار رہی تھی لیکن اس کے جسم کو اچھی طرح ڈھانپے رکھتے میں موثر تھی۔ وہ کئی سالوں میں آج پہلی بار کسی پبلک پلیس پر سر ڈھانے بغیر کھڑی تھی۔ اسے بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ اگر وہ سالار کے ساتھ نہ ہوتی تو بھی ایسی حالت میں کسی کھلی جگہ پر کھڑے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دس دن پہلے تک تو وہ گھر سے باہر نکلتے ہوئے اپنا چہرہ بھی چھپائی تھی۔ وہ واحد گیٹ اپ تھا جس میں وہ خود کو بے حد محفوظ سمجھتی تھی۔ سالار سے شادی کے بعد اس نے چہرہ چھپانا چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔

تاریک سمندر میں نظر آنی روشنیوں کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر گردن کے گرد لپٹے دوپٹے کو سر پر لینے کی کوشش شروع کی۔ یہاں اس کوشش کو نوٹس کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ کام اس ہوا میں شال دوپٹے اور کھلے بالوں کے ساتھ آسان نہیں تھا۔

”میں بال سمیٹ دوں تمہارے؟“ وہ جیسے کرنٹ کھا کر ہلٹی پھر جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔“ اس نے سالار کو اپنے عقب میں دیکھ کر بے اختیار کہا۔ وہ کس وقت آیا تھا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”تم میرا دینا پکڑو گے؟“ اس نے سالار کی اوٹ میں آتے ہوئے اپنا دپٹا اسے پکڑا دیا۔ وہ اب وہاں کھڑی دوسروں کو نظر نہیں آ رہی تھی۔

”نہیں، مجھ کو تانا چاہیے تھا کہ یہاں اتنی تیز ہوا ہوگی، میں بال تو کھلے چھوڑ کر نہ آتی۔“ وہ اپنے بالوں کو دھیلے جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے اس سے شکایت انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ اب اپنی شال اتار کر اسے دے رہی تھی۔

”یہ کون سا گھر ہے؟“ وہ دوپٹے کو اپنے سر اور گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے اس کے سوال پر ٹھٹکی۔



”کرمزین۔ کیوں؟“

سالار نے شمالی اس کے کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا تم اس کلمہ میں بہت اچھی لگتی ہو۔“ اس نے اس کے بائیں گال کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے بہت آہستہ سے چھوا تھا۔  
امامہ کی آنکھوں میں حیرت اند آئی۔ اگلے لمحے سالار گویہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اس کا لباس زیادہ قمری تھا یا اس کا چہرہ۔ وہ بے اختیار کمر سانس لے کر رہ گیا۔

”اب تم اتنی سی بات پر بھی بلش ہو کر دیکھو تو معاملہ جان لو ہو جائے گا۔ بار دہائی تم بڑی جلدی مجھے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

وہ تقریباً ”ڈھکائی“ بچے واپس اپنے ہونٹوں میں آئے تھے۔ امامہ کو اتنی نیند آ رہی تھی کہ اس نے جیولری اتار دی۔ چہرہ بھی دھو لیا لیکن کپڑے تبدیل کیے بغیر سوئی تھی۔

\*\*\*

سالار صبح کب آفس کے لیے نکلا امامہ کو پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تقریباً ”دس بجے“ انھی۔ جب تک وہ اپنا سامان پیک کر کے تیار ہوئی تب تک انیتا اسے لینے کے لیے آچکی تھی۔

وہ لوگ تقریباً ”ساڑھے گیارہ بجے“ ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے نکلے اس کے بعد وہ انیتا کے ساتھ کراچی کے مختلف بازار میں گھومتی پھرتی رہی۔ انیتا نے اسے سالار کے دیے ہوئے کریڈٹ کارڈ کو استعمال کرنے ہی نہیں دیا۔ اس دن وہی اس کو شاپنگ کروائی رہی۔

شاپنگ کے بعد انیتا اسے اپنے گھر لے گئی اس نے وہاں انتظار کیا۔ ساڑھے سات بجے وہ گھر سے ایر پورٹ کے لیے نکلی اور اسی وقت سالار سے اس کی فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی ایر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ سالار کی نسبت جلدی ایر پورٹ پہنچی۔ بورڈنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ایگزیکٹو لاونج میں بیٹھتے ہی ایک بار پھر وہ کسی نہ کسی سے بیلوٹائے کرنے لگا۔ یہ وہ فلائٹ تھی جس سے وہ غلام طور پر کراچی سے واپس آیا کرتا تھا اور اس کی طرح باقی لوگ بھی ریگولر ریو لرتھے لیکن وہ اس وقت اتنی خوش تھی کہ اس نے سالار کی توجہ کسی اور طرف ہونے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔

وہ خوش تھی یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا اور سالار کو اس کی یہ خوشی حیران کر رہی تھی۔  
”یہ تمہارا کریڈٹ کارڈ اور پیسے۔“

اس نے لاونج میں بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی اپنے بیک سے دونوں چیزیں نکال کر سالار کو تھما دیں۔  
”انیتا نے مجھے بل پے کرنے نہیں دیے۔ اسی نے سارے بلز دیے ہیں۔ تم اسے پے کر دیتا۔“ امامہ نے اسے بتایا۔

”کیوں؟ کوئی بات نہیں اگر اس نے پے کیے ہیں۔ اسے ہی کرنے چاہیے تھے۔“

سالار نے کریڈٹ کارڈ اپنے والٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پیسے اس نے واپس امامہ کے بیک میں ڈال دیے تھے۔

”لیکن ہم نے تو اسے یا اس کی فیملی کو کچھ بھی۔“

سالار نے اس کی بات کالی۔ ”تم نیک مٹ ٹائم آؤگی تو لے آنا کچھ اس کے لیے۔ دو چار ہفتے تک وہ ویسے بھی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو رہی ہے۔ تو تمہیں اچھا لگا کراچی آکر۔“ سالار نے موضوع بدلا۔  
امامہ کا چہرہ ایک بار پھر چمکنے لگا۔ وہ اسے ان جگہوں کے بارے میں بتا رہی تھی جہاں وہ انیتا کے ساتھ گئی تھی۔

سالار مسکراتے ہوئے اسے متا رہا۔ وہ بچوں جیسے جوش و خروش کے ساتھ اپنی شاپنگ کی تفصیل بتا رہی تھی۔  
”میں نے ابو“ آئی اور سعیدہ اماں کے لیے بھی کچھ گفٹس لیے ہیں۔“ وہ بتا رہی تھی۔  
”اچھا!“ سالار نے لچکسی لی لیکن گفٹس کی نوعیت نہیں پوچھی۔  
”مخرقان بھائی کی فیملی۔ اور تمہارے پیرنس کے لیے بھی۔“

”امامہ! صرف میرے پیرنس نہیں ہیں وہ تمہارا بھی کوئی رشتہ ہے ان سے۔“ سالار نے اعتراض کیا۔  
وہ اب بھی اس کے ہاں باپ کا ذکر اسی طرح کرتی تھی۔ اس وقت ایک دم امامہ کو احساس ہوا کہ اس نے سالار کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔ یہ بھول بھی یا لاپرواہی، لیکن اسے شاپنگ کے دوران سالار کا خیال تک نہیں آیا۔ اسے بے حد ندامت ہوئی۔

”کیا ہوا؟“ سالار نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔  
وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کچھ شرمندگی سے کہا۔

”سالار! مجھے تمہارے لیے کچھ خریدنا یاد نہیں رہا۔“

”کوئی بات نہیں، تم نے اپنے لیے شاپنگ کی ہے تو سمجھو تم نے میرے لیے ہی خریدا ہے۔“ سالار نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا کندھا تھپک کر جیسے تسلی دی۔

”پھر بھی مجھے تمہارے لیے کچھ لینا چاہیے تھا۔“ امامہ مطمئن نہیں ہوئی۔ ”لیکن مجھے تمہارا خیال ہی نہیں آیا۔“

اس کا محبوب ظالم تھا وہ جانتا تھا۔ ”کوئی بات نہیں، جب خیال نہیں آیا تو کیسا تھفہ۔؟“ تھفہ تو ان کو دیا جاتا ہے جن کا خیال آتا ہو۔“ سالار کے لہجے میں گلہ نہیں تھا لیکن امامہ کو گلہ لگا۔ وہ غلام سی ہو کر خاموش بیٹھ گئی۔

”اور کیا کیا لیا؟“ اس کی ندامت محسوس کرتے ہوئے سالار نے دوبارہ اس سے بات شروع کی۔  
”مجھے انیتا اچھی لگی ہے۔“ امامہ نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

”چلو اچھا ہے، کوئی تو اچھا لگا تمہیں۔ میں نہ سہی، میری بہن ہی سہی۔“

امامہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا سالار کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی وہ سنجیدہ نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔  
”اور بتا ہے میں نے کیا کیا لیا ہے؟“ وہ پھر بولنے لگی۔  
سالار بے اختیار مسکرایا۔ اگر اسے اس سے اپنے لیے کسی اظہار کی توقع تھی تو غلط تھی۔

\*\*\*

اگلے دو دن امامہ بہت اچھے موڈ میں رہی اسے ہر بات پر کراچی یاد آ جاتا۔ اس کی یہ خوشی سالار کو حیران کرتی رہی۔ اس کا خیال تھا اسے وہ شہر پسند آیا ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ بات شہر کی نہیں تھی وہ اگر امامہ کو نواب شاہ بھی لے جاتا تو بھی وہ اسی ٹرانس میں واپس آتی۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو رہی تھی اور ایک لمبے عرصے کے بعد مٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ جینے کے بعد کچھ دیر تک تو انسان ایسے ہی گہرے سانس لیتا ہے جیسے وہ لے رہی تھی۔

اگلے دن وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے۔ وہ سالار کے ساتھ خوش تھی یہ بات اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی البتہ سعیدہ اماں نے پھر بھی کچھ احتیاطی تدابیر کے تحت سالار کو سامنے والوں کے لڑکے کی آمنہ کے لیے دووانہ دار محبت کا ایک اور قصہ سنانا ضروری سمجھا جسے سالار نے بے حد تحمل سے سنا۔ اس بار امامہ نے دوران گفتگو سعیدہ اماں کو لوکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ناکام رہی سعیدہ اماں کا خیال تھا سالار کو ایک اچھا تابع دار شوہر



بنانے کے لیے اس طرح کے لکچرز ضروری ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ ماضی میں کسی عورت کے ساتھ وابستہ رہ چکا ہو، نامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ سعیدہ ماں کو اپنے اور سالار کے لعلق کے بارے میں کیسے بتائے، اسے خدشہ تھا کہ اس انکشاف کے بعد سعیدہ ماں خود اسی سے ہی ناراض بند ہو جائیں۔ اسے فی الحال اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

\*\*\*

”اسلام آباد جانا ضروری ہے؟“

وہ جمعہ کی رات ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی، وہ جانا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ ایک عجیب سے خوف کا شکار بھی تھی۔

”بہت زیادہ ضروری ہے۔“ سالار بیڈ پر بیٹھا اپنے لپ ٹاپ پر ای میل چیک کرنے میں مصروف تھا۔

”تمہیں کیا کام ہے یہاں۔؟“ امام نے ہاتھ میں پکڑا ٹاول بند کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنی کے بل ٹیک لگائے اس کی طرف ٹرٹ لیتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے گاؤں جانا ہے۔“ وہ اسکرین پر نظریں جمائے اپنا کام کرتے ہوئے بولا۔

”کون سے گاؤں۔؟“ وہ چونکی۔

”اسلام آباد سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔“ اس نے نام بتاتے ہوئے کہا۔ ”میں وہاں ایک اسکول اور چند دوسرے پروجیکٹس چلا رہا ہوں۔ اسکول کی بلڈنگ میں کچھ ایکسٹینشن ہو رہی ہے، اسی کو دیکھنے جانا ہے مجھے۔ جانا تو لاسٹ ویک تھا لیکن جان نہیں سکا۔“

وہ ابھی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی طویل خاموشی اور خود پر جی نظروں کو محسوس کرتے ہوئے سالار نے اسے دیکھا۔ امام سے نظریں ملنے پر اس نے کہا۔

”تم ساتھ چلنا اور دیکھ لیتا۔“ وہ دوبارہ اسکرین کو دیکھنے لگا۔

”تم اکیلے چلے جاؤ۔“ امام نے کہا۔

”میں تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ اس نے اصرار کیا۔

”ویسے بھی پیپا نے کہا ہے آٹے کے لیے۔ ہاں اگر تم گاؤں نہیں جانا چاہتے تو مت جاؤ لیکن اسلام آباد تو چلنا ہے تمہیں۔“ سالار نے جیسے قلعی انداز میں کہا۔

امام نے دوبارہ ٹیکے پر سر رکھتے ہوئے کچھ فنگل کے عالم میں ٹاول کھول لیا۔

”کیا اسٹوری ہے اس ٹاول کی؟“

سالار کو اس کے بڑے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ امام نے جواب نہیں دیا۔

”ہیرو ہیروئن کے کپڑوں کی زیادہ تعریف کرتا ہے اس میں یا خوب صورتی کی؟“ وہ اب اسے چھیڑ رہا تھا۔

امام نے اسے نظر انداز کیا۔ یہ اتفاق تھا کہ جو صفحہ وہ پڑھ رہی تھی اس میں ہیرو ہیروئن کی خوب صورتی ہی کی تعریف کر رہا تھا۔ امام کو ہنسی آ گئی تھی۔ ٹاول سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے اس نے دوسری طرف کرٹ لے لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے تاثرات دیکھے۔ سالار نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔

\*\*\*

”خواتین و حضرات توجہ فرمائیے، ہم اسلام آباد انٹرنیشنل ایرپورٹ پر لینڈ کر چکے ہیں۔ اس وقت یہاں شام کے

ساتھ بچ رہے ہیں اور یہاں کا درجہ حرارت ہے۔

جہاز کے کابین عملہ میں سے کوئی انکشاف کے بعد اب اردو میں رسمی الوداعی کلمات دہرا رہا تھا۔ جہاز ٹیکسی کرتے ہوئے زمین پر اترنے کے ساتھ جارہا تھا۔ بزنس کلاس کی ایک سیٹ پر بیٹھے سالار نے اپنا سیل فون آن کرتے ہوئے اپنی سیٹنی بیلٹ کھولی۔ امام کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کم صدم تھی۔

”کہاں کم ہو؟“ اس نے امام کا کندھا تھکا۔

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اپنی سیٹنی بیلٹ کھولنے لگی۔ سالار اب لگج کمپارٹمنٹ سے اپنے ہینڈ نکال رہا تھا۔ ایک فلائٹ اسٹیورڈ نے اس کی مدد کی۔ دونوں کے درمیان چند خوشگوار جملوں کا تبادلہ ہوا۔

وہ اس فلائٹ پر آنے والے ریگولر پیسینجز میں سے ایک تھا اور فلائٹ کا عملہ اسے پہچانتا تھا۔

جہاز کی سیڑھیوں کی طرف جانے سے پہلے سالار نے مڑ کر اس سے کہا۔

”تمہیں کوئی کوشش وغیرہ کرنا چاہیے تھا سوئٹز میں سردی لگے گی تمہیں۔“

”یہ تمہارا ہی نہیں میرا بھی شہر ہے۔ میں پیدا ہوئی ہوں یہاں، میں سال گزارے ہیں میں نے یہاں مجھے پتا ہے، سوئٹز سردی ہوتی ہے، یہ سوئٹز کافی ہے۔“ امام نے بڑے جتانے والے انداز میں اس سے کہا۔ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

جہاز کی سیڑھیوں سے باہر آتے ہی سرد ہوا کے پہلے جھونکے نے ہی اسے احساس دلایا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اپنے دانت بجتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سالار نے کچھ کے بغیر اپنے بازو پر بڑی جیکٹ اس کی طرف بڑھائی۔

اس نے بڑی قربان برواری سے کچھ ٹائم ہو کر جیکٹ پہن لی۔ اسلام آباد بدل گیا تھا۔ اس نے جھل ہو کر سوچا۔ ارا سیول لاؤن کی اینگیز کی طرف بڑھتے ہوئے سالار چند لمحوں کے لیے ٹھٹکا۔

”ایک بات میں تمہیں بتانا بھل گیا امام۔“ اس نے ہنسی محسوسیت سے کہا۔

”کیا بات ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”پیپا کو یہ پتا نہیں ہے کہ ہم آج اسلام آباد آ رہے ہیں۔“ امام کے چہرے کی مسکراہٹ مختاب ہو گئی۔

سالار نے اسے رکے دیکھا تو وہ بھی رک گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سالار نے اپنے کندھے پر اس کے بیک کی بیلٹ ٹھیک کی۔ شاید ٹائمنگ غلط ہو گئی، ٹیکسی میں بتانا زیادہ بہتر تھا اور اب اگر اس نے یہاں سے جانے سے انکار کر دیا تو وہ دل ہی دل میں فکر مند ہوا۔

وہ چلیں جھکے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی اسی طرح جو کھتا رہا۔ یہ دھٹائی تھی لیکن اب وہ اس کے علاوہ کچھ بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے بالآخر امام کی آنکھوں کی بے یقینی کو صفحے میں بدلتے دیکھا، پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔ وہ مسلسل دو ہفتوں سے اسے سکندر عثمان کے اسلام آباد بلائے کا کہہ رہا تھا۔ یہ

سکندر عثمان کا بلاؤ اندہ ہوتا تو صرف سالار کے کہنے پر تو کبھی وہاں نہ جاتی اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ سکندر عثمان کے نہ بلائے کے باوجود وہاں جانے کا کیا مطلب تھا، اس کا اندازہ وہ کر سکتی تھی اور اس وقت وہ

ہری طرح پریشان ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ لاؤن ج سے باہر نکلنے سے ہی انکار کر دے اسے سالار پر شدید غصہ آ رہا تھا۔

”سوئٹز؟“ سالار نے اطمینان سے کہا۔

وہ چند لمحے مزید اسے دیکھتی رہی پھر اس نے ارد گرد دیکھا، پھر سالار نے اسے جیکٹ اتارتے ہوئے دیکھا۔ وہ وہاں کھڑی بے بسی کے عالم میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ سالار کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کر سکتی ہے۔ اس نے جیکٹ اتار کر تقریباً ”پچھلے“ والے انداز میں سالار کو دی۔





”متھینک ہو۔“ سالار نے جیکٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

اس نے شکر ادا کیا کہ جیکٹ اس نے اس کے منہ پر نہیں دے دیا۔ وہ اب بے حد غصے میں ایگزٹ ڈور کی طرف جاری تھی۔ سالار کو حیرت ہوئی اس نے اس سے اپنا بیگ کیوں نہیں لیا تھا۔ اصولی طور پر یہ اس کا دوسرا رد عمل ہونا چاہیے تھا۔

”میرا بیگ دو۔“ ایگزٹ ڈور سے نکلنے سے پہلے ہی امامہ نے پلٹ کر تقریباً ”غراتے ہوئے“ اس سے کہا تھا۔ سالار نے آرام سے بیگ اسے پکڑا دیا۔

ٹیکسی میں بیٹھنے تک دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ پورا راستہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی، سالار نے بھی اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے مخاطب نہ کرنا مناسب تھا۔ وہ اب گھر پر سکندر عثمان اور طیبہ کے رد عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگلی بجلی ان پر گرنے والی تھی۔

گاڑی ان کے گھر کی بائی روڈ کا موڑ مڑ رہی تھی۔ امامہ کو اپنا پورا جسم سرد ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ سردی نہیں تھی یہ خوف بھی نہیں تھا یہ کچھ اور تھا۔ وہ نو سال کے بعد اپنے گھر کو اس سڑک کو اور اس موڑ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے، آنکھیں پھٹنے لگی تھیں۔ سالار سے ساری تاریخی سارا غصہ جیسے دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ خوشی تھی کہ تھا جو وہ گاڑی کو اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھ کر محسوس کر رہی تھی۔ اس کے گھر کا گیٹ سالار کے گھر کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا اور وہ صرف یہ اندازہ کر پائی تھی کہ گیٹ بند تھا، گھر کی بیرونی لائسنس آن تھیں۔

گاڑی کے ہارن پر گارڈ نے یاہر دیکھا پھر اس نے گاڑی روک کر گھر کے گیٹ کھول دیا۔ سالار تب تک اس کے ساتھ گاڑی سے نکل کر ڈیڑھ گھنٹہ تک رہا تھا۔ امامہ نے اس بار اپنا بیگ خود اٹھانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ گارڈ نے سلمان لینے کی کوشش نہیں کی۔ سالار اپنا سامان خود اٹھانے کا عادی تھا لیکن اس نے سالار کے ساتھ آنے والی اس لڑکی کو بڑی حیرت اور دلچسپی سے دیکھا تھا، جو گیٹ سے گھر کے اندر آنے تک ان ہمسایوں کے گھر کو دیوانہ وار دیکھتی آرہی تھی جن کے ساتھ سکندر عثمان کا میل ملاپ بند تھا۔

دھند کے باوجود امامہ نے گھر کی بالائی منزل کے کچھ بیڈروم کی کھڑکیوں سے آتی روشنی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے اپنے بیڈروم میں بھی روشنی تھی۔ اب وہاں کوئی اور رہتا ہو گا۔ وسیم۔ یاسعد۔ یا اس کا کوئی بھتیجا یا بھتیجی۔ اس نے آنکھوں میں امدتے سیلاب کو صاف کرتے ہوئے ان کھڑکیوں میں جیسے کسی سائے، کسی بیولے کو ڈھونڈنے کی سعی کی۔

”اندرو چلیں۔؟“ اس نے اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کی نرم گرفت محسوس کی۔ امامہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے سر ہلایا اور قدم آگے بڑھادیے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ رو رہی ہے لیکن اس نے اسے روکنے سے روکا نہیں تھا۔ اس نے بس اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

سکندر عثمان اس وقت لاؤنج میں فون پر کسی دوست کے ساتھ خوش گیمیاں کرتے ہوئے طیبہ کا انتظار کر رہے تھے جو اپنے بیڈروم میں کوئی چیز لینے کے لیے گئی تھیں۔ اگر سکندر کو آئس سے آنے میں دیر نہ ہو گئی ہوتی تو وہ دونوں اس وقت کسی انتظار ڈنر میں جا چکے ہوتے۔

لاؤنج میں سالار اور امامہ کا سامنا سب سے پہلے انہیں سے ہوا تھا۔ کسی بھوت کو دیکھ کر سکندر عثمان کا وہ حال نہ ہوتا جو اس وقت ان دونوں کو دیکھ کر ان کا ہوا تھا۔ وہ فون پر بات کرنا بھول گئے تھے۔

”جبار! میں بعد میں فون کرتا ہوں تمہیں۔“ انہوں نے گھڑے ہوتے ہوئے اپنے دوست سے کہا اور سیل بند

کر دیا۔ غصہ بے حد معمولی لفظ تھا جو انہوں نے اس وقت سالار کے لیے محسوس کیا۔ وہ لاہور میں اس الملوک کے بیٹھے کونہ صوفیہ اسلام آباد امامہ کے ساتھ نہ آنے کی تاکید کر کے آئے تھے، بلکہ پچھلے کئی دن سے مسلسل فون پر ہیرا ر بات کرنے کے دوران یہ بات دہرانا نہیں بھولے اور وہ ہیرا ر فرماں برداری سے ”اوکے“ کہتا رہا۔ نہ یہ فرماں برداری ان سے ہضم ہوئی تھی نہ اتنا سیدھا اور کہہ ان کی چھٹی حس اس کے بارے میں سگنل دے رہی تھی۔ وہ پچھلے کئی سالوں میں بہت بدل گیا تھا، بے حد فرماں بردار ہو گیا تھا۔ ان کے سامنے سر جھکانے بیٹھا رہتا تھا، بہت کم ان کی کسی بات سے اختلاف کرتا یا اعتراض کرتا لیکن وہ ”سالار سکندر“ تھا، ان کی وہ ”چوتھی اولاد“ جس کے بارے میں وہ سوچتے میں بھی محتاط رہتے تھے۔

صرف سالار ہی نے نہیں، بلکہ امامہ نے بھی سکندر عثمان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو دوری سے بھانپ لیا تھا۔

”ڈوٹ ڈری۔“ پاپا مجھے کچھ ذلیل کریں گے لیکن تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ دور سے اپنی طرف آتے، سکندر کی طرف جاتے ہوئے وہ خود سے چند قدم پیچھے چلتی امامہ کی طرف دیکھے بغیر بے حد مدھم آواز میں بڑبڑایا تھا۔

امامہ نے سر اٹھا کر اپنے ”شوہر“ کا ”طمینان“ دیکھا، پھر تقریباً ”دس میٹر کے فاصلے پر آتے اپنے“ ”سر“ کا ”انداز۔“ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ سوچ کر زیادہ خوف زدہ ہوئی تھی کہ سکندر عثمان سالار کی انسپلٹ کرنے والے تھے۔

(باقی اُسندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول  
ہماری تھی



راحت جبین

قیمت 300/- روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز

قیمت 550/- روپے

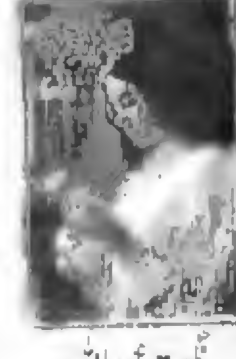
کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی

قیمت 350/- روپے

میرے خواب  
لوٹاؤ



قلبت عبداللہ

قیمت 400/- روپے

فون نمبر:  
32735021

منگوالی  
کتابخانہ: منکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

خواتین ڈائجسٹ 81 جنوری 2015

خواتین ڈائجسٹ 80 جنوری 2015

copied From Web



## اصلی حشر

مسئلہ یوں تو قدرے ٹیز ہوا تھا مگر وصیان اور پیار کی نظر سے سمجھا جاتا تو سلجھنے کو سمجھوتہ تیار ہی تھا۔ عذرا جب سے لڑکی دیکھ کر لوٹی تھیں، چھوٹی سی الجھن پکڑے، اپنی ہی سوچ کی انگلی مار مار کر وہم کے دھاگے کا ڈھیر لگائے بیٹھی تھیں۔ بچے تو خیر ہونے والی مای میں ابھی اس قدر "انٹرسٹڈ" نہ تھے۔ فرہاد کو البتہ اپنی سترہ برس کی گہری سیلی جیسی پیوی کے چہرے نے ہی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

مسئلہ یوں تو قدرے ٹیز ہوا تھا مگر وصیان اور پیار کی نظر سے سمجھا جاتا تو سلجھنے کو سمجھوتہ تیار ہی تھا۔ عذرا جب سے لڑکی دیکھ کر لوٹی تھیں، چھوٹی سی الجھن پکڑے، اپنی ہی سوچ کی انگلی مار مار کر وہم کے دھاگے کا ڈھیر لگائے بیٹھی تھیں۔ بچے تو خیر ہونے والی مای میں ابھی اس قدر "انٹرسٹڈ" نہ تھے۔ فرہاد کو البتہ اپنی سترہ برس کی گہری سیلی جیسی پیوی کے چہرے نے ہی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

سارے صاحب کی سب سے بڑی تباہی کو اپنے اکلوتے بھائی کی منگنی میں شرکت نہ کر سکنے پر کوئی اتنا خودداری کو نہیں، عزت و وقار کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔ فرہاد کا لہجہ شرارتی تھا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے کبھی رشتوں میں اتنا اور خودداری کو نہیں ملایا اور نہ تو۔“ عذرا نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا

چھوڑا تھا۔ فرہاد ان کی بات پھر بھی سمجھ ہی گئے تھے۔ اب وہ دھیرے دھیرے انہیں ساری بات بتا رہی تھیں اور وہ بغور سن بھی رہے تھے۔

عذرا اپنے میاں کے ساتھ دو برس سعودی عرب گزار کر لوٹی تھیں۔ اسی دوران احتشام کے رشتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ اسکا پ پ تو روز ہی اماں سے بات کرتیں۔ چھوٹی تینوں بہنیں بھی انہیں آنے والے رشتوں کے کواکف تفصیلاً بتاتیں۔ جن پہ سنجیدگی سے بحث ہوتی اور یوں ایک بہت ضروری فرض محض فضول سے اعتراضات و خدشات میں قفل کا شکار ہونے لگا۔

کبھی کبھی تو فرہاد کو احتشام کے صبر پر ترس آنے لگتا اور وہ عذرا کو سمجھاتے۔

”بیگم صاحبہ! کچھ اللہ پر بھی چھوڑ دیا کرتے ہیں، وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ آپ تو سارے کا سارا وزن خود ہی اٹھانے میں خواجخواہ بلکھن ہوتی ہیں۔“

”آپ نہیں جانتے ہیں، سو گھر میں لانا کیسی ٹیزھی کھیر ہے۔ ارے بابا! اپنا گھر خاندان ہی کیا۔ اچھی ساری

”کیا بات ہے یار! خیریت تو ہے نا؟“ تنہائی میسر آتے ہی انہوں نے بیگم کی نبض پر گویا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے فرہاد! جیسے امی جی نے احتشام کی منگنی میں کچھ زیادہ ہی جلد بازی کر دی ہے۔ کیا تھا جو وہ ہمارے حج سے واپس آنے کا انتظار ہی کر لیتیں۔“

سہانے رکھی ”آب گم“ کے صفحات بلاوجہ آگے پیچھے کرتے ہوئے ان کے لہجے میں کچھ تاسف سادہ آیا تھا۔

”کیوں بھی کیا ہوا۔ آپ کو لڑکی پسند نہیں آئی یا اس کے گھر والے۔“ فرہاد نے بھی اپنے ہاتھ میں پکڑی ”یادوں کی بارات“ کو سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں خیر لڑکی تو ماشاء اللہ بے حد خوب صورت ہے اور گھر خاندان بھی۔“

اب کے ان کے لفظوں میں نرمی تھی۔ ”تو پھر مسئلہ کیا ہے جناب من!“ شریک حیات کو ان کی الجھن نے بے سکون کر دیا ہے۔ عذرا کو یہ محسوس کر کے گونہ سکون ملا تھا۔ وہ مسکرائیں۔

”اچھا تو اب سمجھا۔ دراصل ہمارے پیارے

آنے والی نسل اسی کے اوپر ہوتی ہے، اچھی طرح پھان پھٹک نہ کی تو عمروں اور نسلوں کا روگ لگ جاتا ہے اور میری امی جی نے تو پھر ایک ہی سولائی سے کون سا تین چار بیٹے ہیں کہ چلو کسی نہ کسی کی تو اچھی نکل ہی آئے گی۔“

عذرا کے پاس ہمیشہ تفصیلی وضاحت ہوتی تھی۔ سعودیہ سے واپسی کے دنوں میں ہی انہیں اللہ نے

حج کی سعادت کا موقع دیا اور ادھر حالات کچھ یوں ہوئے کہ احتشام کی منگنی ان کی غیر موجودگی میں ہو گئی۔ اسی ابو نے خود ہی استخارہ کیا تھا اور مثبت جواب کے بعد ہی فیصلہ ہوا۔ اس کے بعد تو عذرا کو بھی کسی قسم کا اعتراض نہ رہا تھا۔ انہوں نے امی ابو اور احتشام کو فون پر بہت ساری مبارکباد دی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد آج وہ پہلی بار شاہ سے مل کر آئی تھیں اور اپنے ساتھ واپسی پر اس الجھن کو بھی ساتھ لے آئی تھیں۔

چار بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر والی شانے پچھلے برس امی انٹر کیا تھا۔ اس سے بڑے بھائی فوج میں تھی ہیں تو۔ میسٹرک کے بعد ہی اپنے گھر سدھار چلی گئی۔ چھوٹا بھائی غالباً، مل میں تھا۔ محکمہ انہار میں اری کیشن انیسٹرٹا کے ابا کو کچھ عرصہ سے بھانٹا تھا۔ سی کا مسئلہ تھا۔ جب ہی وہ جلد از جلد اپنے فرائض پورے کرنے میں لگے تھے۔

”مگر اس سارے بیک گراؤنڈ میں ”مسئلہ“ نامی کوئی چیز مجھے تو نظر نہیں آتی بھئی۔“ فرہاد کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو عذرا کو ٹوک ہی دیا۔

”فرہاد پلیز! آپ میری پوری بات تو سن لیں نا۔“ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔

”آپ تو جانتے ہیں کہ میرے دادا، دادی علیگ تھے اور میری امی جی نے اس وقت اپنا ایم اے مکمل کیا تھا۔“

جب میں اور بشری اسکول بھی جانے لگ گئی تھیں۔ علم سے محبت اور کتاب دوستی ہمارے خون میں رچی بسی ہے۔ ماہنامہ حور اور ”زیب النساء“ کے زمانے کے رسالے تو ہمارے گھر باقاعدگی سے آتے رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے ”پھول“ سے لے کر آج تک کے سارے بچوں کے رسالے۔ یہاں باقاعدگی سے لائے اور پڑھے جاتے ہیں اور وہ دادا جی کی ذاتی لائبریری جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں۔ آپ تو خود اس کی بہت ساری پڑھ چکے ہیں۔“ عذرا نے فرہاد کا کندھا ہلایا۔

”میرا خیال ہے کہ اب میں سو ہی جاؤں تو بہتر ہے۔“

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجھلاہٹ

ہے۔

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجھلاہٹ

ہے۔

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجھلاہٹ

ہے۔

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجھلاہٹ

ہے۔

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجھلاہٹ

ہے۔

فرہاد کو ان کے طویل بیان سے اب جھنجھلاہٹ

ہے۔



ہوئے لگی تھی۔ سو وہ رخ سوڑ کر لیٹ گئے۔

”پلیز فرماؤ! آپ سن تو لیں۔“

میاں کا بے زاری والا لہجہ انہیں برا لگا تھا۔ سو وہ ان کے کندھے پر ہاتھ کاڑا سا دباؤ دے کر پھر سے اپنی جانب متوجہ کرنے لگیں۔

”یار! اتنی دیر سے میں تمہیں سن ہی تو رہا ہوں اور یہ ساری باتیں تو میں اپنی شادی سے بھی پہلے سے جانتا ہوں“ پھر اس وقت یہ سب دہرانے کا مقصد؟ اچھا خاصا

بڑھ رہا تھا اور تم نے اپنی بات شروع کر دی۔ پتا بھی ہے تمہیں کہ جب تک رات کو میں چند صفحے کسی اچھی کتاب کے نہ پڑھ لوں۔ سو نہیں سکتا۔“

فرہاد نے مزید اپنے منہ کے زائیدے بگاڑتے ہوئے عذرا کی طرف کھٹ لے لی تھی۔

”دیکھا۔ بس یہی بات ہے جو میں اتنی دیر سے آپ کو سمجھانے میں لگی ہوں۔“

عذرا کے چہرے پر وہ فاتحانہ مسکراہٹ آگئی جو اپنا کوئی بڑا مسئلہ اچانک حل ہو جانے پر بے اختیار آجاتی ہے۔

”کیا مطلب؟“ فرہاد کو اب عذرا کی بات میں کچھ دل چسپی ہوئی۔

”میں نے شام سے پوچھا تمہارا پسندیدہ مصنف کون ہے؟ شاعری کس کی زیادہ شوق سے پڑھتی ہو تو اس نے پتا ہے کیا کہا؟“ عذرا نے بچوں کی طرح انہیں جواب دیتے پراکسیا تھا۔

”اقوہ بابا اب بتا بھی دو نا۔“ فرہاد پھر جھجھلائے لگے۔

”کہنے لگی‘ میں کتابیں نہیں پڑھتی ہوں۔ اتنا ہی کہتی تو خیر تھی۔ وہ تو بڑے مزے سے یہ بھی کہنے لگی کہ اتنی مشکل سے تو نصاب کی کتابوں سے جان چھولی ہے اور پھر سے کتابیں‘ کوئی اللہ! مجھے تو اگر کبھی سزا دینی ہو نا کسی نے تو بس کوئی کتاب دے کر بٹھا دو مجھے۔ یہی نہیں میں تو یہ رسالے‘ ڈائجسٹ وغیرہ بھی بس کبھی کبھار ہی پڑھتی ہوں۔ وہ بھی اپنے ابو کی سے جھپ چھپا کر اور پھر ہی ہی کر کے وانت نکالتے لگی۔“ فرہاد

نے کوئی جواب نہ دیا۔

”فرہاد! آپ تو جیج سو گئے ہیں۔“ عذرا نے آنکھیں بند کر کے بڑے سکون سے لیٹے ہوئے فرہاد کا کندھا پھر سے ہلایا۔

”جی جناب! میں بالکل سوچکا ہوں‘ کافی کبریٰ نیند ہے۔ خبردار! جو کسی نے ہمیں دوبارہ جگایا۔“

فرہاد نے اسی طرح بند آنکھوں سے لیٹے لیٹے ہی شہادت کی انگلی اٹھا کر عذرا کو ذرا بھاری سی آواز میں تنبیہ کی تھی۔

ان کا لہجہ ایسا تھا کہ عذرا کو بھی ان کی تھکن کا اندازہ کر کے ہنسی آگئی اور وہ۔ ”جو حکیم بادشاہ سلامت۔“ کہتے ہوئے خود بھی وہاں سے اٹھ گئیں۔

\*\*\*

اگلے روز اتوار تھا اور حسب معمول وہ لوگ بچوں کے ساتھ جوائے لینڈ آئے ہوئے تھے۔ بچے جھولوں پر تھے اور وہ دونوں ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے۔ عذرا کا پسندیدہ قلعہ بہت تجزی سے کھل رہا تھا۔ تب ہی فرہاد نے پلیٹ میں سے ایک بڑا پیچہ خود اٹھا لیا اور ان کے ذرا نزدیک ہو کر کہا۔

”تم ایسا کرو ایک بار پھر لڑکی والوں کے گھر جاؤ اور بغور اس کا جائزہ لو۔“

”فی الحال تو میں اس بات کا جائزہ لے رہی ہوں کہ آپ نے میرا قلعہ چرانے کی کامیاب کوشش کر ڈالی ہے اور اب یہ کیس زور۔“

عذرا نے فرہاد کے سامنے رکھی ان کی پلیٹ اٹھا کر اس میں موجود سارے کا سارا قلعہ اپنی پلیٹ میں ڈال لیا تھا۔ فرہاد کی ایک ذرا سی شرارت نے عذرا کی ساری پریشانی اڑن چھو کر دی تھی۔ اب وہ بڑی رغبت سے قلعہ کھانے میں مگن تھیں۔

”ویسے آپس کی بات ہے یار! آج تم پرسوں سے زیادہ حسین لگ رہی ہو۔“ فرہاد نے ہاتھ بڑھا کر عذرا کے سامنے رکھی پلیٹ کو تھوڑا سا اپنی طرف کھسکا اور پھر اپنے پیچھے سے اسی پلیٹ میں سے کھانے لگے تھے۔

”اچھا کل سے زیادہ کیوں نہیں۔“ فرہاد کی ”حرکت“ پر ایک ہلکی سی گھوری ڈال کر عذرا نے ان سے پوچھا تھا۔

وہ کل تم کو میں غور سے دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ میری عینک خراب تھی نا۔“

فرہاد نے معصومانہ جواز پیش کیا جس پر عذرا کی بے ساختہ ہنسی نے ساتھ والی دوسری ٹیبل تک سفر کیا تھا۔

\*\*\*

بری کے زیورات اور کپڑوں کے سلسلے میں مشورے کے لیے اسی نے عذرا اور فرہاد کو گھر بلایا ہوا تھا۔ بلایا تو چاروں بہنوں کو ہی تھا۔ مگر سمیہ کی ساس کی طبیعت کچھ خراب تھی سو اس نے معذرت کر لی۔ ہاں ثانیہ اور بشری اپنے شوہروں سمیت موجود تھیں۔ تینوں بہنوں نے مل جل کر کھانے کا بالکل دعوت سا انتظام بھی کر ڈالا۔ اسی ابو کے چروں پر بہت ہی سکون بھری مسکراہٹیں اتری ہوئی تھیں۔

”عذرا بیٹا! امیرا قوہ وہاں اسٹڈی میں ہی لے آئے۔“ ابو جی کھانے کے بعد فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بشری اور سمیہ مل کر رتن وغیرہ دھوئے لگیں اور تینوں داماد صاحبان بیوی کے آگے جم گئے۔ سب کو سبز قوہ دے کر عذرا اپنا اور لیا جی کا کپ لیے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئیں۔

”اف اللہ ابو جی! کتنی مٹی ہے شیشوں پر۔“ عذرا انہیں قوہ دے کر بچوں سے امتیاق کے ساتھ کتابوں کی الماریوں کی طرف بڑھی تھیں۔

”بس بیٹا! تمہاری اسی جان میں اب اتنی ہمت ہی نہیں کہ وہ یہ سب کچھ دیکھ سکیں۔ نوکرانی بھی اپنی مرضی سے ہی صفائی کرتی ہے بس۔“

”نہیں ابو جی! یہ تو غلط بات ہے۔ آپ خود کھڑے ہو کر اس سے کام کروائیں۔“

اپنی عزیز ترین کتابوں کا یہ حشر دیکھ کر عذرا کو واقعی بہت دکھ ہوا تھا۔ شادی سے پہلے وہ خود اس حصے کی دیکھ بھال میں ہر وقت لگی رہتی تھیں بلکہ صرف وہی نہیں

وہ چاروں بہنیں اور خود ہی بھی۔ کتاب سے پیار کریں۔ کتاب کی عزت کریں۔

جیسے ”مستہار“ نما کفیات اپنے ہاتھ سے موٹے بار کر کے لکھ کر مختلف جگہوں پر گھر میں لگا رکھتے تھے، جنہیں بڑھ کر ابائی تو اکثر فرس پڑتے تھے۔

”تم لوگوں نے تو گھر کو پبلک لائبریری بنا دیا ہے۔“ وہ اکثر کہتے۔

”جی ہاں تم سب چھوڑو اور ادھر آؤ ذرا۔“ عذرا ابو خود ہی کپڑے کر کر دھوا کر لگ گئی تھیں۔ ابائی نے آواز دے کر انہیں بلایا۔ انہوں نے ممتاز مفتی کی ”مستہار“ ان کے سامنے رکھ دی۔

”شکریہ ابو جی!“ عذرا نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھا لی۔

”ویسے ایک بات تو بتائیں ابو جی! اگر آپ کی آنے والی ہو آپ کی اس روایت کو سنبھال کر چلنے والی خوبی سے محروم ہوئی تو پھر۔“

عذرا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کیا تھا۔

وہ ان کی بات سن کر مسکرا دیے تھے بالکل یوں جیسے بڑے کسی ملاں بچے کی بات سن کر مسکراتے ہیں۔

”بیٹا جی! یہ جو خوبیاں ہوتی ہیں نا بالکل خوشبو بیسی ہوتی ہیں۔ ہر خوبی سے وابستہ ایک خوشبو تو اگر ہماری ہو میں یہ خوبی نہ ہوتی تو کیا پتا اس کی ذات میں کوئی ایسی خوشبو ہو۔“

انہوں نے آنکھ کے اشارے سے پہلے عذرا کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اور پھر اپنے سامنے رکھے قوہ کے گک کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”یعنی کہ بہت اچھا کھانا پکا نا جانتی ہو تو چلے گا۔ ہے؟“

عذرا نے اپنا قوہ کا کپ خالی کر کے میز پر واپس رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے بابا! سرپٹ دوڑے گا تم دیکھنا ان شاء





ابا جی نے بہت پیار سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور وہ دونوں باپ بیٹی اس لیے تھے۔

\*\*\*

شادی والے دن تو اس جوڑی کی شان ہی نہ رہی تھی۔ دیکھنے والے بار بار تعریفیں جملے کہتے اور عذرا دل ہی دل میں ماشاء اللہ کا ورد کیے جاتی تھیں۔

”یا اللہ! یہ لڑکی میرے ماں باپ کے گھر میں بہترین انعام بن کر داخل ہو۔ ہمارے گھر ہماری نسل اور ہمارے خاندان کے حق میں خیر بن کر آئے۔ جتنی خوب صورتی تو نے اسے دی ہے اس کی سیرت و اخلاق کو اس سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت بنا دے۔ میرا خوف ہر خدشہ اپنی رحمت کے صدفے اور کدے میرے مولا یا رحیمہا کریم!“

شادی کی رات نماز کے بعد یہ دعا ہر بار ان کے لبوں سے نکل کر اپنے خالق کے حضور پیش ہوتی تھی۔ فرہاد نے انہیں مڑ کر ایک بار دیکھا اور چپکے سے کمرے سے باہر چلے گئے۔ عبد اور معبود کے درمیان مجاز کی لی الحال جگہ نہ تھی۔

آج سے سترہ برس قبل جب عذرا بیاہ کر تحصیل جلال پور خٹاں کے گاؤں مونگا والا آئیں تو حالات مختلف تھے۔ فرہاد کے گھر اور عذرا کے خیالات میں مشرق مغرب والا فرق تھا۔ مسئلہ کام کاج کا تھا اور نہ ہی پہنے کوڑھنے کا فاسخ وقت میں جب عذرا کی دونوں جھٹھانیاں چھوٹی نند اور ساس فیملی گوسپ میں مصروف ہوتیں یا پھر کڑھائی سلائی میں تو عذرا اپنی عزیز ترین شے یعنی کتاب لے کر بیٹھ جاتیں اور پھر کئی بے ضرر معصوم مشغلہ آہستہ آہستہ بڑا مسئلہ بننے لگا۔

سچ تو یہ تھا کہ عذرا کی ماں کی تربیت کچھ ایسی تھی کہ سبھی ہتھیا چلی اور نہ ہی کبھی فرہاد کے جوتے کپڑے ڈھونڈنے میں مشغول ہوتی۔ وہ ہر کام وقت پر اور بہترین انداز میں کرتی تھیں ہاں مگر۔

”آپ کی یہ آٹھ دس پڑھی ہوئی جاہل عورتیں کیا

جانیں کتاب کی قدر اور اسے پڑھنے کا مزہ۔“

”یہ بات فرہاد سے اکثر کہہ دیا کرتی تھیں۔“

ایک رات فرہاد کو غصہ آئی گیا تھا۔

”ہاں تو اور کیا۔ جب میں آپ کی ماں بہنوں کے سامنے اشفاق احمد ممتاز مفتی، مستنصر حسین تارڑ اور مشتاق احمد یوسفی کا نام کبھی لے لوں تو وہ سب مجھے ایسے دیکھتی ہیں جیسے میں نے کسی۔“ عذرا کی بے ساختہ ہنسی ایک مذاق اڑاتے وقتے میں بدل جاتی تھی۔

”میں نے کسی نامحرم کا نام لے لیا ہو۔ اف اللہ اتنی جہالت۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے ناعذرا! یکم! آپ کو ان سب کی تحریریں جتنی مرضی پسند ہوں۔ یہ بات تو سچ ہی ہے تاکہ شرعی طور پر وہ سب آپ کے نامحرم ہی ہیں۔“

فرہاد کے کڑے جواب نے عذرا کو چپ ہی کر دیا تھا۔ وہ دم بخود تھیں۔

بہر حال اقبال بیگم ایک سمجھ دار خاتون تھیں۔ اپنے بہت براہے لکھے بیٹے کے لیے عذرا جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کو بیوی بنا کر انہوں نے پوری برادری میں ولولہ مچا دیا تھا۔ اب اس ولولہ کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بہو کو اس کی مرضی کا ماحول دیا جائے۔ فرہاد کو انہوں نے بڑی آسانی سے شرمیں الگ گھر خرید دیا اور پھر دو سال بعد ہی وہ بیوی بچوں سمیت سعودی عرب جا بسے۔ صرف وہی نہیں عذرا کے سب ہی سرال والے بہت کم ہی ان کے ہاں آیا کرتے۔ اجنبیت کی نامحسوس ہی ایک دیوار کھینچی تھی جسے عذرا ہمیشہ اپنا خزانہ مان سمجھتی آئی تھیں۔

احتشام کے دلہن کے ٹھیک تیسرے دن ہی فرہاد ایک ماہ کی رشک پر اسلام آباد چلے گئے۔ عذرا کے تو کلام کئی گنا بڑھ گئے۔ دونوں بچوں کو اسکول اور کالج لائے اور چھوڑنے کی ڈیوٹی اور پھر شام کو ٹیڈشن کے لیے اکیڈمی لانا لے جانا۔ وہ تو ای ای کی طرف جانے سے بھی رہ گئیں۔ بس فون پر ہی تھوڑی بہت بات

کہتے ہوئی تھی۔

آخر ایک آوارہ بغیر بتائے ہی میکے پہنچ گئیں۔

ماں ان کی حیرت کے برے خوب صوت سامان میسر تھے۔

ساگو ان کی بڑی سی ڈانگ ٹیبل پر بچھا بہت خوب صورت کروشیم سے بنا میز پوش۔ ای ابو کے کمرے کی دونوں تپانیاں بھی کروشیم کے کورڈنلی میوون چھوٹی گدیوں سے ڈھک دی گئی تھیں۔ ہر طرف صفائی تھرائی سلیقے کی چمک اور ان سب سے بڑھ کر امی ابو کے چروں سے چھٹکا کھرا اطمینان اور احتشام کا خوشی سے دھمکا چہرہ۔ انہیں اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہو چلا تھا۔

ابو جی اپنی لائبریری میں کسی ہلو شاہ کی طرح بیٹھے تھے۔

”آؤ تمہیں کچھ دکھاؤں۔“

چہرے پر بچوں کی خوشی اور دہاد بوجھ لیے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک لماری کی طرف بڑھے۔ جس کے پٹ کھلنے پر ایک اور سربراہ عذرا کا منظر تھا۔

بیچ بخاری اور تندی شریف کا مکمل سیٹ بے حد خوب صورت کروشیم سے بنے بک کور میں ملفوف تفسیر القرآن کی تمام جلدیں الگ الگ مگر ایک ہی انداز کے کور میں ملفوف سب سے اوپر کے خانے میں رکھی تھیں۔

ابو جی کی اتنی عزیز کتابوں کو اتنا پیارا انداز دینے والی اس لڑکی پر عذرا کو بے ساختہ ہی بہت سائیا آ گیا تھا۔ انہوں نے شرمیں مسکراہٹ والی مٹا کوٹھے سے لگا کر اس کا ہاتھ چوما تھا۔

بہت ہی مزے دار اور پر کلف کھانے کے بعد جب شام کے لیے قہوہ پینے چلی گئی تو امی ابو اور احتشام کے منہ سے اس کی تعریفوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اس کے آنے پر ہی تھا۔ عذرا کے دل کی خوشی دھیرے دھیرے کہیں پائپ ہونے لگی تھی۔ اس کی جگہ ایک بے نام لاداسی اترنے لگی تھی۔

”یہ لیں آپ! میں نے شادی سے پہلے ہی بنا کر رکھی

تھی صرف اور صرف آپ کے لیے۔“

گھر واپسی سے پہلے ٹانے کروشیم سے بنی ایک پیاری سی چادر انہیں بطور تحفہ دی تھی۔

آنے والے دن وہ بہت کچھ سوچتی رہی تھیں اس لڑکی کے بارے میں جسے اس گھر میں آئے ابھی چند دن ہوئے تھے مگر سب لوگ اس کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اتنی تعریف جو ان سترہ سالوں میں بھی ان کے سرال کے کسی ایک فرد نے بھی ان کی نہیں کی تھی۔ انہیں لگا زندگی میں پہلی بار وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ بہت عام سی لڑکی ایک چھوٹے سے کروشیم کے ہنر سے لوگوں کے دل فتح کر چکی تھی اور خود عذرا کیسی بے ہنر تھیں کہ علم جیسی دولت ہاتھ میں ہونے کے باوجود کسی کو بھی اپنا ہاتھ نہیں پائی تھیں۔ علم کے غرور نے انہیں محبت کرنے اور محبت مانگنے کے ہنر سے محروم کر دیا تھا۔

”ہیلو فرہاد! میں کہہ رہی تھی کہ آپ کے واپس آنے پر کیوں نا ہم کچھ دن گاؤں جا کر رہ آئیں۔ بچوں کی بھی چٹھیاں ہوں گی۔“

عذرا نے بالکل عام سے انداز میں کہا جیسے وہ اکثر ہی وہاں آتی جاتی ہوں۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ سری طرف فرہاد بس اتنا ہی کہہ سکے تھے۔

”اور ہاں واپسی پر ہم امی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے وہ یہاں ہمارے ساتھ رہیں۔ ٹھیک ہے نا فرہاد؟“

اب عذرا کے لہجے میں ایکسان بھرا استحقاق تھا۔ وہ سری طرف فرہاد بس سر ہلا کر ہی رہ گئے۔ اپنی بیوی کے منہ سے یہ ایک جملہ اس انداز میں سننے کے لیے انہوں نے کتنے برس انتظار کیا۔ یہ بس ان کا دل ہی جانتا تھا۔ آج دل سے خوش تھے۔

عذرا نے فون بند کیا تو وہ جانتی تھیں فرہاد اس لمحے کیا محسوس کر رہے ہوں گے۔ آخر ان کی عذرا کو دل جیتنے اور خود سے وابستہ رشتوں کو جوڑنے کا بے مثل ہنر تھی گیا تھا۔

چپ



# سگر و قہار

”اگر تمہارا ارادہ بیرون ملک سفر کا ہے تو اسے ملتوی کر دو۔ ان پندرہ دنوں میں اگر تم نے پاکستان سے قدم ہار نکالا تو ساری زندگی واپس نہیں آسکو گی۔“ اس نے نایب خدی کے کنارے یہ کھڑے ہو کے وہی بات سوچی جو وہ راستے بھر سوچتی آئی تھی پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ام ہانی نے قدم نکال لیا تھا پاکستان سے اور اب افریقہ کا تاریک براعظم اس کے قدموں کے نیچے تھا۔ ندی کے راستے وہ ”مالی“ کے قبیلے ”ڈوگون“ میں پہنچے تھے۔

نیشنل پریس آف پاکستان کی جانب سے وہ تین لوگ افریقہ کے لوگوں کے حالات اور وہاں کی آمریت کے بارے میں ڈاکو مٹری بنانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس سفر کی اسے کبھی اجازت نہ ملتی اگر عبید ساتھ نہ ہوتا۔ گو کہ عبید بھی اس کے جانے کے حق میں نہیں تھا پر وہ اس سے ہمیشہ اپنی بات منوالیتی تھی۔

”دو ماہ بعد شادی ہے۔ تم ہلیک ہارلی بن جاؤ گی ہتی!“ اسے لگا تھا کہ شاید خوب صورتی کے حوالے سے وہ مان جائے روڈ ٹی ری۔

”میرا دل نہیں مان رہا کہ تم جاؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ میں تمہیں کھودوں گا۔“ یہ واقعی پریشان تھا۔

”یہ وہم تو تمہیں ایلیمنٹ سے بھی پہلے کا ہے۔“ وہ اسے بالکل سیریس نہیں لے رہی تھی اور پھر وہ بالآخر ان ہی گیا اور پاپا کو منانے کا سہرا بھی اسی کے سر تھا۔ پریشان وہ تب بھی نہیں ہوئی تھی جب اردو بازار میں بیٹھے اس نجوی نے اس کا ہاتھ دیکھ کر اسے خبردار

کیا تھا۔ وہ ایک آزاد خیال اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ ہاتھ کی لکیوں اور ستاروں پر اسے یقین نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے یہ بات کسی کو بتائی تھی۔ پر یہ سچ تھا کہ یہ بات اس کے ذہن سے نہیں نکلی تھی۔

”چلیں ڈیر!“ عبید نے اس کے پاس آکر کہا۔ ”ہاں چلو۔“ وہ سوچوں کے غمور سے نکلی۔ احسن اور گائیڈ دونوں ان کے پیچھے تھے۔ تنگ دھڑنگ نیچے حسرت و بے بسی کی تصویر بنے انہیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ خلا کی مخلوق ہوں۔

اس پر پہلی مرتبہ کھلا کہ افریقہ کو تاریک براعظم کیوں کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں کے باسیوں کا مقدر تاریک ہے۔ ان کے کالے جسوں اور چلی آنکھوں کو دیکھ کر ان کی قسمت کا اندازہ ہوتا تھا۔

”یہاں کے سردار کو آپ کی آمد کی اطلاع کر دی گئی ہے۔ وہ رات کے کھانے پر آپ سے ملیں گے۔“ گائیڈ احسن کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ ان کے پیچھے بار بار جھپٹی تھے جنہوں نے سامان اٹھایا تھا۔

”تیس سال کی عمر میں منتخب ہونے والے وہ سب سے کم عمر سردار ہیں۔ ڈوگون کے لوگ انہیں کسی دیوتا کی طرح پوجتے ہیں۔ صرف یہی نہیں انہیں آٹھ زبانوں پر مکمل عبور بھی حاصل ہے۔“ گائیڈ کا ”سردار“ نامہ ”جاری تھا اور وہ متاثر ہوئی تھی۔ گائیڈ بھی یہاں کا مقامی تھا پر اس کی انگلیش کافی شستہ تھی۔ وہ ہر بات کے شروع اور آخر میں اپنے سیاہ بڑے ہاتھوں کو ہوا میں





لہراتا۔

”سردار صاحب تو کافی متاثر کن شخصیت کے مالک ہیں۔“ اس نے مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔  
”جی میڈم۔۔۔ کافی سے بہت زیادہ متاثر کن۔“ اس نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

”وہ صاحب کتاب بھی ہیں ان کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب the curtain Behind (پردے کے پیچھے) نے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔“ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے بتایا۔  
”رہی! وہ ایک جھٹکے سے کہتے ہوئے مڑی۔ عبید نے بغور اس کی طرف دیکھا۔  
”وہ شخص تو دیکھنے لائق ہے۔۔۔ ہے نا عبید؟“ اس نے توصیفی انداز میں کہا۔

”ہی۔۔۔ ہم یہاں صرف نوڈن کے لیے ہیں بہتر ہو گا ہم اپنے کام پر توجہ دیں۔“ وہ مسکراوی اسے پتا تھا۔  
عبید بہت جلد جھپلس ہو جاتا تھا اکثر اسے تنگ کرنے کے لیے وہ جھوٹ موٹ دوسرے مردوں کی تعریف کرتی۔ پر اس ان دیکھے سردار سے جس کا وہ نام نہیں جانتی تھی واقعی متاثر تھی۔

”وہ بھی ہمارے کام کا حصہ ہے میں ایک فلم تو اس کی بلا تکلف ضرور بناؤں گی۔“  
اس نے ایک نظر سامنے آبادی پہ ڈالی۔ تمام گھر چینی مٹی سے بنے ہوئے گتے تھے اسے لگا جیسے وہ پاکستان کے کسی دیہات میں آگئی ہو۔ یہاں کے باشندوں نے اس کے خیال کی نقل کی۔ ان کے پورے بدن پر جو ایک چیز سفید تھی وہ ان کے دانت تھے وہاں دھول اور مٹی کی بہتات تھی۔

”آلو۔۔۔ آلو۔“ ایک عورت اسے بھاری پیٹ کو سینھالتے ہوئے ایک لاغر سے بچے کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

”یہ آپ کے عارضی قیام کے لیے آپ کی رہائش گاہ ہے۔“ کاٹیڈ ویسے ہی کچے مکان کے سامنے رک گیا جیسے وہ کبھی آری تھی سردرازہ لکڑی کا تھا۔ محسن

کافی بڑا تھا اور اس میں چار کمرے تھے۔

”آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ اس گھر میں ہاتھ روم اور پانی کی سولت موجود ہے۔“ وہ ان تینوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا جو بغور گھر کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”بہت شکریہ مسٹر میکا! عبید اور احسن نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔

”پاکستان میں اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی ہوتی۔“ اس نے آسمان پر شفق کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ کمرے آرام دہ تھے۔ اس کا کمرہ عبید کے ساتھ والا تھا۔ ضرورت کی تقریباً تمام چیزیں وہاں موجود تھیں۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے اپنا مشلائٹ فون ہاتھ میں پکڑا اور عبید کو بتا کر باہر نکل آئی۔

”پتا نہیں مجھے اتنا چاہیے تھا یا نہیں۔“ مالی کی تاریک گلیوں میں پھرتے ہوئے اس نے سوچا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ ماما کو اپنی خیوت بتا کر اس نے سارہ کو کال ملائی۔ نجوی کو ہاتھ دکھاتے وقت وہ اس کے ساتھ تھی اور اس کے جانے کے حوالے سے کافی پریشان تھی۔ اچھے دوست بھی نعمت خداوندی ہوتے ہیں۔ ڈوگون قبیلہ شاید مالی کا سب سے پسماندہ قبیلہ

تھا۔ بجلی حال ہی میں متعارف ہوئی تھی کسو کہیں کہیں 60 واٹ کے زرد بلب اندھیرے سے خبر آتا تھا۔ پھرتے پھرتے وہ کافی گلیاں مڑ چکی تھی۔ سامنے ہی ایک مقامی شخص ایک گھر کے باہر لگے بلب کے نیچے کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

”ہیلو۔۔۔ میں تھیک ہوں ڈیر۔۔۔ بس ابھی پہنچی ہوں۔“ بات کرتے کرتے وہ اس مقامی کی جانب بھی دیکھ لیتی جو بالکل مگن تھا۔

”لولو لولیک بیوی! اولی بلیک۔۔۔ میں تو ایک گھٹے میں ہی آگئی ہوں۔ ایک عجوبہ میرے سامنے بیٹھا ہے۔۔۔ بخشو بابا کی بھینس بھی اس سے ٹھوڑی گوری ہی ہوگی۔“ بات کے اختتام پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس۔ اس کے ایسے ہنسنے پہ سیاہ فام نے نظریں اٹھا کے دیکھا اور پھر

ویسے ہی مگن ہو گیا۔

”نہیں! نہیں! یہاں اردو کوئی نہیں سمجھتا۔“ پھر اس نے دو چار باتوں کے بعد اللہ حافظ کہہ دیا اور واپسی کے لیے چل پڑی۔ اسے سردار سے ملنے کی جلدی تھی۔ وہ واقعی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ رات کے کھانے کے لیے تیار ہونا تھا۔

”کہاں رہ گئی تھیں؟“ عبید اس کا پتھر تھا۔  
”بس یہیں تھی میں تیار ہو لوں۔“

”اول ہوں۔۔۔ خوب صورت لڑکیوں کو تیار ہونے کی کیا ضرورت۔“ وہ اس کے روم میں تھا۔  
”یہ تمہاری محبت ہے خیر تم اور احسن بھی پیچ کر لو۔“ اس نے ڈریس منتخب کرتے ہوئے کہا۔

”ہی تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟ تم میرا خیال رکھتی ہو میرے لیے پریشان ہوئی ہو پر مجھ سے محبت نہیں کرتیں۔“ یکدم ہی اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔  
”عبید! مجھے نہیں پتا محبت کیسے کی جاتی ہے میں نے کبھی نہیں کی لیکن میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں۔ جلدی نہ کرو یہ بلو والا پہنوں یا پھر نکلو والا؟“ عبید نے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ اسے واقعی اس کی محبت کی پروا نہیں تھی۔

”کوئی سا بھی پہن لو۔۔۔ تم پہ ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔“ وہ چپ چاپ جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے ایسے ہی مایوس کرتی تھی۔ اس کے ہر سوال کے جواب میں امہالی کا ایک ہی ٹالنے والا انداز ہوتا۔

”عبید! پتا نہیں محبت کیا ہے۔“  
”مجھے نہیں پتا کہ خاص جذبات کیسے دل میں ابھرتے ہیں۔“  
”مجھے تمہاری فکر ہے تم سمجھ لو۔ یہی محبت ہے۔“

وہ اس کی منگیت تھی اور وہ ماہ بعد ان کی شادی تھی اپنی کاروبار اس کے لیے بہت مایوس کن تھا۔ پیچ کر کے وہ باہر آیا۔ سامنے وہ بالکل تیار اپنے موبائل اور

بچ کے ساتھ محسن میں ٹھل رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکی۔  
”عبید! میں۔۔۔“

”بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ احسن نے کمرے سے نکلتے ہوئے اس کی بات کافی تھی۔  
”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہ پوچھنے والی تھی۔“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔  
”کیونکہ ہر لڑکی تیار ہو کے یہی پوچھتی ہے۔“ عبید نے جواب دیا تھا۔

دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ وہ بھاگ کر کھولنے کے لیے گئی پر عبید نے اس کا ہانڈ پکڑ لیا۔  
”کیا بہت بھوک لگی ہے۔؟“

”نہیں! مجھے سردار سے ملنے کی جلدی ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ احسن دروازہ کھول چکا تھا۔ باہر ایک تو مند سیاہ فام انہیں لے جانے لے کھڑا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارے سردار کا۔؟“ اس نے سیاہ فام سے پوچھا۔  
”میڈم! ان کا نام ہے سون جاہ تو۔“  
”سون جاہ تو۔“ اس نے نام دہرایا۔  
”اس کا مطلب کیا ہے۔“ اس نے ایک اور سوال کیا۔



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے





”اس کا مطلب افریقہ کا نجات دہندہ۔“ وہ سوال پوچھ رہی تھی اور وہ ایسے جواب دے رہا تھا جیسے وہ رولوٹ ہو۔ ہر سوال کا جواب اس کی طرف دیکھے بغیر فوراً اسے پیش کر دیتا۔ آخر کار وہ کودار کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ انہیں بہت احترام کے ساتھ کھانے کی میز پر لایا گیا۔

”کتنا اچھا لگ رہا ہے۔۔۔ ہے نا عبید۔“ اس نے تائید چاہی تھی۔ جواباً وہ خاموش رہا۔ کھانا ان کے سامنے میز پر چنا جا رہا تھا۔ درود گرونگاروڑا نے سے لگتا نہیں تھا کہ یہ فیملی کے سردار کا گھر ہے۔

”اگسکھوڑی۔۔۔ یہ کون سی ڈش ہے؟“ اس نے کھانا لانے والے سے ایک ڈش کے بارے میں پوچھا جس میں اسے مکی لگ رہی تھی۔

”حلی میل۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

”حلی میل۔“ اس نے پراسامہ بناتے ہوئے دہرایا۔

”عبید۔۔۔ مجھے نہیں کھانا چلو چلتے ہیں۔“ اس کا خوب صورت چہرہ ایسے ہو گیا جیسے ابھی انکائی آجائے گی۔

”خاموش بیٹھی رہو، آنے کی بھی جلدی تھی تمہیں اور اپنے چہرے کے تاثرات ٹھیک کرو۔“ عبید کے گھر کے چوپہرے کے بیٹھ گئی۔

”سردار آگئے ہیں۔“ کھانا لانے والے کی آواز پر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور نظریں وہیں انک گئیں۔ سامنے وہی سیاہ دام تھا جو تھوڑی دیر پہلے کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ مضبوط جسم اور لمبے قد کا سیاہ دام تھا اور

ٹھہری ٹیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ آبنوی جسمہ ام ہانی نے بغور اس کی جانب دیکھا اس کا رنگ کالا ضرور تھا لیکن نقوش وہاں کے لوگوں کے برعکس دیکھے تھے۔ اونچی ستواں ٹاک اور بڑی بڑی گہری آنکھیں اسے ان سے الگ کر رہی تھیں۔ اس نے احسن اور عبید سے ہاتھ ملایا اور ام ہانی کو سر کے اشارے سے سلام کیا۔ پھر اس نے خوش آمدید کے دو تین رسمی جملے بولے اور انہیں کھانے کے لیے کہا۔ اس دوران وہ اپنے پالش

زرد ناخنوں کو دیکھتی رہی۔

”کھائیں پلیز۔“ اس نے حلی میل کی ڈش اس کے سامنے رکھی۔

”سوری۔ میں یہ نہیں کھا سکتا۔“ اس نے ہاتھ سے پلیٹ پیچھے کی۔

”مگر کیوں۔۔۔؟“ اس کے سیاہ چہرے پر حیرت پھیل گئی۔

”مجھے اس کا نام پسند نہیں ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے کہ صرف نام کی وجہ سے آپ نے اسے پیچھنے سے انکار کر دیا ہے۔“ بات کے آخر میں وہ تھوڑا سا ہنسنا جیسے مذاق اڑا رہا ہو۔ وہ کافی ردائی سے انگلیں بول رہا تھا۔ احسن اور عبید دلچسپی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہے تھے۔

”میرے لیے اس بات سے زبان عجیب اس ڈش کا نام ہے۔“ اس نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا۔

”اگر تو پھر آپ کو یہ ضرور پسند آئے گی۔“ اس نے ردائی والی پلیٹ اس کے سامنے کی۔ اس کے پاس کھانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ احسن اور عبید نو تقریباً ساری ڈش ہی چکھ رہے تھے۔ وہ کھاتے ہوئے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیتی۔

”گائیڈ نے بتایا تھا کہ آپ کو آٹھ زبانوں پر عبور حاصل ہے۔“ احسن نے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”جی مسٹر احسن۔۔۔ آپ کو سچ بتایا گیا ہے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بہت عمدہ۔ ذرا بتائیں گے کہ کون کون سی زبان۔“ احسن کے دوبارہ پوچھنے پر وہ تینوں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اردو۔“ اس نے ام ہانی کی طرف بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس کا سانس جیسے حلق میں ٹپک گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے اس کے لیے کتنے نازبا الفاظ استعمال کیے تھے اور اس کے دیکھنے پر وہ سمجھی کہ شاید حقیقت نے اسے متوجہ کیا ہے۔ اس کے تاثرات احسن اور عبید

سے تو چھپ گئے تھے پر اس تیسرے بندے سے نہیں چھپ سکے تھے۔ اس نے بمشکل سانس لی۔ اور ہونہار انداز میں دبا کر چپ چپ بیٹھ گئی۔

”دوبارہ گند۔ آپ اردو سمجھ سکتے ہیں۔۔۔؟“ عبید کو اس بات نے بہت اکیسا پٹخا کر دیا تھا۔

”جی ہاں، بہت اچھے سے سمجھ اور بول سکتا ہوں۔“ بات کرتے کرتے اس نے ایک بار پھر ام ہانی کی طرف دیکھا اور اب کے جواب بھی اردو میں ہی دیا تھا۔

”اس کے علاوہ اور کون سی زبانیں ہیں۔۔۔؟“ عبید نے پرجوش ہو کر پوچھا۔ ”اس کے علاوہ روڈنگا، برنگلی، سواہلی۔۔۔“ وہ کیا بتا رہا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شرمندگی کے باعث وہ نظریں نہیں اٹھا پا رہی تھی۔ اب وہ سب ہی اردو میں بات کر رہے تھے۔

”میری فیاضی تو بغیر دیکھے ہی آپ سے بہت متاثر ہو چکی تھی۔۔۔ جی ایسا ہے تاہم کئی ناؤلی ہو رہی تھیں ان سے ملنے کے لیے۔“ عبید کا جوش تو کسی بھی طرح سے ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔

”فیاضی، دیری نائس بہت بہت مبارک ہو آپ کو مسٹر عبید! آپ کی فیاضی بہت خوب صورت اور ہنسندہ لڑکی ہے۔“ اس نے گہری نظروں سے ام ہانی کی طرف دیکھتے ہوئے بظاہر مسکرا۔ کے کہا۔

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ عبید کے شکریہ کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ تینوں اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھے۔

”عبید! میں جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے میز پر ہاتھ رکھ کر اٹھ لیا۔

”ہنی! بیٹھ جاؤ۔ ابھی یہ بات کر رہے ہیں۔“ اس نے شرمندہ نظروں سے سون جاہ لو کی طرف دیکھا۔

”میں نے کہا ہے کہ مجھے ابھی جانا ہے۔“ اب کے غصہ اس کی آواز سے عیاں تھا۔

”بیٹھ جائیں مس ام ہانی! اس علاقے میں آپ میرے سانس کیے ہوئے پر مٹ کی وجہ سے داخل

ہوئے ہیں، اگر آپ لوگ تسلی سے اپنا کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ یہاں کے پانی باشندوں کی طرح میرے احکامات پر عمل کریں۔“ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اس نے چند جملوں میں اپنا مقام یاد دلایا تھا۔

وہ جس جھٹکے سے کھڑی ہوئی تھی اسی جھٹکے سے بیٹھ گئی۔ موبائل اور ریچ۔ زور سے میز پر پٹخا۔ چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔

”مجھے امید ہے کہ آپ لوگ یہاں کے امن و امان کو قائم رکھیں گے۔ علاقے کی حدود ختم ہوتے ہی ایک گلاس فیکٹری ہے جس کے آؤز مسٹر فرینک ہیں۔ یہاں انہیں سستے مزدور مل جاتے ہیں، سودن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔“ اس نے ساری بات اردو میں کی تھی۔

”آپ لوگوں کے لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ مسٹر فرینک اور وہاں کے دوسرے منتظمین سے دور رہیں۔“ بات کے آخر میں اس نے تینوں کی جانب دیکھا۔

”کیا آپ لوگ کچھ کہنا چاہیں گے۔۔۔؟“ سون جاہ تو نے پھر سے باری باری تینوں کی جانب دیکھا۔

”مجھے کہنا ہے۔“ اس کے بولنے پر عبید نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

”جی ضرور مس ام ہانی۔۔۔ ہم سب کو آپ کی بات سننے میں دلچسپی ہے۔“ وہ تھوڑا سا مسکرا کر اس کی جانب جھک کر بیٹھ گیا۔

”آپ یہاں کے سردار ہیں، آپ کے احکامات یہاں کے باشندوں پر لاگو ہوتے ہیں، یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ ہم یہاں کے پاس نہیں مہمان ہیں۔ آئندہ میرے ساتھ حکیمانہ انداز میں بات کرنے سے ذرا گریز ہی کیجئے گا۔ نیشنل پریس آف پاکستان میں میرے پاپا کے دس فیصد شیئرز ہیں اور اس وقت ان کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہے کہ وہ ”ڈوگون“ جیسے دو قبیلے خرید سکتے ہیں مجھے امید ہے کہ آئندہ بات کرتے ہوئے آپ میری حیثیت کو مد نظر رکھیں گے۔“ ٹھہر ٹھہر کے اور چبا چبا کے بولتے ہوئے اس نے پوری بات





بیوٹی بکس کا تیار کردہ

# سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے ہاتھوں کو دھو کر
- سے بال اکاڑا ہے۔
- ہاتھوں کو صاف اور ہلکا کرنا ہے۔
- مراد، مورتی اور بچوں کے لئے
- کہاں ملے۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت 120/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جری بوتلوں کا سرکب ہے اور اس کی بنیادی  
کے حامل بہت مشکل ہیں لہذا ہر جری مقدار میں لیا جاتا ہے۔ یہ ہاتھوں  
یا کسی دوسرے شے میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی خرید جاسکتا ہے۔ جبکہ  
یوں کی قیمت صرف 120/- روپے ہے۔ دوسرے شہروں کے لئے آؤنگ  
کر جیٹر پارسل سے منگوائیں۔ ہر جری سے منگوانے والے نئے اور اس  
حساب سے منگوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 500/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 400/- روپے
- 8 بوتلوں کے لئے 300/- روپے

نوٹ: اس میں ایک خرچ اور پیکنگ بارڈ شامل ہیں۔

منی آرڈر بتھیں کے لئے ہمارا بندہ:

منی بکس، 53-اڈولف ہب، کبٹ ویکٹر فور، ایم اے جٹان روڈ، کراچی  
دوسری طرف والی محلات، سوہنی ہیرائل ان جگہوں  
سے حاصل کیجیں۔  
منی بکس، 53-اڈولف ہب، کبٹ ویکٹر فور، ایم اے جٹان روڈ، کراچی  
کبٹ ویکٹر فور، 37-اڈولف ہب، کراچی۔  
فون نمبر: 32735021

گائیڈ احسن اور عبید کے ہمراہ تھا۔ وہ اکیلی ہی پھرتی  
رہی۔ کارڈ ابھی بھی اس کے پاس تھا پر وہ اسے کہیں  
دکھائی نہیں دیا تھا۔

”بات سنیں۔ آپ کا سردار اس وقت کہاں ہو گا؟“  
اس نے ایک عورت کو روک کر پوچھا۔ عورت نے  
جواباً ”بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔“  
”وہ اس وقت کھیتوں میں ہوتا ہے۔“ ٹولی پھولی  
انکوش نے اسے سمجھایا تھا۔

”اور کھیت کس طرف ہیں؟“  
”وہاں اس طرف۔“ عورت نے ہاتھ کا اشارہ  
کیا۔

”لو کے شکریہ۔“ وہ فوراً چل پڑی۔  
”رکو، میری بات سنو۔“ عورت نے اسے آواز  
دی۔ وہ جوابی چند قدم چلی تھی پھر سے واپس آگئی۔  
”جو عورت اس پہ مری ہے، وہ مر جاتی ہے۔“  
عورت کا لہجہ پراسرار سا ہو گیا۔

”کیا مطلب عین سمجھی نہیں۔“ اس نے الجھن  
بھری نظروں سے عورت کو دیکھا۔

”مطلب اس کے عشق میں مبتلا ہونے والی ہر  
عورت کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔“ عورت نے اپنے  
موتے ہوئے ہونٹوں پر زبان بھیری۔

”یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“  
”کیونکہ میں کچھ دیکھ رہی ہوں تم میں۔“ عورت  
نے بائیں ہاتھ میں پکڑی نوکری دائیں ہاتھ میں منتقل  
کی۔

”تم کون ہو۔؟“ وہ ایک دم ہی پریشان سی ہو گئی  
تھی۔

”میں ایک کلہنہ ہوں۔“ عورت نے جواب دیا اور  
”چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے عبید  
سے وعدہ کیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری ایڈوینچر ہو گا۔  
اور شاہی کے بعد وہ جاب و غیمو سب کچھ چھوڑ دے  
گی۔ مگر اب اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس  
لے غلطی کی ہے۔

”میں قسمت کا حال بتاتی ہوں اور کسی بیماری کے

آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اوپر ”آئی ایم  
ساری“ کے الفاظ لکھے اور نیچے اپنا نام لکھ دیا۔

صبح احسن کی کال نے اسے نیند سے جگایا۔ قریش ہو  
کے وہ عبید کے روم میں پہنچی تو وہ ناشتے کے لیے اس  
کے منظر تھے۔

”ناشتہ کس نے بھیجا؟“ اس نے بیٹھتے ہوئے  
پوچھا۔

”اسی نے جس کے ساتھ تمہاری لڑائی ہے، جب تم  
کھاؤ گی یا پھر خود سے بناؤ گی۔؟“ احسن نے اسے  
چھیڑا۔ اس نے جواباً اسے گھور کر دیکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک عورت صفائی کرنے کے  
لیے پہنچ گئی۔ وہ بھی تھوڑی بہت انگلش سمجھتی تھی۔  
عبید نے کام بانٹ دیا تھا۔ اس کے ذمے آج افریقہ کے  
”ہاؤس ہولڈ“ کی ڈاکو مینٹوری تھی۔ وہ عورت وہیں  
تھی۔ اس نے اپنی ساری چیزیں لاک کر دیں اور جانے  
کے لیے تیار ہو گئی۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“ اس نے ہنسلیٹ پینتے  
ہوئے اس عورت سے پوچھا۔  
”سارینا۔“ عورت نے جواب دیا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے عورت کی آنکھوں میں  
دیکھا۔ اداسی، ملال، حسرت، ایسے ہی کیا کچھ نہیں تھا۔  
اس کی سیاہی بالکل زرد آنکھوں میں۔ یہ آنکھیں بھی  
اللہ نے کیا خوب بنائی ہیں۔ نفرت، محبت، دکھ درد کوئی  
بھی جذبہ ہوا ان سے چٹک چٹک پڑتا ہے۔

”یہ لو سارینا۔ یہ تم ہیں لو۔“ اس نے جیوری  
یا کس سے ایک خوب صورت انگوٹھی اٹھا کے اسے  
دی۔ عورت نے ہچکچاتے ہوئے رنگ اپنی کالی بھدی  
انگلیوں میں پسین لی۔ ایک عجیب سی خوشی اس کے  
چہرے پہ آگئی تھی۔

”اوکے۔ پھر مجھے اب چلنا ہو گا۔“ اس نے کیمرہ  
گلے میں لٹکایا اور کارڈ بھی ہاتھ میں پکڑ لیا اور باہر نکل  
آئی۔ پھرتے پھرتے اس نے کھیتے ہوئے بچوں کی  
تصویریں بنائیں۔ اسے کارڈ دینا تھا پر ”سون جاہ تو“ تو  
کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کی۔

”آپ کے بچا کی دولت کے بارے میں جان کر بہت  
مرعوب ہوا ہوں تو سچ میں بہت بڑے آدمی ہیں اور میں  
معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو میری بات بری لگی۔  
رات کا کھانا آپ روزانہ نہیں تناول کیا کریں گے۔  
اب آپ سے کل اسی وقت ملاقات ہوگی۔ امید ہے،  
آپ لوگوں کی رات اچھی گزرے گی۔“ وہ کہتے  
ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہارا بولنا تو بے کاری گیا، وہ تو تم سے بالکل متاثر  
نہیں ہوا۔“ احسن نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔  
”مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے اس کالے  
بھینے کو متاثر کرنے کی۔“ اس نے منہ بنا کر کہا اگرچہ  
اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ واقعی ذرا بھر بھی متاثر نہیں  
ہوا۔ ایک سیاق نام نے انہیں گھر تک چھوڑنے کی  
پیشکش کی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ راستہ بخوبی سمجھ  
گئے تھے۔

”تمہیں اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تو بہت  
خوش اخلاق آدمی ہے یا ر! اور وہ کھو اس نے تمہاری  
باتوں کا بالکل بھی برا نہیں مانا، وہ عین احسن کے روم  
میں تھے اور ڈر کوڑ مسکس کر رہے تھے۔

”پر اس نے ہر بات مجھے جتا جتا کے کی، اس نے  
طنزاً ”کہا تھا کہ وہ بچا کی دولت سے بہت متاثر ہوا ہے اور  
میں مہذب ہوں۔“ وہ کسی بھی طرح اپنی غلطی ماننے کو  
تیار نہیں تھی۔

”ہنی! تم پاگل ہو کیا۔ وہ تم پر بھلا کیوں طنز کرے  
گا۔“ اس کی بات نے دونوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا  
تھا۔ جواب میں اس نے ساری بات بتادی اور اب وہ  
دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وہ چپ چاپ  
بیٹھیں غصے سے دونوں کو دیکھتی رہی۔

”اب تم ایک چھوٹا سا کارڈ بناؤ اور معافی نامہ لکھ  
کے اسے دے دو۔“

احسن کا مشورہ برا نہیں تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا  
کارڈ بنایا اور اس کے اوپر ایک دو یونیورسٹی والی خوب  
صورت بنی بنائی جو ہاتھ جوڑ کے بیٹھی تھی اور اس کی





لیسے پانی پہ دم کر کے دوں تو وہ بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے میرے پیچھے ہوئے میں اثر ہے۔ شاید وہ زیادہ بولنے کی عادی تھی۔

”تمہارے بارے میں مجھے ایک عورت نے صبح بتایا تھا کہ ایشیا کی ایک حسینہ آئی ہے، تب ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے خبر ہو گئی کہ کچھ غلط ہونے والا ہے، آؤ درمیں تمہارا حساب لگاؤں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑی دیر بعد ایک جھونپڑے میں لے آئی۔ خوف کا شدید احساس اس پہ طاری ہو گیا تھا اور وہ ایسے آگئی تھی جیسے مکمل طور پر اس کے بس میں ہو۔

”یہاں بیٹھ جاؤ۔“ عورت نے اسے ایک چٹائی پہ بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنا سامان اٹھا کے اس کے پاس آگئی۔

”اس پانی کو پیو۔“ پانی کا بھرا ہوا پالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے پی کر اسے واپس کر دیا۔ بچے ہوئی پانی پہ وہ کچھ پڑھ کے پھونک مارنے لگی۔ دو تین پھونکیں مارنے کے بعد اس نے غور سے پانی کی طرف دیکھا۔

”اور گونو گونو!“ عورت کی آنکھوں اور آواز دونوں سے ہی دہشت نمایاں تھی۔ اب اس نے پانی کا پالہ رکھ کر کافڈ اور پھسل اٹھالی تھی۔ اس کا نام اور تاریخ پیدائش پوچھنے کے بعد اب وہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی اور حساب لگانے کے بعد اس کا رد عمل پہلے جیسا تھا۔

”کیا ہوا؟“ مجھے بتائیں پلیز۔“ وہ جواب اپنے اعٹاکو کے لیے مشہور تھی اور اب اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”تم کبھی واپس نہیں جا پاؤ گی۔“ عورت کی آواز دہشت زدہ تھی۔

”یا اللہ۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

”صرف یہی نہیں تمہاری وجہ سے ڈوگون پہ کوئی مصیبت نازل ہوگی وہ مصیبت کیا ہے کچھ بتائیں۔“

وہ آنسو اس کے گالوں پہ بہہ نکلے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر آہستہ سے اٹھ گئی۔

”رکو“ میں تمہیں پانی دم کر کے دیتی ہوں۔“ اسے اپنے پیچھے عورت کی آواز سنائی دی پر وہ چپ چاپ چلتی رہی۔

”یا اللہ میری مدد کر۔“ مجھے واپس اپنے پیاروں میں پہنچا دے اور میرے دل کو سکون دے۔“ وہ بے آواز روئی اور بغیر لب لہائے دعا کرتی رہی۔

”رونے کے لیے دن تو بالکل اچھا نہیں ہے، لوگ اکثر سب سے چھپ کر رات کو روتے ہیں۔“

سون جاہ تو کی آواز پہ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بالکل اس کے پاس کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے وہ ”after Earth“ کے ہیرو جیسا لگا۔

”نہیں، شاید میں غلطی پر ہوں۔“ ہو سکتا ہے۔

مذہب لوگوں کو دن میں رونے کی عادت ہو۔“ کہتے ہوئے وہ بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے اس طنز پہ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ جن احساسات کا شکار تھی اسے طر محسوس ہی نہیں ہوا۔ سو وہ چپ چاپ کھڑی آنکھیں صاف کرتی رہی۔

”آپ لوگوں سے میرے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔؟“ اس کے چپ رہنے پہ سون جاہ ٹوٹنے پھر بات کی۔

”میں نے تو بس ایک عورت سے پوچھا تھا۔“ اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ جواباً اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”آئی ایم سوری!“ کہتے ہوئے اس نے کارڈ آگے کی طرف بڑھا دیا۔

”Accepted“ کارڈ کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کہیں بیٹھ سکتے ہیں۔“ اسے کھڑے ہونا محال لگ رہا تھا۔ وہ اسے لے کر ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے آگیا۔ جہاں ایک قدیم غرہ کی بڑی سی چارپائی پڑی تھی۔ اب تک ان کی ساری بات چیت اردو میں ہی تھی۔

”آپ یہاں کے نکلے نہیں ہیں۔“ اس نے کیمرہ انکار کر چارپائی پر رکھ دیا اور سینڈل انکار کر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔

”کیوں۔“ کیا میرا رنگ یہاں کے لوگوں سے تھوڑا سفید ہے۔“ طنز یہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ آ گئی۔

”میں نے نہیں خیال کیا کہ آپ کو ایک بات باز بارود ہرانی چاہیے۔“ جبکہ میں شرمندگی کا بھرپور اظہار کر کے معافی مانگ چکی ہوں۔“ اسے غصہ آیا اور اس نے اپنے تاثرات بالکل بھی نہیں چھپائے تھے۔

”مجھے ان لوگوں کی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے جو صرف کالے رنگ کی وجہ سے مجھے کمتر سمجھتے ہیں۔“

پچھلے سال میری شائع ہونے والی کتاب پر اعزاز کی تمغہ صرف اسی وجہ سے نہیں مل سکا کہ میں ”بلیک“ ہوں۔ میں نے اس کتاب کا لکھا ہوا اصل نسخہ ’جو کہ میری نگاہانی میں تھا۔“ نا تجرب دریا میں بھا دیا تھا۔“ دیکھ اس کی آواز سے ہی نہیں اس کے چہرے اور آنکھوں سے بھی عیاں تھا۔

”اللہ۔“ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن آپ کے نقوش یہاں کے لوگوں سے نہیں ملتے، میرا مطلب آپ کی ناک اور ہونٹ سولے نہیں ہیں اور نہ ہی آپ کی آنکھیں زرد ہیں۔“ اسے اپنا جواب جاننے کی جلدی تھی۔

”میری ماں انڈین تھی وہ سیاحت کے لیے یہاں آئی تھی اور یہیں کھو گئی، میرا باپ بتاتا ہے کہ وہ بہت پرے حال میں اسے ملی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی، شاید تمہارے جیسی ہوگی، میرے باپ کے اخلاق شرافت اور محبت نے اس کا دل جیت لیا اور اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔“ وہ آہستہ آہستہ اسے بتا رہا تھا۔

”میں نے سنا تھا کہ افریقہ کے لوگ وحشی اور آدم خور ہوتے ہیں، یہاں ایسا نہیں ہے، یہاں ان گلیوں میں مجھے بھوک فحشرت اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں ملا، مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ اس قبیلے کے سردار

ہیں۔ اگر میں سچ بتاؤں تو آپ کو سردار کے روپ میں دیکھ کر مجھے تھوڑی مایوسی ہوگی۔“

”اگر آپ ایک صدی پہلے آتیں تو شاید حال ویسا ہی ہوتا، مگر اب افریقی تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں، ڈوگون قبیلے میں چار لاکھ سے زائد افراد تھے، فرانس کی مداخلت نے انہیں وہاں سے اٹھ آنے پر مجبور کر دیا اور چند گھنٹے پہلے یہاں آباد ہو گئے۔ آپ کا فیاسی کیسا ہے؟“ بات کرتے کرتے اس نے اچانک پوچھا۔

”وہ ٹھیک ہے۔“

”مجھے آپ دونوں کا تعلق ایسا نہیں لگتا جیسا کہ ممکن شدہ جوڑے کا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب میں سمجھی نہیں۔“ اس نے حیران ہو کے پوچھا۔

”اس لڑکی کی طرف دیکھ رہی ہیں۔۔۔“ اس نے سامنے جاتی ہوئی ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو شاید کھینوں سے آ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت اور پسینے نے مل کر اس کا برا حشر کیا ہوا تھا۔

”ہاں دیکھ رہی ہوں۔۔۔“ لڑکی ان دونوں کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

”اس کی ممکنہ کو دو سال ہو گئے ہیں، وہ اپنے منگیتر کے بچے کی ماں بن چکی ہے ہو سکتا ہے شادی سے پہلے وہ ایک اور بچے کو جنم دے دے۔“ اس کا دل غ بھٹک سے اڑ گیا، غصے سے چہرہ جیسے انگارہ بن گیا ہو، کتنی غلط بات کہی تھی اس نے۔

”کون کہتا ہے کہ افریقی تھوڑے تہذیب یافتہ ہو گئے ہیں وہ اب بھی ویسے ہی ہیں۔ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں۔ شادی سے پہلے منگیتر کے دو تین بچوں کو جنم دینے کا رواج افریقہ میں ہو گا، پاکستان میں نہیں ہے، آٹھ زبانوں پر عبور حاصل کرنے کے بعد بھی آپ اتنی سی بات نہیں جانتے۔“ اسے غصہ آگیا تھا۔

”ایک منٹ۔“ آپ نے کہا کہ آپ مسلمان ہیں۔“ اس نے ایسے اطمینان سے پوچھا کہ جیسے اس کی باتوں کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔

”آپ کو شک کس لیے ہے؟“ اس نے کیمرہ زور



سے چارپائی پر بچکا جو اس نے ابھی اٹھایا تھا۔  
 ”معاذ اللہ بچے گا“ آپ مجھے مسلمان نہیں لگتیں  
 میں ایک سافٹ نام ہوں، مجھے بتانا نہیں پڑتا، پہلی نظر  
 دیکھتے ہی کوئی بہت کم سوچہ بوجھ رکھنے والا بھی جان  
 جائے گا کہ میں افریقی ہوں، وہ سامنے گدھا بندھا ہوا  
 ہے اسے بتائیں پڑھا کہ میں گدھا ہوں، آپ کے  
 معاملے میں شک اس لیے ہے کہ آپ کو بتانا پڑ رہا ہے  
 اور غضب نہ کہ بتانے کے بعد بھی یقین نہیں آ  
 رہا۔“ اس نے اپنی ہانی کی ٹائٹ جینز، سیلیوئس شرٹ  
 اور گلے میں لٹکتے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 کتنے ہی لڑکے اسے بے یقین نظروں سے دیکھتی  
 رہے۔ اس کا ایک ایک لفظ درست تھا۔ وہ حقیقتاً  
 لا جواب ہوئی تھی۔ پروہ ہارنے والوں میں سے نہیں  
 تھی۔

”جو بھی ہے، مجھے تم سے اپنے مسلمان ہونے کی  
 سند نہیں لینی میں تم سے ہر حال بہتر ہوں۔“  
 وہ سینڈل پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بد تہذیب  
 شخص سے دانا نہیں چاہتی تھی۔ جاتے جاتے اس  
 نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر گمراہ  
 دکھ اور تاسف تھا۔

”میری بلا سے تم جہنم میں جاؤ۔“ اس نے نفرت  
 سے ہنکارا بھر کے کہا اور تیز تیز قدموں سے چل دی۔  
 اس نے اٹھ میں پکڑے ہوئے کارڈ کو تاسف سے  
 دیکھا۔ عجیب لڑکی تھی وہ اور سوری کرنے کا طریقہ بھی  
 تو بہت عجیب تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنے کے لیے  
 لوگوں سے اس کا ہاتھ پوچھ رہی تھی اور جب اسے مل  
 گیا تو پہلے سے زیادہ بد مزہی کر کے چلی گئی۔ وہ سوچ کر  
 ہکا سنا سکر رہا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ اپنے باپ کی طرح  
 رحم دل اور خوش اخلاق نہ ہوتا۔

ہالی دن اس نے بہت بد دی سے گزارا۔ احسن اور  
 عبید کے ساتھ سارا دن کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ وہ ہر کا  
 کھانا بھی گولی کر رہا۔ گرم ہوا اور مٹی نے اس کی جلد پر  
 اثر کیا تھا۔ پر زیادہ اثر کاہنہ اور سون جاہ تو کی باتوں کا تھا۔  
 اس نے وہاں کے رہن سہن کو بغور دیکھا۔ ہر گھر میں دو

تین گنبد نما کمرے ضرور تھے ایک عورت سے پوچھنے  
 پر اسے پتا چلا کہ ایک گنبد نما کمرہ صرف مردوں کے  
 لیے مخصوص ہے جس میں وہ اپنا سامان رکھتے ہیں اور  
 وہ سر اور تولیہ کے لیے ہوتا ہے جس میں ان کا زیور اور  
 دوسری اس قسم کی اشیاء ہوتی ہیں اور اسی طرح کا ایک  
 کمرہ اناج کے لیے ہوتا ہے ایک گھر میں اس نے  
 کھڑی کی ایک صورتی دیکھی جو عورت کی تھی۔ اسی قسم  
 کی دوسری صورتیں وہ دوسرے گھروں میں بھی دیکھ  
 چکی تھیں۔ شاید وہ لوگ اس فن میں ماہر تھے۔  
 سارا دن وہ کاہنہ کی باتوں کو بھلانے میں لگی رہی۔  
 حقیقت تو یہ تھی کہ دل ہی دل میں وہ کئی بار اندھ کو پکار کر  
 دعا کر چکی تھی۔ اس نے گھروں کر کے اپنی خیریت کی  
 اطلاع بھی دی۔ اور شام کو تھک مار کر اپنی رہائش گاہ پر  
 پہنچ گئی۔ عبید اور احسن بھی آچکے تھے۔ کھانا کھانے  
 میں ابھی وقت تھا، سو اس نے چائے بنا کر ان دونوں کو  
 پیش کی۔

”تم نے کارڈ دے دیا تھا؟“ احسن نے پوچھا۔  
 ”ہاں! دے دیا تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر  
 کہا۔

”کیا ہوا؟ ٹھنڈی آہیں کیوں بھر رہی ہو۔ کیا اس  
 نے معافی قبول نہیں کی۔“ وہ شرارتی ہنسی ہنسا اور  
 جواب میں اس نے وہ ہر کا سارا واقعہ سنایا اور ہنسی کا  
 ایک فوارہ تھا جو ان دونوں کے منہ سے ابل پڑا۔  
 ”کیا چیز ہو تم ہنسی! قسم سے مل پڑا وہ بے یقین پیٹ  
 میں۔“ عبید نے کبھل کبھل ہنسی روک کے کہا۔ جواباً وہ  
 غصے سے ان دونوں کو گھورتی رہی۔

”تم نے آتے ہوئے کارڈ جھپٹ لیا تھا یا۔ اب  
 تمہیں رات کو بیٹھ کے پھر بتانا پڑے گا۔“ احسن کی  
 ہمدردی کی ایک ٹنگ کو وہ خوب سمجھتی تھی۔

”دوب مرو تم دونوں۔ اتنی پریشان ہوں میں اور تم  
 لوگوں کی ڈراے بازی نہیں ختم ہو رہی۔“ اس نے  
 سلگ کر کہا۔

”ویسے اس میں اتنے غصے والی کیا بات تھی ہم کہہ  
 دیتیں کہ پاکستان میں منگیتر اتنے ہی فریگ ہوتے ہیں

اتھ پکڑ کر آئی لو یو بول سکیں بس۔“ عبید نے  
 کلمے اچکا کر کہا۔  
 ”یہ بات تم بتانا اسے مجھے ضرورت نہیں ہے  
 اس کے منہ لگنے کی۔“  
 ”ہاں وہ بے چارہ کالا جو ہے۔“ احسن نے مدد  
 والا منہ بنا کے کہا۔

”شٹ اپ احسن!“ اس نے غصے سے کہا اور  
 احسن نے منہ پر انگلی رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ وہ اس کی  
 شرارتی آنکھوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ  
 کر وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ رات  
 کے کھانے کے لیے سوٹ منتخب کرنا تھا۔ اس نے پرل  
 گھر کی لمبی فراک جو کہ ٹخنوں تک آتی تھی نکال لی ہانڈ  
 ہارٹ دار تھی اور پورے تھے اس نے سوچ لیا تھا کہ  
 اب تک وہ یہاں ہے سیلیوئس نہیں پہنے کی۔ عبید  
 نے کہا تھا کہ وہ کھانے کے لیے خود ہی آجائیں گے کسی  
 مقامی کو نہ بھیجا جائے۔ وہ تیار ہو کے کچی دیوار کے  
 ساتھ ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ آسمان صاف تھا اور  
 چاند اٹھا ہوا تھا۔ سارے دن کا ایک ایک پل اس کے  
 ذہن پر نقش تھا۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں  
 سوچ رہی جب بھی وہ سوچتی ایک آہ کے ساتھ دعا اس  
 کے لبوں سے نکل جاتی۔ پتا نہیں قسمت میں کیا لکھا  
 تھا۔

”واؤ؟ ہنی یہ تم ہو۔ مجھے لگا کسی قدیم سلطنت کی  
 ہندوئی کھڑی ہے۔“ عبید کو روایتی کپڑوں میں وہ ہمیشہ  
 ہی متا چھٹی لگتی تھی۔

”ارے تم جارہی ہو۔“ احسن نے حیرانی سے  
 اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواباً اس نے سوالیہ  
 نظروں سے اسے دیکھا۔

”کیا کہے گا سردار کہ اس لڑکی کے منہ تو ناک ہی  
 نہیں ہے۔ رہنے دو تم میں تمہارے لیے تھوڑا سا  
 کھانا چوری کر لاؤں گا۔“ احسن نے چھیڑنے والے  
 انداز میں کبھل کبھل ہنسی روک کے کہا۔

”مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے اور اب اگر تم نے  
 اگلے صبح بھی کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔“

آج بھی حسب معمول انہیں ہمیشہ کی طرح احترام  
 کے ساتھ بٹھا کر کھانا چٹا گیا۔ سون جاہ تو کے آتے ہی  
 احسن نے ام ہانی کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ وہ غصہ  
 ضبط کر کے بیٹھی رہی۔ سون جاہ تو نے عبید اور احسن  
 سے ہاتھ ملایا اور سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔  
 وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کھانا شروع ہو گیا تھا۔ اس  
 نے گل کی طرح روٹی والی پلیٹ اٹھا کے اس کے سامنے  
 کر دی۔ اسے یاد تھا کہ گل اس نے کچھ اور نہیں کھلایا  
 تھا۔ ایسا کرنے پر احسن کے کھانے اور پھر گلاس اٹھا کر  
 پانی پینے کی حرکت نے اسے خوب تپ چڑھائی۔

احسن اور عبید سے وہ ان کے کام کے بارے میں  
 پوچھتا رہا پر اسے بالکل مخاطب نہیں کیا تھا۔ ایک دو بار  
 اس نے نظریں اٹھا کے اس کی جانب دیکھا تو اسے اپنی  
 جانب گہری نظروں سے دیکھتے پایا۔ دوبارہ اس نے  
 نظریں میز پر سے نہیں ہٹائیں۔ کھانے کے دوران وہ  
 ایسے پوز کر لی رہی جیسے اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ اور پھر  
 ایسے ہی پورے تین دن گزر گئے۔

ان تین دنوں میں اس کی ملاقات کھانے کے علاوہ  
 اس سے نہیں ہوئی۔ ہر مرتبہ کھانے کے موقع پر وہ  
 اسے سر کے اشارے سے سلام کرتا اور روٹی والی پلیٹ  
 جہاں بھی پڑی ہوتی اٹھا کے اس کے آگے رکھ دیتا اور  
 وہ تین بار بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ لیتا۔ سارٹینا  
 کی زبانی اسے سون جاہ تو کے بارے میں بہت کچھ  
 معلوم ہوا تھا۔ مثلاً ”یہ کہ وہ اپنے گھر میں اکیلا ہے۔  
 اپنے کھیتوں پر خود محنت کرتا ہے اور یہ بھی کہ سارٹینا  
 اس کے عشق میں مبتلا ہے۔ یہ بات سن کر وہ کافی دیر  
 ہنستی رہی۔

”تمہیں اس میں کیا نظر آیا جو تم اس سے محبت کر  
 بیٹھیں۔“ اس نے اپنے غصے سے پوچھا۔

”میں نے اسے اندر تک جان لیا ہے، کوئی بھی  
 عورت ایسا کرے تو اس سے محبت کیے بغیر نہیں رہ  
 سکتی۔“ بات کرتے ہوئے اس کے سیاہ ہونٹ  
 مسکراتے رہے۔

”اور اس نے تمہاری کو انکار کیا تھا اسے انکار کرنا



مردوں کے لیے مرجانے کے برابر ہے۔“  
 ”نمائنی کون ہے۔“ اسے حیرت ہوئی تھی کہ افریقہ میں بھی کوئی قاتل حسین ہے۔  
 ”نمائنی ایک خط لکھتا ہے، وہ ایک قدم چلتی ہے تو ہزاروں دلوں کی دھڑکن، بند کردا دیتی ہے۔ اب وہ مستقل طور پر مسٹر فرینک کے ساتھ ہے۔ سون جاہ تو کو دیکھ کر دل ہار بیٹھی تھی۔“ وہ بہت پیار سے اس کا نام لیتی تھی۔  
 ”وہ خود کو کیا سمجھتا ہے مجھے اس سے نفرت ہے ہو سکتا ہے وہ مشہور ہونے کے لیے عورتوں کو انکار کرتا ہو۔“

”اگر تم واقعی اس سے نفرت کرتی ہو تو مجھے تمہارے عورت ہونے پر شک ہے۔“ شاید اپنے محبوب کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرنا اسے برا لگتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔ اور پھر اس سے سواری بھی کی۔ پر صرف سارینا کے لیے وہ اس شخص کے بارے میں اچھا نہیں سوچ سکتی تھی۔ اسے واقعی سون جاہ تو سے نفرت تھی۔ ان کے جانے میں چار دن رہ گئے تھے۔

”میں مسٹر فرینک سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ایک ڈاکو مینٹری کے لیے۔“ کھانے کی میز پر اس نے جیسے اعلان کیا تھا۔  
 ”میرے نظریے کے مطابق وہ کوئی اچھا انسان نہیں ہے اور شاید وہ ڈاکو مینٹری بنانے کی اجازت بھی نہ دے۔“ ان تین دنوں میں شاید پہلی مرتبہ وہ اس سے مخاطب ہوا تھا۔

”اور میرے نظریے کے مطابق تو ڈوگون میں کوئی بھی اچھا انسان نہیں ہے اس کے سامنے میں یہی ظاہر کروں گی کہ میں میڈیا کے ذریعے بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح سے وہ ڈوگون کے لوگوں کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ پرنس میں فریج امپریل ازم کے نام سے دنیا کے سامنے لاؤں گی۔“ بات سن کر وہ ہلکا سا مسکرایا جبکہ احسن اور عبید نے سرائی نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”مسلمانوں کی مقدس کتاب میں عورتوں کے مکر کا

ذکر ہے۔“ مسکرا کر بات کرتے ہوئے وہ ہمیشہ کی طرح زہر لگا۔ احسن نے بمشکل اپنی ہنسی روکی تھی۔  
 ”ایک مسلمان نورسٹ نے مجھے یہ بات بتائی تھی“ لیکن مجھے یہ فارمولا سب عورتوں پر اپلائی نہیں کرنا چاہیے۔“ اس کے غصے سے دیکھنے پر وہ وضاحت دینے لگا۔ ”انڈاز ہنوز طنزیہ ہی تھا۔“  
 ”آپ صبح تیار رہیے گا، میرا گائیڈ آپ کو وہاں پہنچا دے گا۔“ اب کے اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے درمیان اور کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

عبید نے ساتھ جانے کا کہا مگر وہ نہیں ہائی۔ اس نے وعدے کے مطابق گائیڈ کو بھیج دیا تھا۔  
 ”آپ تھوڑا محتاط رہیے گا۔“ وہ بہت خزانہ آوی ہے۔“ گائیڈ نے اسے نصیحت کی تھی۔  
 ”بے فکر رہیں مسٹر میکا میں خزانہ لوگوں سے بہت اچھے سے پھنپتی ہوں۔“

”وش یو گڈ لک“ یہ گارڈ آپ کو ان کے آفس تک پہنچا دے گا آپ کے آنے کی اطلاع انہیں دے دی گئی تھی۔“ گائیڈ اسے چھوڑ کے ڈاکو چلا گیا تھا۔ گارڈ کے ہمراہ وہ مسٹر فرینک کے آفس تک آئی۔ سون جاہ تو وہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔

مسٹر فرینک چوٹی ٹاک والا سفید نام تھا۔ سون جاہ تو اور وہ ساتھ بیٹھے بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن کا کمرشل لگ رہے تھے۔ وہ سون جاہ تو سے بالکل مخاطب نہیں ہوئی اور رسمی جملوں کے بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”میں خوب صورت عورتوں کو انکار نہیں کرتا یا یوں سمجھ لیں کہ اتنی بہت مجھ میں نہیں ہے۔“ مسٹر فرینک نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس پر جما کے مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً وہ مسکرا دی۔ سارینا ٹھیک کہتی تھی۔ خوب صورت عورتوں کو انکار کرنا مردوں کے لیے شاید موت کے برابر ہے۔

”عورت میں بس ایک ہی خوبی ہونی چاہیے کہ وہ خوب صورت ہو اگر ایسا نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ

وہ مرجائے۔“ مسٹر فرینک نے بہت جذب کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سون جاہ تو کی طرف دیکھا جیسے اس سے تائید چاہ رہا ہو۔

”مرد میں بھی بس ایک ہی خوبی ہونی چاہیے کہ وہ مضبوط کردار کا مالک ہو اگر ایسا نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ وہ مرجائے۔“ سون جاہ تو کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے چبا چبا کر مسٹر فرینک کو جواب دیا اور پھر بہت طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ایک لمحے میں ہی اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ سون جاہ تو اپنی ہنسی روکنے یا پھر چھپانے کے لیے اوہرا دھڑکی رہا تھا۔

وہ سارا دن اس نے وہیں گزارا۔ فیکٹری کے ملازمین کی حالت بہت بری تھی۔ گدھوں میں اور ان میں شاید شکل و شہادت کا ہی فرق تھا۔ سون جاہ تو سارا دن تقریباً اس کے ساتھ ہی رہا۔ ناراضی کی شدت میں تھوڑی کمی آئی تھی۔ شام تک تھک ہار کر وہ وہاں سے نکلی۔ وہ اس کے ہمراہ تھا۔

”یہ بہت سمجھنا کہ تم سے دو چار باتیں کر کے میں نہیں اچھا سمجھنے لگوں گی“ میرے خیالات اب بھی تمہارے بارے میں ویسے ہی ہیں۔“ اس نے ساتھ چلتے ہوئے سون جاہ تو سے کہا۔

”کیسے؟“ چتا نہیں وہ ہمیشہ اس سے بات کرتے ہوئے مسکراتا کیوں تھا۔

”میں کہ تم اچھے ہو، جنگلی ہو اور بد صورت بھی۔“  
 ”شکریہ“ یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے ام ہائی؟  
 وہ قدم بالکل اسی کے برابر میں رکھ رہا تھا۔

”کیا؟“ یہ سارا کام...؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں نہیں کام نہیں، میرا مطلب یہ لڑنا جھگڑنا اور ایسے جواب دینا، دراصل مجھے مسٹر فرینک کی شکل یاد آگئی ہے۔“

وہ خوب دل کھول کر ہنسی اور جنتی دیر وہ ہنستی رہی وہ اسے دیکھتا رہا۔

”اے“ میزری سینڈل ٹوٹ گئی۔“ اس کی سینڈل ایک ایلہ سے پوری کھل گئی تھی اور زمین ابھی تک کافی

گرم تھی۔ گو کہ شام ہو گئی تھی اور وہاں مٹی بھی بہت تھی۔ پر اسے پتا تھا کہ یہ مسمان نواز بندہ اسے اپنا جوتا دے دے گا اور اس نے ایسے ہی کیا۔ ٹوٹے ہوئے سینڈل اس نے وہیں چھوڑ دیے۔ وہ بھاری مردانہ جوتا اس کے پاؤں میں بہت کھلتا تھا۔ مگر ہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔

”میں یہ سارینا کے ہاتھ بھیج دوں گی۔“ وہ کہہ کے آگے بڑھ آئی۔ وہ ابھی دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ایک بچہ دوڑتا ہوا آیا اور بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ لاغر، کمزور، سیاہ بچہ۔ اس کے بال چھوٹے اور ٹھنکھریا لے تھے۔ شاید وہ ایک عرصے سے نمایا نہیں تھا۔ بچے نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا جس میں کانڈ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کانڈ پکڑا اور اس کی واحد تہہ کو کھولا۔

وہ سطرین لکھی تھیں۔

وہ نہ سمجھ میں آنے والی کوئی زبان تھی۔ اس نے دو تین بار پڑھا پر اس کی بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ کانڈ بہت بوسیدہ سا تھا، لکھائی مازہ لگ رہی تھی۔ اس نے ارد گرد دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا وہ بچہ بھی نہیں۔ اس نے کانڈ کو تہہ کر کے کچل میں رکھا اور اندر داخل ہو گئی۔

رات تک وہ اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پر بے سود۔ اس بات کا تذکرہ اس نے عبید اور احسن سے نہیں کیا۔ البتہ انہیں ہمیشہ کی طرح سارے دن کی روداد ضرور سنائی تھی۔

”مسٹر سون جاہ تو کہاں ہیں...؟“ کھانے کی میز پر بیٹھتی ہی اس نے ملازم سے پوچھا۔

”وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں گئے ہیں، امید ہے آپ کے کھانا شروع کرنے سے پہلے آجائیں گے۔“

”کیا میں ان کا گھر دیکھ سکتی ہوں...؟“ اس نے پوچھا۔



”جی میڈم ضرور۔ آئیں میرے ساتھ۔“ ملازم  
بست مودب تھا۔  
”نہیں“ میں اپنے طور پر دیکھنا چاہتی ہوں میرا  
مطلب اکیلے۔“ اس نے ملازم کو منع کیا۔  
”میں بھی ساتھ آتا ہوں ہئی!“ عبید کھڑا ہو گیا۔  
”نہیں“ ہم حسن کے ساتھ رکوس میں بس تھوڑی  
دیر میں آئی۔ وہ کہہ کر جلدی سے نکل آئی۔ اسے  
یقین تھا کہ کفن کا وہ کٹڑا اسی کی طرف سے بھیجا گیا  
ہے۔ مگر میں واقعی کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے  
کمرے میں داخل ہوئی شاید وہ کچن تھا۔ وہاں بڑے  
برتن چولہا اور کونکوں کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا تھا۔  
اس نے آہستہ سے کونکوں کو ہاتھ لگایا وہ ٹھنڈے ہو  
چکے تھے۔ اس نے ایک کونکہ اٹھا کر کچن دیوار پر

I hate you Mr. Othello

لکھ دیا (میں تم سے نفرت کرتی ہوں مسٹر او تھیلو)  
ایسا کرنا کالی اچھا لگا تھا۔ پھر وہ سرے کمرے میں آئی۔  
وہ شاید اس کا اسٹڈی روم تھا۔ دیوار کے اندر ہی کچی  
اینٹوں کی ایک الباری بنائی گئی تھی جس میں کتابیں  
نفاست سے چنی گئی تھیں۔ اس نے کتابوں کو الٹ  
پلٹ کر دیکھا اور ایک کتاب کھینچ کر نکالی۔ اس نے  
ٹائٹل پڑھا۔ کتاب کئی بوسیدہ اور پرانی تھی۔ رائٹر کا  
نام بھی تھوڑا پیچھے کر کے لکھا تھا ”Degal“  
Arim ”اور سن اشاعت 1854ء تھا۔ ایک لمحے  
کے لیے اسے لگا کہ وہ کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
کے بارے میں ہے۔ پر وہاں تو کوئی بھی مسلمان نہیں  
تھا۔ اس کا جتنس عروج پہنچ گیا تھا۔ اس نے کتاب  
واپس اس کی جگہ پر رکھ دی۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر لکڑی کی میز  
کے نیچے پڑے ہوئے ایک چھوٹے سے پاکس کی  
طرف گئی۔ اس نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ پاکس  
نکل لیا۔ پاکس کالی پرانا تھا اور اس میں تالا نہیں تھا۔  
پاکس کا ڈھکن اٹھاتے ہی اسے حیرت کا ایک شدید  
جھٹکا لگا۔ اندر اس کے ٹوٹے سینڈل تھے ان پر مٹی کی  
ایکس باریک سی تہ بھی نہیں تھی۔ جبکہ اتارنے وقت

اس نے دیکھا تھا کہ وہ بہت زیادہ گرو آلود تھے۔ اس کا تو  
میں مطلب تھا کہ انہیں بہت اچھے طریقے سے صاف  
کر کے رکھا گیا ہے۔ وہ دو تین لمحوں تک حیرانی سے  
انہیں دیکھتی رہی اور پھر انہیں دوبارہ پاکس میں رکھ کر  
پاکس میز کے نیچے کر دیا۔ اب اس نے لکڑی کی میز کی  
واحد دراز کو کھولا۔ اندر کچھ کفن ذات تھے۔ کفن ذات کو  
الٹ پلٹ کرتے اس کے ہاتھ ”سوری“ کا وہ کارڈ لگا جو  
وہ اسے دے چکی تھی۔ مگر وہ ہرگز ایسا نہیں تھا جیسے دیا  
گیا تھا۔ اس پر انگلیش میں ”ام ہائی“ اتنی مرتبہ لکھا تھا  
جتنی مرتبہ لکھا جاسکے۔ اس کارڈ پر کوئی بھی جگہ ایسی  
نہیں تھی جہاں اس کا نام نہیں لکھا تھا۔ حیرانی سے اس  
کارڈ کو دیکھتے ہوئے اس نے کئی پہلوؤں پر سوچا ”کیا؟ اور  
کیوں؟“ اس کے سامنے وہ سوال تھے۔ کئی لمحوں تک  
وہ الٹ بھی نہیں سکی تھی۔ اچانک قدموں کی چاپ  
ابھری۔ اس نے جلدی سے کارڈ رکھ کر دراز بند کی اور  
اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کوئی ملازم تھا جو آگے بڑھ گیا تھا۔

اچھے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ واپس کھانے کی میز  
پر آگئی۔ سون جاہ تو ابھی نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے  
ناثرات نارمل رکھے اور عبید کے ساتھ ہاتوں میں  
مشغول ہو گئی۔ مگر دل کے اندر جیسے جھکڑ چل رہے  
تھے۔ جو بھی ہوا تھا یا ہونے جا رہا تھا وہ بالکل ٹھیک  
نہیں تھا۔ کم از کم اسے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔  
”مسٹر سون جاہ تو آج کھانے پر نہیں پہنچائیں گے“  
وہ آپ سب سے معذرت خواہ ہیں۔“ ملازم کے  
اظہار دیکھنے پر ان لوگوں نے کھانا شروع کر دیا۔ مگر وہ تو  
کہیں اور چپٹی ہوئی تھی۔ عبید نے اسے ایک دوبارہ نوکا  
کہ ٹھیک سے کھاؤ۔ احسن اس کا مذاق اڑاتا رہا کہ  
روٹی سامنے نہیں رکھی گئی۔ اس وجہ سے وہ برا مان گئی  
ہے۔ وہ رات بہت عجیب گزری تھی۔ سوتے جاتے  
اس نے کئی مرتبہ ان سب واقعات کو سوچا تھا۔

صبح وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھی۔ اسے تسلی تھی  
کہ واپس جانے میں صرف دو دن ہیں۔ دو دن سے

کل کر وہ ایک ہی گلی مڑی ہوگی کہ سامنے سے وہ آتا  
دکھائی دیا۔ وہ وہیں ٹھنک کر روک گئی۔ رات ہونے  
والے انکشافات اتنے معمولی نہیں تھے کہ ذہن سے  
بخو ہو سکتے۔

”میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا۔“ اس نے  
مسکراتے ہوئے کہا۔

ام ہائی نے پرسوج نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔  
وہ اسے ہمیشہ آپ کہتا تھا۔

”کیوں خیریت...؟“ اس نے جان بوجھ کے لمبے کو  
دیکھا کیا۔

”نہیں خیریت نہیں ہے۔“ مسکرا کر جواب دیتے  
ہوئے اسے ہز ہز لگا۔

”کیوں... کیا قیامت آگئی ہے؟“ ام ہائی نے سوچ  
لیا تھا کہ وہ اسے لٹٹ نہیں کرواتے گی۔

”ہائو“ قیامت ہی آگئی ہے۔“ اس کی ہنسی ہنوز  
پر قرار تھی۔

”جلدی بولو میرے پاس وقت نہیں ہے اور اب  
دائرت اندر کر کے بات کرنا مجھ سے۔“ اس نے پہلے  
واسلے انداز میں ہی کہا تھا۔

”میں یہاں کا سردار ہوں اور مجھے نہیں لگتا کہ  
مہمان نوازی میں میں نے کوئی کوتاہی کی ہے، تمہیں  
مجھ سے تھوڑا تو عزت سے پیش آنا چاہیے۔“ وہ ایک  
دم ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”میں نے کہا ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے“  
اس نے بے ہمت ہو گا کہ آنے کا مقصد بیان کر دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ چلو، تمہیں کچھ دکھانا  
ہے۔“ وہ جیسے سمجھ گیا تھا کہ اس کا موڈ ٹھیک نہیں  
ہے۔

”مثلاً؟“ وہ بالکل متوجہ تھی۔

”کہانا کہ بتانے والی چیز نہیں ہے صرف دکھانے  
والی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے چل پڑا اور وہ اس کے پیچھے

چل دی۔ شاید وہ خود بھی اسے کھوجنا چاہتی تھی۔  
اس نے اس میں ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوتی

گی۔ اب وہ تاجر بندی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔

ام ہائی نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔  
”یہ دیکھو یہ میری بوٹ ہے اچھی ہے نا؟“ اس  
نے کشتی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

”جلدی آؤ۔ لاؤ ہاتھ دو۔“ بیٹھ کر اس نے اپنا  
ہاتھ اس کی طرف بڑھایا وہ حیرت کی تصویر بنی اسے  
دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ اس کے  
ہاتھ میں دے دیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”یہ میں نے مسٹر فرینک سے خریدی تھی۔ بوٹ  
نے ایک پچھلا سالیا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔

”تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو۔“ ام ہائی نے وہی  
سوال کیا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔

”تھوڑی دیر میں پتا چل جائے گا۔“ اس نے  
بوٹ کی رفتار سیٹ کرتے ہوئے کہا مٹی گیراب

نظروں سے اونچل ہو گئے تھے۔ وہ کالی آگے تک آ  
گئے تھے۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے

غلطی کی ہے۔ وہ ایک سیاہ فام پر کیسے بھروسہ کر سکتی ہے۔  
اور عبید اور احسن کو بھی نہیں پتا کہ وہ اس کے ساتھ

ہے۔ ارد گرد سمندر کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ  
رونے والی ہو گئی۔

”بوٹ واپس موڑو، ابھی اسی وقت۔“ اس نے  
سون جاہ کو کاندھا زور سے ہلایا۔

”مسٹر جانس۔ میں کہہ رہی ہوں، ابھی بوٹ کو واپس  
موڑو۔“ اس نے اب کی بار زور سے کہا۔

”اب بس تھوڑی دیر میں پہنچنے ہی والے ہیں۔“  
اس نے پیچھے مڑ کے اس اطمینان سے جواب دیا کہ

اسے آگ لگ گئی۔ وہ کتنی پریشان تھی اور پیسے اس کا  
دل چاہا کہ کوئی چیز اٹھا کے اس کے سر پر مارے۔

”کیا تم بہرے ہو۔ میں تمہارا حشر برا کر دوں گی۔“  
ام ہائی کے لیے غصہ ہمیشہ ناقابل برداشت ہوتا تھا۔

”ہش!“ سون جاہ تو نے منہ پہ انگلی رکھ کے اسے  
چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”گھٹیا انسان! تم پر بالکل بھی کسی کی بات کا اثر  
نہیں ہوتا، میں تمہیں...“ الفاظ اس کے منہ میں ہی

تھے کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اسے دونوں ہاتھوں



سے پکڑ کے پانی میں لٹکا دیا۔ اس کے چہرے پر پانی کو چھو رہے تھے اور پرجا جلد ٹخنوں سے اوپر تک گیلیا ہو گیا تھا۔

”اب تم تھوڑی تمیز سیکھ جاؤ گی۔“ سون جلا تو کی آواز اس کی حیران سماعتوں سے گبرائی۔ وہ ابھی تک بے یقینی کی حالت میں تھی کہ وہ اسے کمری ندی میں گرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

”تم واقعی افریقہ کے بد تمیز اور بد صورت وحش ہو۔“ ہنسنے سے کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے اس کے ہاتھوں پر جمالیے کہ کہیں وہ واقعی چھوڑ نہ دے۔

”تم باز نہیں آؤ گی۔“ کہتے ہوئے سون جلا تو نے اس کا ایک ہاتھ چھوڑ دیا پورے جسم کا وزن اب صرف ایک باز پر تھا جس میں مسلسل کھینچاؤ پڑ رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں تک ندی کے اندر تھیں۔ وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

”تمہارا سفید گوشت اور تازہ خون یہاں کی شارک مچھلیوں کو بہت پسند آئے گا۔“ سون جلا تو نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی چھوڑنا چاہا مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”نہیں پلیز۔۔۔ آگ سردی پلیز۔۔۔“ وہ رد پڑی تھی اس کا رشتہ دیکھنے سے پھسل کر ندی میں گر گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی ورنہ وہ پشہ پکڑ لیتی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر بھیج کر اوپر کر لیا۔

”مم۔۔۔ میرا وہ پشہ۔۔۔“ اس نے روتے ہوئے دوپٹے کی طرف اشارہ کیا جو ندی میں بہا جا رہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ تم دوپٹے کا استعمال کون سا کرتی ہو؟ ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اطمینان سے جواب دیتے ہوئے اس نے پھر سے سیٹ سنبھالی تھی۔

”مجھے نہیں پتا مجھے وہ پتا چاہیے جب میں واپس جاؤں گی تو سب کیا کہیں گے؟ مجھے وہ پتا چاہیے بس۔“ اب وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بوٹ واپس موڑ لی۔ دوپٹے کے پاس پہنچ کر ایک لمبی سی چھڑی سے دوپٹا اٹھایا اور چھڑی اس کی طرف

برسادی۔

اس نے چپ چاپ وہ پشہ اتار کے اپنے ارد گرد لپیٹ لیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ پشہ۔۔۔ رشتہ کی مانند اس کے گلے سے لپٹا تھا۔ سون جلا تو اس کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس کی بوٹ کافی آرام دہ تھی۔ سورج پوری طرح نکل کے اب ندی کے پانی کو چمکا رہا تھا۔ کافی آگے تک جا کے اس نے رفتار دھم کر لی تھی۔ اس نے بوٹ کو کنارے کے ساتھ لگایا اور باہر نکل آیا۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ بوٹ کو باندھ کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ چپ چاپ ہاتھ پکڑ کر بوٹ سے باہر نکل آئی۔ کیمو اس کے گلے میں تھا اور سونج دوسرے ہاتھ میں۔ اس کا سیشلائٹ موبائل رہائش گاہ پر ہی رہ گیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے چلتا گیا۔ ام ہانی نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ سامنے ایک چھوٹی سی کھنڈر نما عمارت تھی۔ وہ اسے لے کر وہاں چلا گیا۔ شاید وہ کوئی قدیم مندر تھا۔ سون جلا تو نے اسے وہاں بے چہرے پر بٹھایا۔

”ہانی۔۔۔ اگر میں تمہاری مورتی بنا کر یہاں رکھ دوں تو لوگ تمہیں حسن کی دیوی سمجھ کے پوجنا شروع کر دیں گے۔“ اس کی اتنی جامع تعریف کہیں کسی نے نہیں کی تھی۔

”مجھے کیا دکھانا چاہتے تھے۔۔۔؟“ اس نے اپنی تعریف کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

وہ ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں مندر کا غیر ضروری سامان تھا۔ وہ وہاں سے کچھ نکل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اپنے ہاتھ اس کے سامنے کر دیے اس کے ہاتھ میں قرآن پاک کا بہت ہی پرانا نسخہ تھا۔ وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ اس کی جلد نہیں تھی۔ اور رات اتنے خستہ ہو چکے تھے کہ ہاتھ لگاتے ڈر لگ رہا تھا۔ اس نے قرآن پاک سے نظریں اٹھا کر سون جلا تو کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چمک رہی تھیں اور ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ وہ آہستہ سے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کتنی دیر وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ وہ بہت پیار

سے قرآن پاک کے اور رات پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

”تم نے کب اسلام قبول کیا؟“ کافی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تھی۔

”دس سال پہلے جب میں بیس سال کا تھا۔ مسلمان یہاں سیاحت کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے اسلام کے بارے میں بتایا۔ میں حیران تھا کہ کوئی ایسا مذہب بھی ہے جسے میرے رنگ، نسل سے کوئی فرق نہیں پڑے۔ گد اسلام کی محبت میرے دل میں پیدا ہوئی اور میں اس کی رحمت میں آ گیا۔“ اب وہ باقاعدہ رو رہا تھا۔

”اور یہ قرآن پاک۔۔۔ اس کے صفحات تو بہت خستہ ہو رہے ہیں۔“ ام ہانی نے قرآن پاک کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”یہ بھی دس سال پرانا ہے، جب بھی ہمارے غلامتے میں مسلمان آتے ہیں تو میں دعا کرتا ہوں کہ ان کے پاس قرآن پاک ہو مگر دس سالوں سے ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔“ سون جلا تو نے اسے پانی پانی کر دیا تھا۔ ان کے گھر میں کتنے ہی قرآن پاک غلاموں میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ بس کبھی کبھار ہی کھلتے تھے۔ کسی کی وفات کے موقع پر۔ وہ حقیقت میں نظریں نہیں اٹھاتا رہی تھی۔

”میں نے ابھی اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ مگر بہت جلد میں ایسا کر دوں گا۔ پھر میں چوری چھپے نماز نہیں پڑھا کروں گا۔ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنواؤں گا اور ترجمے والا قرآن پاک منگواؤں گا۔ میرے پاس دعاؤں کے دو ورق بھی ہیں۔ میں انہیں صبح شام پڑھتا ہوں۔“ آنسو اب اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

”تم نے عربی پڑھنا اور نماز پڑھنا کہاں سے سیکھا؟“ ام ہانی نے اس کے آنسوؤں سے تر چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ لب کجی تھی کہ وہ اتنا مذہب کیوں ہے۔

”یہاں مسلمان سیاح آتے رہتے ہیں۔ اور میں ہر مسلمان سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ ہاتھ سے آنسو صاف کیے۔

”تم نے مجھ سے کیا سیکھا۔۔۔؟“ ام ہانی کو یقین تھا کہ وہ کے گا کہ کچھ بھی نہیں۔

”تم نے مجھے پیار کرنا سکھایا ہانی۔“ سون جلا تو نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایسے اچھلی جیسے بچھوٹے ڈنک بارا ہو۔ اتنے کھلے انداز میں اظہار تو عیب کے علاوہ کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ اس کے اس طرح اچھلنے پہ وہ تھوڑا سا ہنسنا مگر ہاتھ نہیں ہٹایا۔

”اسلام لانے کے بعد تم میری زندگی میں رونما ہونے والا دوسرا اتحاد واقعہ ہو۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر پھر سے آنسو صاف کیے۔ وہ بہت شکست خوردہ لگ رہا تھا۔

”تم وہ واحد لڑکی ہو جو مجھے ہر روپ میں اچھی لگتی ہے روتے، ہنستے، بیچتے، چلاتے، غصہ کرتے، میں نے تمہیں ہر روپ میں دیکھا ہے اور پھر تمہارے ایک ایک روپ کو سوچا ہے۔ مجھے پتا ہے یہ سب باتیں میری اوقات سے بڑھ کر ہیں، میں کتاب اللہ کو ہاتھ میں لے کر تمہیں پڑھتا کرتا ہوں۔“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز زندہ تھی۔ وہ پھر کے مجسمے کی طرح ساکت و جامد تھی۔ پچھلی آنکھوں سے وہ اس کی جانب پلک جھپکے بنا دیکھ رہی تھی۔ قرآن پاک اس کے ہاتھ میں تھا وہ کچھ بھی جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ میں تمہارے بغیر رہوں گا تو مر جاؤں گا۔ یہ صرف جملہ نہیں ہے، یہ دیکھو میرے ہاتھ میں مقدس کتاب ہے، مجھے شروع سے لے کر آج تک تمہاری کمی ہوئی ایک ایک بات یاد ہے، مجھے پتا ہے کہ ایسا صرف خواب میں ہی ہو سکتا ہے، تم مجھے اپنے۔۔۔ رب پر بہت بھروسہ ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ ہونٹ نیچے اُسے دیکھتی رہی اور اس کی باتیں سنتی رہی۔

”میں روزانہ یہاں آ کے نماز پڑھتا تھا اور دعا کرتا تھا کہ تم میرے دل، دماغ سے نکل جاؤ۔ اس جگہ یہ پہلے میں صرف اللہ اور اس کی محبت کو پکارتا تھا، تم میری وہ سری پکار ہو۔“ ضبط کے باوجود آنسو اس کی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں ایپوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کرنے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

”تم نے مجھے جواب نہیں دیا کہ میں جانتا ہوں مگر تم اپنے منہ سے کہہ دو تو شاید مجھے کوئی آس نہ رہے۔“ وہ بھی اٹھ گیا تھا۔

”میں بستی میں پہنچ کر تاروں کی بجائے تھوڑا سوچنے دو۔“

”تم میری امیدوں کو برباد کر رہی ہو۔“ وہ عجیب سی مایوسی سے مسکرایا۔

”کیا میں بوٹ کے پاس پہنچنے تک تمہارا ہاتھ پکڑ لوں۔“ سون جاہ تو کالجی امتیاز تھا وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی اور پھر ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے اس نے تھام لیا۔

”تمہارے ساتھ ایسے چلنا گویا ساری کائنات کو منہ میں لے کر چلنا ہے۔“ وہ پھر سے دکھ بھرے انداز میں مسکرایا۔ ایک لمحے کے لیے ام ہانی کا دل کیا کہ وہ اسے ہنسنے سے روک دے۔ عجیب مایوسی اور بے بسی تھی اس کی ہنسی میں وہ جب بھی ہنستا اس کا دل دھکتا۔

وہ سارے راستے ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوئے تھے۔ سون جاہ تو کبھی کبھار اس کی طرف دیکھ لیتا۔ سارا سفر ایسے ہی گزرا تھا۔ بستی میں پہنچ کر اس نے اپنا کمرہ اور کچھ اٹھایا اور بوٹ سے باہر آئی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“ جب وہ رہائش گاہ کے قریب پہنچ گئے تو سون جاہ نے پوچھا۔

”میں انکار کرتی ہوں۔“ ام ہانی نے زمین کی جانب نظریں کر کے کہا تھا۔ وہ اس کے جواب سے باخبر تھا مگر پھر بھی انکار نے جیسے اسے بکھیر دیا تھا۔

”تم نے یہ بات مجھے وہاں کیوں نہیں بتائی؟“ سون جاہ تو کے ایک ایک لفظ میں درد تھا۔

”مجھے لگا اگر میں وہاں انکار کر دوں گی تو تم مجھے نا بھجور دیں گے۔“ وہ جواب دے کر آگے بڑھ آئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

”تم نے مجھے جواب نہیں دیا کہ میں جانتا ہوں مگر تم اپنے منہ سے کہہ دو تو شاید مجھے کوئی آس نہ رہے۔“ وہ بھی اٹھ گیا تھا۔

”میں بستی میں پہنچ کر تاروں کی بجائے تھوڑا سوچنے دو۔“

”تم میری امیدوں کو برباد کر رہی ہو۔“ وہ عجیب سی مایوسی سے مسکرایا۔

”کیا میں بوٹ کے پاس پہنچنے تک تمہارا ہاتھ پکڑ لوں۔“ سون جاہ تو کالجی امتیاز تھا وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی اور پھر ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے اس نے تھام لیا۔

”تمہارے ساتھ ایسے چلنا گویا ساری کائنات کو منہ میں لے کر چلنا ہے۔“ وہ پھر سے دکھ بھرے انداز میں مسکرایا۔ ایک لمحے کے لیے ام ہانی کا دل کیا کہ وہ اسے ہنسنے سے روک دے۔ عجیب مایوسی اور بے بسی تھی اس کی ہنسی میں وہ جب بھی ہنستا اس کا دل دھکتا۔

وہ سارے راستے ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوئے تھے۔ سون جاہ تو کبھی کبھار اس کی طرف دیکھ لیتا۔ سارا سفر ایسے ہی گزرا تھا۔ بستی میں پہنچ کر اس نے اپنا کمرہ اور کچھ اٹھایا اور بوٹ سے باہر آئی۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“ جب وہ رہائش گاہ کے قریب پہنچ گئے تو سون جاہ نے پوچھا۔

”میں انکار کرتی ہوں۔“ ام ہانی نے زمین کی جانب نظریں کر کے کہا تھا۔ وہ اس کے جواب سے باخبر تھا مگر پھر بھی انکار نے جیسے اسے بکھیر دیا تھا۔

”تم نے یہ بات مجھے وہاں کیوں نہیں بتائی؟“ سون جاہ تو کے ایک ایک لفظ میں درد تھا۔

”مجھے لگا اگر میں وہاں انکار کر دوں گی تو تم مجھے نا بھجور دیں گے۔“ وہ جواب دے کر آگے بڑھ آئی اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔









ساتھ وہاں موجود تھے۔ ان دونوں کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے تھے۔ وہ سارے راستے روتی گئی اور اب وہ دونوں ایمر جنسی میں تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد احسن بوکھلایا ہوا ہسپتال پہنچا تھا۔ احسن کی ڈھیروں تسلی دینے پہ بھی وہ ویسی ہی رہی، بند کمرے میں عبید کے ساتھ کیا ہو رہا تھا اسے خبر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کمرے سے نکلا تھا۔ وہ سفید فام تھا۔

”سارک ہو! آپ کا مریض خطرے سے باہر ہے۔“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ ”تک کون سا مریض۔؟“ ام ہانی نے دل تھام کر پوچھا۔

”ایشین۔“ ڈاکٹر کی آواز نے اسے خوش خبری سنائی، وہ جسے مر کے زندہ ہوئی تھی۔ وہ بیھاگ کر عبید کے روم میں پہنچی۔ اس کی حالت خراب تھی پر وہ ہوش میں تھا، اسے دیکھ کر وہ زار و قطار رونے شروع ہو گئی۔

”ہنی! کچھ نہیں ہو گا، ہم کل واپس چلے جائیں گے۔“ عبید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

اس بات پر اس نے سسکی لی۔ وہ اسے کیا جانتی کہ اپنا آپ رہن رکھو! کے اس کی جان بچائی گئی ہے۔ یہاں ہمیشہ کے لیے رہنے کا خیال اسے بے موت مار رہا تھا۔ نجوی اور کاہنہ ٹھیک تھے وہ کبھی پاکستان نہیں جا سکتی تھی، مہی، ایلا، عبید ان سب کو چھوڑنا تھا بلکہ بھولنا تھا، کاش عبید کی جگہ یہ سانپ نے اسے دسا ہو۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے، سون جاہ تو کی حالت اسی طرح خراب تھی۔ پارہ بجے کے قریب ڈاکٹر نکلا اور کہا کہ مریض ام ہانی کو بلا رہا ہے۔ پتا نہیں اب اسے کیا کہنا تھا۔ وہ سوچتے ہوئے اس کی طرف بڑھ گئی۔ بیڈ پر لیٹا سون جاہ تو اسے صدیوں کا بیمار لگا۔ اس نے اشارے سے ام ہانی کو اپنے پاس بلایا اور پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میرا وعدہ دو مرتبہ وائش ہو چکا ہے، پھر بھی ڈاکٹر ز برامید نہیں ہیں، اگر میں مر گیا تو تم اس وعدے سے آزاد ہو۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے وہ خود بھی روتی۔

”مجھے پتا ہے، اب تم میرے مرنے کی دعا کرو گی۔“ وہ پھر وہی درد بھری آہی بولا۔

”تم دنیا کی سب سے خوب صورت اور اچھی لڑکی ہو، تمہارے ساتھ اس دھول مٹی میں رہنا میرے لیے جنت میں رہنے کے برابر ہو گا، میری ہر گزرتی سالس تمہارے پیار میں اضافہ کر رہی ہے، تم اگر پرانہ مانو تو یہیں میرے پاس بیٹھی رہو۔“ آنسو برابر اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔

”مجھے عبید کے پاس رکنا ہے، میں دوبارہ آؤں گی۔“ وہ بھی روتے ہوئے اٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا تھا سون جاہ تو مر جائے تو اسے نجات مل جائے گی مگر پتا نہیں کیوں اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل منٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔ دل میں عجیب سا درد اٹھا تھا۔

”ان کے پاس صرف چند سانس ہیں، وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔“ ڈاکٹر کی آواز پہ وہ چونکی تھی، وہ خود بھی اپنے احساسات سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ بیھاگ کر اس کے پاس آئی تھی وہ واقعی مرنے والا تھا۔ ام ہانی نے اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرا۔

”ہانی! وعدہ کرو، اچھی مسلمان بن کے زندگی گزارو گی۔“ تو نے پھولے الفاظ میں سون جاہ کو بولے کہا۔

”میں وعدہ کرتی ہوں۔“ وہ زار و قطار روتی تھی۔ ”ایک بار کہہ دو کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔“ ”میں تم سے واقعی پیار کرتی ہوں جاہ!“ مسلسل روتے سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ پہلی مرتبہ کسی کو مرنے دیکھ رہی تھی۔

”ہانی! مجھے کلمہ پڑھاؤ۔“ سون جاہ تو کے کہنے پر اس نے آہستہ سے اسے کلمہ پڑھایا، وہ چند لمحے اسے تکیا رہا۔ زہرا اس کی رگ رگ میں پھیل گیا تھا۔ وہ مسلسل روتے ہوئے اس کا ہاتھ دیا رہی تھی اور وہ سراپا تھا اس کے چہرے پر پھیر رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا مگر پلکیں نہیں جھپک رہا تھا۔

”سون جاہ!“ ام ہانی نے اسے جھنجھوڑا، وہ اپنی زندگی میں اتنا کبھی نہیں روتی تھی۔ وہ ویسے ہی پھرائی

آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چیخوں نے ہسپتال سرے اٹھا لیا تھا۔

”میڈم! اٹھ جائیں یہاں سے پلیز۔“ ایک سفید فام ڈاکٹر نے سون جاہ تو کی آنکھیں بند کیں اور اسے اٹھنے کے لیے کہا۔ وہ جیسے نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔

صبح کے قین بجے تھے۔ اس نے احسن سے کہا۔ ”سون جاہ تو مسلمان تھا، اس کی نماز جنازہ پڑھائے۔“ ”ہمارے پاس کفن نہیں ہے ام ہانی!“ احسن بھی بہت غم زدہ تھا۔

”میرا واسٹ کائن کا سوٹ ہے، وہ میں نے نہیں پہنا، اس کا دھپنا۔“ وہ ابھی بھی روتی تھی۔ پھر وہ لوگ اس کی ڈیڈ باڈی کو لے کر قبیلے میں واپس آ گئے۔ قبیلے کے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ وہ خود بھی سب سے نظریں چراتی آنسو بہا رہی تھی۔ کچھ مقامی سیاہ فام کو اس کے مسلمان ہونے کا علم تھا، انہوں نے اس کی قبر کھودی، احسن نے اسے غسل دیا تھا اور پھر اسے ام ہانی کے سفید کائن کے روئے میں لپیٹ کر قبر میں اتار دیا گیا۔ عبید ٹھیک نہیں تھا مگر اس نے خند کر کے نماز جنازہ میں شرکت کی تھی۔ پانچ بج گئے تھے، انہیں نوبت کے یہاں سے نکلنا تھا۔

وہ عبید اور احسن کو رہائش گاہ پہ چھوڑ کے خود سون جاہ کو لے گھر آ گئی۔

”اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ پائے گی، ساری دنیا پھان لینے کے بعد بھی۔“ اس خیال نے اسے پھر سے مرنے لایا تھا۔

اس کے اسٹڈی روم سے ام ہانی نے اپنا کارڈ اٹھایا اور اس کی اور بجلی راتنگ میں کچھ لوراق ڈھونڈنے پر اسے دعاؤں کے وہ ورق بھی مل گئے جنہیں وہ روز پڑھتا تھا۔ یہ چند چیزیں اٹھا کے وہ واپس آ گئی۔

”میں نے کہا تھا کہ تم ڈوگون پہ مصیبت لے کے آؤ گی۔“ یہ کاہنہ کی آواز تھی وہ روتی تھی۔

”اس نے تمہارے لیے یہ سب کیا، نہ جانتا تھا کہ وہ اپنی بچ پائے گا ممبر (کوبرا) کے زہر سے بچاؤ کا بس یہی

ایک طریقہ ہے مگر بچا لے والا خود مر جاتا ہے۔“ کاہنہ کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

”وہ جانتا تھا کہ اس طرح سے وہ خود مر جائے گا، پھر بھی اس نے یہ سب کیا؟“

اس بات نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ اس نے واقعی پیار کا حق ادا کیا تھا۔

سارے راستے وہ بڑے بڑھ کے ہنستی رہی۔ وہ اسے کسی بھی طرح سے نہیں بھول رہا تھا، پاکستان پہنچتے ہی سارے اس سے ملنے آ گئی۔ کئی ہی دیر وہ اسے گلے لگائے کھڑی رہی۔

”شکر ہے، تم ٹھیک ٹھاک واپس آ گئی ہو۔ کتنا جھوٹا تھا، نجوی جو کہتا تھا کہ تم وہیں رہ جاؤ گی۔“ سارہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”وہ جھوٹا نہیں تھا۔“ ام ہانی نے آہستہ سے کہا۔ ”مطلب؟“

”میں وہیں ہوں، ڈوگون کے قبیلے میں، کبھی مٹی سے بنی تانہ قبر کے پاس۔“ ام ہانی کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

**نکاح**

فرحان احمد

قیمت - 300 روپے

ملک: پاکستان

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار کراچی





گھر سمیٹے سمیٹے دوپہر تک اس کی حالت یرسوں کے مریض جیسی ہو جاتی۔ بکھرے بال پیٹنے سے شرابور جسم، اتنی رنگت اور دکھتا ہوا ہر جوڑ ہر روز وہ نئے روز کی طرح نئے الفاظ سے اپنی زندگی کو کوستی رہتی تھی۔ حالانکہ وہ بڑے دیکھے مزاج کی عورت تھی۔

”ایک کپ چائے پی لوں، تاکہ میرے جسم کو کچھ آرام مل جائے۔ پتا نہیں کس وقت۔“

دوسرے جھٹک کر بچن میں چلی گئی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کے اس چھوٹے سے بچن کو وہ بڑی نفاست اور ترتیب سے رکھتی تھی۔ ایک کپ چائے کے لیے استعمال ہونے والے برتن بھی دوسرے وقت پر نہیں چھوڑتی تھی۔ اسی لیے تو اس کا سارا دن کام کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس نے الماری سے پتیلی نکالی اور چولہے پر رکھ کر اس میں آدھا کپ پانی اور دو دو ملا کر ابلنے کے لیے دکھ دیا۔ دوپہر چائے کی پتی ڈال دی، کیونکہ وہ ہمیشہ چائے تیز پیتی تھی۔ جیسے ہی چینی کا ڈبّا کھولا دھک سے رہ گئی۔ کیوں کہ ڈبّا خالی تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ تو رشید کے آنے کو طوفان سمجھ رہی تھی کہ پتا نہیں کس وقت طوفان آجائے۔ یہاں تو اس کے دل غ اور جسم کو سونامی کا سامنا تھا۔ کیونکہ رشید خان کے گھر میں کسی چیز کا ختم ہونا سونامی سے کم نہیں تھا۔

”کبھی کبھی زندگی اتنی زہریلی کیوں ہو جاتی ہے جو بل بل ماری رہتی ہے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے سر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”چلو پانی کے ساتھ یہ زہر بھی پی لیتی ہوں، کم از کم جسم کو کچھ حرارت تو مل جائے گی۔“ وہ جیسے خود کو دلاسا

دے رہی تھی، آنے والے طوفان کو سننے کے لیے ایک زوردار دھکے کے ساتھ وہ دیوار سے ٹکرائی۔ اس کا سر بری طرح زخمی ہوا۔ وہ اپنے پلو سے سر کو گرم پھونک سے نکلور دیتے ہوئے اٹھ گئی۔

”کتنی بار تجھ سے کہا ہے کہ روز روز یہ تماشا نہ کیا کرو ہر روز دو تین چیزیں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ کدھر جاتی ہیں یہ سب کچھ بتاؤ پتہ تو یا خالہ کے ہاں بھجواتی ہے بتاؤ۔ مجھے۔“ وہ اسے بانوں سے پکڑ کر مسلسل مار رہا تھا۔

خالہ صغریٰ جو اس کی واحد رشتہ دار تھیں۔ اس شہر میں اور پڑوس میں رہنے کی وجہ سے اس کی واحد غم خوار اور ہمدرد تھیں۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ وقت پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔

”چھوڑو۔ چھوڑو رشید کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ خالہ صغریٰ زبردستی اس کے بال رشید سے چھڑواتے ہوئے بولیں۔

”ہاں۔ ہاں پاگل ہو گیا ہوں اور اس نے بنایا ہے۔ مجھے پاگل۔ سکون سے جینے نہیں دیتی یہ مجھے۔ عورت نہیں چڑیل ہے، یہ مجھے مار کر ہی دم لے گی۔“ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

”ارے کچھ پتا تو چلے یہ آج پھر کس بات پر جھگڑا ہے۔“ خالہ صغریٰ زنج چوتے ہوئے بولیں، جو ان کے روز بروز کے جھگڑوں سے تنگ آچکی تھیں۔

”کتنی بار اس منحوس کو کہا ہے، یہ سودا زرا احتیاط سے استعمال کیا کرو مگر اس کے ہاتھوں میں برکت نام کی کوئی چیز ہی نہیں، مینے کاراشن دس دن میں ختم کر دیتی ہے۔“

”مینے کاراشن۔“ وہ طنزیہ چیخی، جو ابھی تک خود کو

گرم پھونکوں سے نکلور دے رہی تھی۔

”تم مینے کلاتے کب ہو۔ ترسا ترسا کے لاتے ہو

اور میں پھونک پھونک کر استعمال کرتی ہوں۔“

”بند کر اپنی بکواس۔“ وہ زور سے دھاڑا۔

”جانتی ہو کتنی منگائی ہے، مگر تم کیسے جانو۔ تم تو مہارانی بن کر اڑانا جانتی ہو۔“

”مہارانی۔ ہو نہ ہو۔ اڑانا۔“ اس کا انداز ایسا کاٹ دار تھا کہ رشید پھر دوڑا مارنے کے لیے۔

”چھوڑو خالہ مجھے۔ تیرا لحاظ ہے ورنہ۔“ وہ دانت پیٹتے ہوئے بولا۔

”ارے بیٹا بیٹھ جاؤ آرام سے، کیوں خود کو پاگل بنایا ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے تیرے پاس۔ لوگ جیسے دیکھ کر رشک کرتے ہیں کہ کتنی جلدی تو نے ترقی کر لی، تو پھر کیوں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے اپنی زندگی اجڑن کرتا ہے۔“ خالہ کی باتیں ہمیشہ اس پر اثر کر جاتی تھیں۔ ان کی زبان میٹھی ہی اتنی تھی کہ سارے محلے والے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

”تو کیا جانے خالہ! شیدے سے رشید خان کا سفر میں نے کتنی مشکلوں سے طے کیا ہے۔“ وہ پھر سے اپنی غموت کی داستان سننے لگا۔

www.book





”جانتی ہو بیٹا۔ کیوں نہیں جانتی“ لیکن ایک بات ہے۔

”محنت زندگی میں بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر ہر ایک کو ایسا صلہ نہیں ملتا اور جس کو مل جائے اسے شکر کرنا چاہیے اور تم لوگ جی کہتے ہو میاں بیوی اور ایک بیٹا۔ پس۔“

”اسی لیے تو آگے کا سوچ رہا ہوں۔“ وہ اپنی بات پہ ازار ہا۔

”اب بھی اللہ نے دیا ہے“ آگے بھی دے گا ان شاء اللہ۔“

”اس کو اللہ کی ذات پر یقین کہاں۔ یہ دنیا تو اس کے زور بازو پہ چلتی ہے۔ سب کو یہ رزق دیتا ہے۔“ وہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی اٹھ پڑی۔

”دیکھ رہی ہو خالہ! کیسا زہرا گل رہی ہے۔ اس کی اسی نخوت اور نفرت کی وجہ سے میرے گھر میں برکت نہیں۔“ اور خالہ کی ڈیولنگ لگ گئی، کبھی رشید اور کبھی زہرا کو چپ کرانے کی مگر طوفان بد تمیزی برپا ہوتا گیا۔

”خالہ اسے چپ کرادو ورنہ بہت برا ہو جائے گا آج۔“

”کیا ہو گا اس سے زیادہ برا ہونا بھی ہلتی ہے۔“

”تیرا غلام نہیں ہوں جو تیری بکواس سناتا رہوں گا“ تجھ سے ہزار درجے بہتر کو لے آؤں گا۔“

”بس یہ ہی آخری حربہ ہوتا ہے تم مردوں کا۔“

”دیکھ تو چپ ہو جا“ ورنہ میرے منہ سے کچھ نکل جائے گا۔“

”تو نکل۔ میں بھی پوچھوں تیری مردانگی۔“

”اچھا۔ میری مردانگی دیکھنا چاہتی ہے۔“ وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور خالہ ان دونوں کے بیچ دوڑ دوڑ کر تھک گئیں، لیکن کسی نے اپنی زبان بند نہیں کی۔

”تو پھر سن۔ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔“ اس نے اپنے الفاظ تین بار دہرائے اور ایک ہی لمبے میں برسوں کے بنائے گھونسلے کے تنکے ہوا میں بکھر گئے۔

وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے مسلسل چھت کو گھور رہی تھی۔ جانے کس سوچ میں تھی۔ اس کے پہلو میں لیٹے بیٹے نے اسے کئی آوازیں دیں، لیکن وہ مسلسل خاموش تھی اور وہ اسے ”اماں! اماں! کہتے ہوئے خند کی آغوش میں چلا گیا۔“

”خالہ! اگر تیرے بیٹے اور ہوں گے مجھ سے تنگ آجائیں تو تو مجھے ایدھی سینٹریا کسی دارالامان میں بھیج دیتا۔“ چھت کو گھورتے گھورتے بھی اس کو انداز تھا کہ خالہ نماز ختم کر چکی ہیں۔

”کیوں؟ کیا کسی نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟“ خالہ ایک لمبی آہ نکالتے ہوئے آگے اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

”نہیں۔ لیکن کب تک یہ رہیں گے خالہ! ایک نہ ایک دن تو۔“

”اسی لیے تو کہتے ہیں بیٹا۔ کہ اپنے گھر کو اجڑنے نہیں دینا چاہیے۔ چاہے کیسے بھی حالات ہوں۔“

”کوئی گھر نہیں تھا خالہ نہ کوئی زندگی۔ جب انسان کے پاس دو پیسے آجائیں تو پھر کوئی نظر نہیں آتا“ چاہے وہ اپنی بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ ”اس کی آواز بھراہی گئی۔“

”اللہ خیر کرے گا۔ وہ اسباب پیدا کر لے والا ہے۔ تو ریشان مت ہو۔ سو جا آرام سے۔“ لیکن وہ کہاں آرام سے سو سکتی تھی۔

خالہ صغریٰ کے ہاں آئے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ رشید دوسری شادی کر چکا تھا۔ ایک امیر لڑکی کے ساتھ ہر مرد کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ امیر عورت اپنے ساتھ دولت لے کر آئے گی۔ لیکن وہ صرف اپنے امیرانہ چونچلے ہی لے کر آئی ہے۔ عقل کے ماروں کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہوتی کہ بھاری جینز کے سارے زندگی نہیں گزرتی اور کسی کے ہاتھ خراج کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا، چاہے وہ آپ کا امیر کبیر سر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لیے رشید کی نئی شادی پانچ ماہ ہی چل سکی اور وہ ناکام شادیوں کے بعد تو مرد پر وہ ٹیبل لگ جاتا ہے کہ راہ چلتی بھکارن بھی اپنی بیوی کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

”دیکھو، سن صغریٰ! میں ہمیشہ صاف بات کرتی ہوں، یہ ٹھیک کہ صغریٰ بیوی مرو چکی ہے اور تین بچوں کا باپ ہے، تو زہرا کو سن جو ان ہے، ایک بیٹے کی ماں تو یہ بھی ہے۔ یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ غریب ہے، تو زہرا کو سن سا امیر گھرانے سے ہے۔ ہاں وہ رشید جیسا کہینہ نہیں جو آج تک بیٹے کو بھی پوچھنے نہیں آیا، یہ گارنٹی دینے کے لیے میں تیار ہوں۔“ خالہ صغریٰ چپ چاپ باتیں سن رہی تھی۔

”دیکھ لو آپالی۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بے چاری بھی رشید کی طرح۔“

”ہرے ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ ساری عمر مجھے دعا میں دو گی۔“ آپالی خالہ صغریٰ کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔



”میرے پاس تمہیں دینے کے لیے شاید پیسہ نہ ہوں لیکن محبت اور عزت دے سکتا ہوں۔ میں شاید تمہاری بڑی بڑی خواہشات پوری نہ کر سکوں، لیکن پھولی پھولی خوشیوں کا ضرور خیال رکھوں گا۔ آج سے یہ تیرے بچے ہیں اور تمہارا بیٹا میرا بیٹا ہے۔ زندگی اسی طرح ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے اور ایک دوسرے کا احترام کرنے سے گزرتی ہے۔“ وہ چھوٹا سا غریب خانہ جہاں وہ بے شمار اندیشوں کے ساتھ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کر آئی تھی۔ اچانک بہت بڑا اور کشادہ معلوم ہونے لگا۔ کیونکہ یہاں کے رہنے والوں کے دل بڑے تھے۔

وہ اچانک دیوار کے پیچھے چھپ کر دیکھنے لگا۔ جب ایک معمولی شکل و صورت کا آدمی بائیک پر گھر کے اندر داخل ہوا۔ ایک طوفانی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

”اب تو خوب مزے کر رہی ہو گی۔“ اس نے عمارت کی خستہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا کہ اچانک اندر سے آنے والی آوازوں پر وہ چونک گیا۔

”کیوں لائے میرے لیے یہ سوٹ، پچھلے ہفتے بھی لائے تھے ایک۔“

”میں نے دیکھا کہ تیرے پاس گرمی کے کپڑے کم ہیں۔ اب قیمتی نہیں دلا سکتا، تو یہ سستے تو دے سکتا ہوں۔“

”ان پیسوں سے چینی لے آئے، ختم ہو گئی ہے۔“ وہ سستے انداز میں بولی، کیونکہ چینی فوہیا اسے ابھی تھا۔

”چینی ختم ہو گئی۔ تم نے بتایا کیوں نہیں۔ چلو میں کل لے آؤں گا۔“

”اس سے ذرا ایک گھونٹ پی لو۔“ اس نے اپنی پیالی اس کے ہونٹوں کے قریب کی۔

”مجھے پتا ہے کڑی ہے۔“ وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔

”تم ایک گھونٹ تو لو نا۔“ اس نے زبردستی اس کو ایک گھونٹ پلا دیا گیا۔

”اب جب بھی چینی نہ ہو تو میری چائے سے گھونٹ پیا کرو یہ ٹیبلٹیں ہو جایا کرے گی۔“

”آپ بھی نا۔“ وہ شرابا کر اندر چلی گئی اور اصغر مسکرا کر چائے بننے لگا۔

”جی اور ٹیبلٹیں بات بھی صدقہ ہے۔“ دیوار کے ساتھ کھڑے رشید کو اس حدیث کا مفہوم آج سمجھ میں آیا۔

”تو واقعی غریب ہے شیدا۔ رشید خان تو کبھی ہٹا نہیں، کیونکہ اس کے پاس محبت کی تجوری نہیں۔ چاتوں کا خزانہ نہیں اور اچھے الفاظ کا ذخیرہ نہیں۔ جائے چینی پر تو میسے لگتے ہیں، مگر اچھی بات کرنے پر تو کچھ بھی نہیں لگتا۔“ اس نے بے اختیار اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ وہ لکیر جو کبھی نبوی اس کو قسمت کی لکیر بتاتے آج اسے غمت کی لکیر نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے گرم آنسو لڑھک کر اسی لکیر میں پیوست ہو گئے۔





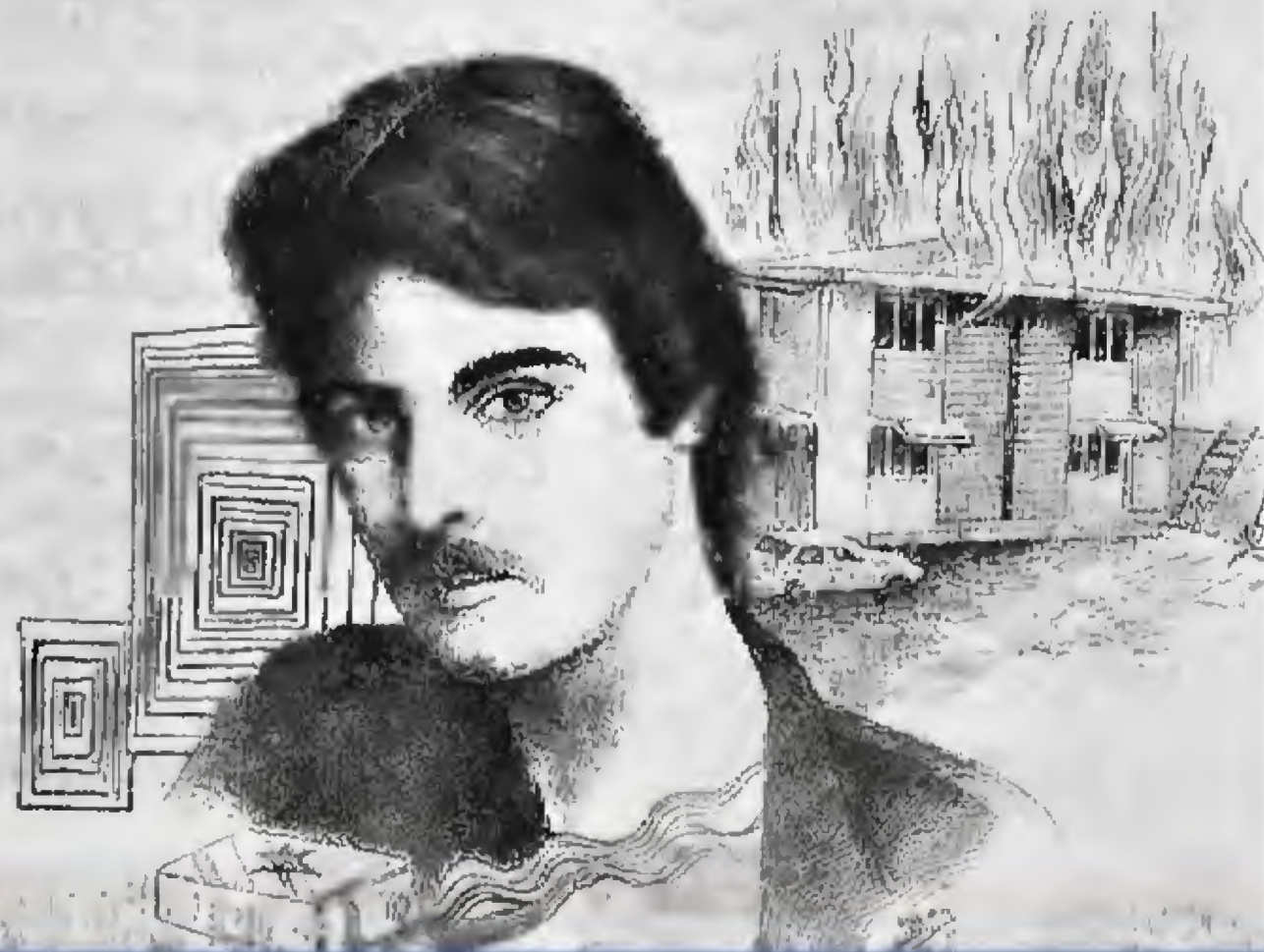
آئینہ مقصود



”حاضری کی اجازت ہے؟“ جواد کا ایس ایم ایس آیا تھا۔ یہ فدیہ نامہ انداز وہ خاص خاص موقعوں پر اختیار کرتا تھا اور آج کی خاص بات شامی کباب تھے۔ جس کی خوشبو یقیناً ”نازی“ کے گن سے لگن کر اوپر کے پورشن تک پرواز کر چکی تھی۔ جب ہی کھانا کھا کر اس کا پیغام آ پہنچا۔

”کیوں نہیں جناب! یو موسٹ ویلکم۔“ نازی نے مسکراتے ہوئے جواب ٹائپ کر کے بھیجا اور مستعدی سے اپنے کام پھانٹنے لگی۔ برائی کو دم پر رکھا۔ پھرانی کے شامی کباب جو اس نے اضافی خیال کرتے ہوئے فرز کر دیے تھے۔ دوبارہ نکل کر فرانی کرنے لگی۔

ناؤلیٹ






شعور کی اولین گھڑکی کھلنے پر جو پہلا منظر دیکھا تو خود کو دو کمروں اور ایک چھوٹے سے آنگن والے گھر کا مکین پایا۔ جہاں اماں اور اویس اس کے ساتھ تھے۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اب اسے یہ گھر کب بنوایا۔ اسے تو ایسا بھی یاد نہ تھے جو یہ گھر یہ آنگن۔ اس کے ارد گرد سی

نازی میز پر ناشتا لگا چکی تھی مگر غلو ابھی تک اپنے  
کمرے سے باہر نہیں آئے تھے۔ اس نے دیوار گیر  
گھڑی پر وقت دیکھا اور لاؤنج میں آکر بیوی آن کر لیا۔  
پہلے پہل دوسری نئی نویلی بیویوں کی طرح وہ بھی آفس  
کے لیے تیار ہوتے شوہر کے پاس جا کھڑی ہوتی اور  
تیاری میں مدد کروانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر جب  
ان کے شفاف آئین جیسے چہرے پر سرمئی بادلوں کے  
رنگ زیادہ گہرے ہونے لگے تو اس نے منظر سے ہٹا  
شروع کر دیا۔

”ہا جی جی۔ وہ میرا گھر والا ہے تاہم اس نے کہا۔“  
 حکیم ایک لمبا قصہ شروع کر چکی تھی۔ آئے دن اس  
 کے پاس سننے کو اپنے گھریلو جھگڑوں پر مبنی بے شمار



دستی کے زینے پر پہلا قدم خود عماد بھائی نے رکھا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب وہ خود میٹرک کے طالب علم تھے اور پورے زور و شور سے سالانہ امتحانات کی تیاری میں مصروف تھے۔ اسکول سے آکر کھانا کھانا، ایک گھنٹہ آرام اور پھر اکیڈمی کے لیے نکل کھڑے ہوتا۔ ایک ایسی ہی دہر میں جب وہ اکیڈمی جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے تو یہ ابرو والی درزن عالمہ کی بیٹی کو اپنے گھر کے دروازے پہ کھڑے روئے ہوئے پایا۔ اس پہاری سی بچی کو انہوں نے اکثر دھڑکھڑکھٹے پھرتے دیکھا تھا۔ ان کے گھرانے کے درزن عالمہ نے بہت خوش گوار مراسم تھے، مگر عماد بھائی کا شمار تو نکلے کم گونو جوانوں میں ہوتا تھا، پھر یہ بھائی کا بوجھ وہ ایسی معاملے میں کم ہی دیکھی لیتے تھے۔



”ارے کیا ہوا لڑیا! تم رو کیوں رہی ہو؟“  
 عمار بھائی ایک ہاتھ میں بائیسکل کا ہینڈل تھامے اس کے پاس چلے آئے۔  
 ”میری اماں مجھ سے بالکل پیار نہیں کرتیں، کوئی چیز لے کر بھی نہیں دیتیں۔ میں نے آج کٹائی مانگی تھی مگر اماں نے ڈانٹ دیا۔“ معصوم شکوے سنائے جانے کو بے تاب تھے۔ ہمدرد نظر آتے ہی اپنا اظہار کرنے لگے۔

”پاس۔۔۔ اتنی سی بات۔۔۔ یہ تو تم یہ کھاؤ بہت مزے کی ہے۔“ پینٹ کی جیب سے ایک چاکلیٹ نکال کر عمار بھائی نے اس کی طرف بڑھائی، مگر وہ متذبذب تھی۔

”اچھا۔۔۔ ایسا کرتے ہیں، ہم دوستی کر لیتے ہیں،“  
 کر دئی نا مجھ سے دوستی؟“

عمار بھائی نے ذرا سا جھکتے ہوئے اسے پکارا تھا۔  
 جواباً ”اس نے زور سے ہاں میں سر ہلا دیا۔ پھر دوبارہ آفر کرنے پر اس نے چاکلیٹ بھی عمار بھائی کے ہاتھ سے لے لی۔ اماں نے کسی سے کچھ بھی لینے سے منع کر رکھا تھا۔ مگر عمار بھائی اب ”کسی“ نہیں بلکہ اس کے دوست تھے۔

\*\*\*

اکیلے میں خود سے باتیں کر کے ساری بھڑاس نکال لیتا شاید دنیا کا بہترین کتھار کس ہے لیکن آزمائش کی شرط کو خود پر لاگو کرنے سے ہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ نازی آج کچھ ایسا ہی کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ صبح کے ناشتے والے واقعے سے اس پر کچھ ایسی جھینلا ہٹ سوار ہوئی تھی جو اترنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ پہلے بلاوجہ شیم کو ڈانٹ ڈپٹ کر کے غصہ اتارنے کی کوشش کی۔ اتفاقاً نہ ہوا تو اوپر راحیلہ آنٹی کے پاس چلی گئی۔

وہ بہت مختلف ساس تھیں بلکہ لفظ ساس ان پر چٹا ہی نہیں تھا۔ وہ تو سرتیا ممتا ہی ممتا تھیں۔ نازی ہر روز ان کی احوال پر سی کوہلی جاتی اور وہ ہر روز اسے دیکھ کر

یوں خوش ہوئیں گویا ہفتوں بعد ملی ہوں۔ شفقت کی پھوار میں بھیگی گفتگو سے نازی ہمیشہ سیراب ہو کر اٹھتی۔ آج بھی کچھ دیر میں ہی اس کے تئے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے اور وہ مطمئن ہو کر نیچے آئی، لیکن جیسے ہی بچن کے پھیلاؤ سے پر نظر پڑی، قہقہے کی یاد پھر تازہ ہو گئی۔ اسبوحہ بھی اور اس کی سوچیں۔

”ایسا بھی اب کیا تکلف،“ مینے سے زیادہ ہونکا ہے ہماری شادی کو، لیکن میاں صاحب کی آپ جناب ہی ختم نہیں ہوئی۔ اور اوپر سے یہ شیم، ہمیشہ غلط وقت پر آؤ گھنٹی ہے۔ مگر شاید غلطی میری ہی تھی۔“ وہ پھر سے جھینلا ہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔

”الغاث کب بازگا ہے، اچھے کام پر حوصلہ افزائی بھی بھلے نہ کریں۔“ غلطی پر ٹوک تو سکتے ہیں۔“

خود گلانی کرتے ہوئے اس کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ یہ جاننے ہوئے بھی کہ شکوہ کا اختیار اس کے پاس نہیں

دل شکوہ کر بیٹھا تھا۔ اس راستے کا انتخاب بھی تو سراسر اس کا اپنا تھا۔ راحیلہ آنٹی اور فرزانہ آنٹی نے روایتی ساس اور نند کا کردار ادا نہ کرتے ہوئے نہ صرف ہر بات کھول کر اس کے سامنے رکھ دی تھی بلکہ فیصلے کا اختیار بھی مکمل طور پر اسے سونپ دیا تھا۔ چاہے تو اس مفتوح جزیرے میں رہنا قبول کر لے جس کے مالکانہ حقوق اسے حاصل ہوتے ہوئے بھی ملکیت کا مان حاصل نہ ہو، جہاں قدم قدم پر گڑے کسی اور فلاح کے جھنڈوں کو اتار پھینکا تو درکنار چھوٹے کی اجازت بھی نہ ہوگی اور اگر چاہے تو صاف انکار کر دے۔ اس کا سر پھر بھی ہاں میں ہل گیا تھا۔

”مہر حوصلہ برداشت، صرف یہی چاہیے تھا۔ وہ میرے پاس بہت ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔ ”اپنے اندر کی عورت کو بھی مارنا پڑا۔ مار لوں گی۔“ اس نے انتہائی حد تک سوچ جڑا لا مگر آوازے متزلزل نہ ہوئے۔

”خود کو اکیلا مت سمجھنا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“ فرزانہ آنٹی نے اس کے اٹل فیصلے کو سراہتے ہوئے کہا تھا۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو وہ خود سے خوف زدہ ہو گئی۔ اراٹوں نے دردناک ڈبل پر چپکے چپکے دستک دینا شروع کر دی تھی۔ راحیلہ آنٹی اور فرزانہ آنٹی شاپنگ کے لیے اسے لینے آئیں تو اس کی نظریں بلا ارادہ سہی ان کے عقب میں خالی دروازے کی طرف اٹھ جاتیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جو اد کو دیکھ کر اسے کسی اور شخص کا گمان ہوتا۔ وہ سب اس کی سوچوں سے بے خبر اس کے ساتھ ہونے پر خوش تھے۔ وہ احساس شرمندگی میں گھر جاتی۔ جو اد کے چنگوں پر پھوٹے قہقہوں میں شامل ہونے کی کوشش کرتی۔ جو خالہ

آنٹی کے منع کرنے کے باوجود بساط بھرتیا ریوں میں مشغول تھیں، اولیں نے اس کی خاطر اپنے سینئرز کی منت کر کے چھٹیاں لی تھیں۔ یہ سب اس کی ذات کے لیے ہو رہا تھا۔ زندگی اسے اہمیت دے رہی تھی۔ بے وقعتی میں ڈوبے شب روز بیت گئے تھے۔ اسے اچھے دنوں کی آمد کا یقین ہونے لگا مگر۔ ایک مگر ہی تو تھا جو

اتنی مجھٹوں کے درمیان جائل ہو جاتا تھا۔ دھڑکنیں رک رک جاتیں۔ پھر کوئی اندر سے تسلی دیتا۔  
 ”دیر سے سہی برف پگھلے گی ضرور۔“

\*\*\*

”عمار بھائی گھر پر ہیں؟“ وہ ایک ہاتھ میں اپنا جسر پکڑے، سر ہاتھ گھر پر نکالے بہت استحقاق سے پوچھ رہی تھی، لیکن اس کا مخاطب ٹی وی پر آتے کرکٹ میچ میں پوری طرح غرق تھا۔

”جو لو! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ اس نے سوال دہرایا۔

”تمہیں کہیں نظر آ رہے ہیں عمار بھائی؟“ جواباً ایک اور سوال، نظریں ابھی بھی ٹی وی پر لگی تھیں۔

”بہت بری بات ہے۔ بہن سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔“ بچن سے آنٹی راحیلہ بیگم نے سرزنش کی تو وہ ذرا جھینپ گیا۔

”مگر ای! اسے بھی تو دیکھیں۔ سارا گھر جھان چکی

ہے پھر بھی محترمہ کی تسلی نہیں ہوئی۔“  
 ”تو اسے کوئی ضروری کام ہوگا۔“ راحیلہ بیگم نے جو اد کے اعتراض کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ابھی بھی اسی کی طرف داری کی تھی۔ جو اد کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ بچپن ہی سے اپنے گھر سے زیادہ اس گھر کے افراد کی لاڈلی تھی۔ اسی جان اور ابو جان کی جیتی خزانہ آنٹی کی معاون، عمار بھائی کی دوست اور خود جو اد کو بھی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ وہ اس سے چرنا نہیں تھا بس تنگ کرنا تھا۔

”جی آنٹی! بہت ضروری کام ہے۔“ ہمیشہ کی طرح شہ ملنے پر وہ مزید پھیل گئی اور جھٹ راحیلہ بیگم کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

”کل میٹھا کائیسٹ ہے۔ میں نے عمار بھائی سے کچھ سوال سمجھتے تھے۔“

”نکمی لڑکی! تمہیں ہمیشہ آخری وقت میں ہوش آتا ہے۔“ جو اد اسے پھر حرا آنے کے موڈ میں تھا مگر اس بار دونوں خواتین اسے نظر انداز کر کے صوفے پر

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

**مختار علی**

نکیت 400 روپے

ملکہ امیر شاہد

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر 32735021

37 اردو بازار کراچی



جا بیٹھیں۔

”نما تو شاید دوستوں کی طرف گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ گھر لوٹے۔ تم پہلے ذکر کرو۔ تیس تو ضرور رک جائے۔“ راحیلہ بیگم نے بہت ہمارے اس کے چہرے پر بکھری لٹوں کو سمیٹ کر کان کے پیچھے اڑسا۔

”ہوں۔ یہ تو ہے۔ میرا خیال تھا انہیں یاد ہو گا۔“ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی کہہ رہی تھی۔

”تمہاری پڑھائی کی فکریں اب وہ زیادہ عرصہ تک پالنے والے نہیں محترمہ جلد ہی ان کی کٹی نئی مصروفیات شروع ہونے والی ہیں۔“

تو جتنے ملنے کے باوجود جو اپنے ایک بار پھر ان کی گفتگو میں ٹانگ اڑائی۔

”مطلب ایہ کیا کہہ رہا ہے آنٹی؟“ اس نے چونک کر اس بار وہ اسے لڑکے کے چہرے سے بات کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی پھر راحیلہ بیگم کی طرف مڑی۔ عمار بھائی کے لیے وہ اتنی ہی حساس تھی۔ وہ بھی بچپن سے اسے اور اس کی ہر بات کو اہمیت دیتے آئے تھے۔ بچپن گزر گیا تھا مگر اس اہمیت کی اسے اتنی عادت ہو گئی تھی کہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی۔ عمار بھائی کی دوستی آج بھی اس کا کل سرمایہ تھی بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ کے نئے زاویوں نے بہت سی باتوں کے مفہوم بدل دیے تھے۔ دل نے نہ جانے کب ایک بدلی ہوئی دھڑکن کی چوری کی تھی لیکن اب یہ چوری کسک جتی جا رہی تھی۔

”مطلب اور جو ادنیٰ باتوں کا۔ بس جانے بھی دو۔“ آنٹی ہلکے پھلکے انداز میں ہنس دیں۔

”نما ملازمت کے لیے بھاگ دوڑ ضرور کر رہا ہے۔ اللہ اسے جلد از جلد کامیاب کرے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنی چھوٹی سی دوست کو بھول جائے۔“

انہوں نے کسی چھوٹے سے بچے کی طرح اسے پکڑا۔ جو اپنے بھی امی سے نظر بچا کر منہ چڑایا لیکن اب اس کا مضطرب دل تھا کہ کسی صورت مطمئن ہونے میں نہ آ رہا تھا۔

\*\*\*

”کیونکہ تو سہی کتنا دلچسپ آیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ تجھ سے نظر ہٹانے تو میرا نام بدل دیتا۔“

خالہ نے نازی کے دلہنہ اپنے کو دیکھ کر کہا تھا۔ پھر زبردستی اس کا رخ آئینے کی طرف موڑ دیا۔ خالہ کی بات کی مانند آئینہ ہی نہیں فرزانہ آبی بھی زور و شور سے کر رہی تھیں۔ لکلی کے یہ جگنو اس کی منٹھی میں دے کر دونوں باہر چلی گئیں اپنے مقدر سے تنہا ملنے کے لیے اسے اکیلا چھوڑ کر۔

نازی اور اسی کی طرح سجا سوراخو شبوؤں میں بسایہ کرا تاویر کسی کے قدموں کی آہٹ کے منتظر رہے۔ آخر آنے والا آئی گیا اور دھیمے قدموں سے چلتا بیڈ کے پاس آنے کے بجائے سامنے سے گزر کر واش روم میں جا گھسا۔ آدھا گھنٹا مزید انتظار کی نذر ہوا۔ اب واش روم کا دروازہ کھلا تو وہ دوسری طرف رکھی ڈرینگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ نازی سر جھکائے چند لمحوں کی طرح دائیں بائیں حرکت کرتے ان قدموں کو ہی دیکھتی رہی۔ ایک بار وہ قدم پھر متحرک ہوئے لیکن سامنے سے گزر جانے کے بجائے آخر کار بیڈ کے کنارے کے پاس آ کر۔

”آپ تھک گئی ہوں گی۔ چنچ کر کے آرام کر لیں۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ دروازہ لاک کر بیٹھ جائیں۔“

عمار اپنے مخصوص نرم لہجے میں یوں بات کر رہے تھے جیسے یہ معمول کا کوئی عام سادہ ہو اور وہ اسے ہر روز یوں ہی نصیحت کر کے باہر جاتے ہوں۔ نازی کے دل نے نوک خنجر کی سی چٹھن محسوس کی تھی۔ پلکوں کے کناروں سے سمندر کی لہریں ٹکرا رہی تھیں اور کچھ نمی اوہرا دھڑک رہی تھی۔

”یہ تو آغاز ہے۔ ابھی سے امت ہار دو گی تو آگے کیسے بڑھو گی۔“ اس نے خود کو دلا سادیا تھا۔

\*\*\*

”کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“ جواب کیوں نہیں دیتیں۔“

اماں نے کھانستے ہوئے بے زار لہجے میں کہا۔ وہ کافی دیر سے اسے پکار رہی تھیں مگر اس نے تو جیسے کلن ہی لپٹ رکھے تھے۔ جب سے راحیلہ آنٹی کی طرف سے ہو کر آئی تھی یوں ہی گم صم بیٹھی جلنے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔

”بیٹی! اگر فارغ ہو تو روٹیاں ہی پکالو۔ جانتی ہو؟“ اولیس بھوک کا کتنا کچا ہے۔ اسکول سے آتے ہی شور مچا دے گا۔ میری طبیعت بھی۔“ جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اماں کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ اپنے خیالات کے منہ حار سے ساحل پر اتر آئی۔

”اماں! آپ کی کھانسی بہت بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر نے ناغہ کرنے سے منع کیا تھا اور آپ کی دوا ختم ہوئے بیٹے سے زیادہ ہو گیا ہے۔“ وہ رنجیدہ سی ان کے پاس چلی آئی۔

”میری دافلہ فیس جمع کرنے کے لیے اپنی صحت کی قربانی دے رہی ہیں۔ ہے نا؟ میں سب جانتی ہوں۔ پلیز ایسا مت کریں۔ میں اس سال میٹرک کا امتحان نہیں دوں گی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔“

”اچھا اچھا۔ لے لوں گی دوا بھی۔ ابھی تو جا روٹیاں پکالے۔“

اماں ہمیشہ ہی اسے ٹال دیتی تھیں ان کے سامنے اس کی ضد کبھی چل ہی نہیں سکتی۔ اب یہ تو اماں ہی جانتی تھیں۔ ان کی کھانسی سلاہ سے سیرپ سے بننے والی کھانسی نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے صاف الفاظ میں کہا تھا۔ ”بیمپٹروں کی ٹی بی آخری اسٹیج پر ہے۔ مہنگا علاج، بہترین خوراک اور مکمل آرام۔ ورنہ زندگی کے چند دن اور کی مہلت کے جلد ختم ہو جانے کا اندیشہ۔“

ڈاکٹر بھی جانے کس دیس کی باتیں کرنا تھا۔ یہ سب چیزیں ٹیمینہ بی بی کی زندگی میں بیک وقت کیوں کر آسکتی تھیں۔ علاج اور اچھی خوراک کے لیے جو پیسہ ہا پے تھا وہ مکمل آرام کے راستے میں حائل تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر بیوی اور غربت کے ہم سفر ہونے پر انام عزیز و اقارب نے بھی نہانے کی روایت کو بھانٹنے کے لیے اپنے راستے بدل لیے تھے۔ وہ سلائی کا کام نہ

جانتی ہو تیں تو شاید کب کی دونوں بچوں سمیت فاقوں سے مرہم کی ہوتیں۔

اس اندھیرے کے سفر میں جرار صاحب اور ان کا کنبہ روشن چراغوں کی مانند تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اچھے پڑوسی ہونے کا فرض نبھایا تھا۔ سلائی کا کام ہمیشہ ٹیمینہ بی بی سے کرواتیں اور دو گنی چار گنی اجرت دیتیں۔ مدد کرنے کے کئی اور حیلے بہانے بھی ڈھونڈ رکھے تھے کہ جن سے ٹیمینہ بی بی کی انار پر ضرب نہ پڑے۔ یوں ان کی زندگی کی گاڑی جسے تیسے کھسک ہی رہی تھی مگر اس موڑی مرض کے انکشاف نے ٹیمینہ بی بی کی جمیع ہمت کو توڑ ڈالا تھا۔ اپنے بچوں کی جانب دیکھتیں تو مزید زندہ رہنے کی خواہش زور پکڑتی تھی۔ کھانستے کھاتے بے حال ہو کر وہ بستر پر ڈھیر ہو گئیں۔

دھندلی آنکھوں سے سامنے کچن کی کھڑکی سے نظر آتے اس کے متحرک وجود کو دیکھتے لگیں۔ وہ خود رو پورے کی طرح دوزخ دوزخ پر ہی اوپر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

اماں کی نظروں سے بے نیاز وہ روٹیاں پلٹے ہوئے ایک بار پھر گہری سوچ میں کھوئی تھی۔

”وہ نہیں ایسا تو نہیں میرے علم میں لائے بغیر عمار بھائی کا رشتہ طے کیا جا رہا ہو۔ نہیں! آنٹی ایسا نہیں کر سکتیں۔ وہ تو مجھ سے بہت پیار کر لیں ہیں۔ پیار کا دعوا تو عمار بھائی کو بھی ہے مگر کتنی بار سمجھانے کی کوشش کی مجھے گڑبگڑ است کہا کریں۔ میں اب بڑی ہو گئی ہوں۔ لیکن وہ جھٹ کہہ دیتے ہیں۔ کتنی ہی بڑی ہو جاؤ میرے لیے تو بڑا ہی رہو گی۔“

اماں کی زوردار کھانسی کی آواز نے ایک بار پھر اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا ساتھ ہی کسی شے کے گرنے کی آواز پر وہ چونک گئی۔

”اماں! آپ ٹھیک تو ہیں؟“ جواب نہ ملنے پر اوہ پکی روٹی توڑے پر چھوڑ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ کھلے دروازے سے نظر آتے منظر نے بچ راستے میں ہی پاؤں جکڑ لیے۔ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں اماں فرش پر اونڈھی گر گئی تھیں۔ ان کے ارد گرد پھیلی





”ماں!“ وہ پاگلوں کی طرح چیخیں ان کی طرف بھاگی۔

\*\*\*

”شدتیں جذبول کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ اس کی بے رخی میں جتنی شدت ہوگی، تیز دست اور پشیمانی کا رونا بھی اتنا ہی قریب ہوگا جو تمہیں تمہاری منزل کی طرف لے جائے گا۔“

خالہ نے بہت سستے کی بات بتائی تھی مگر یہاں تو گھبراہٹ ہی الٹی تھی۔ وہ اپنے نرم رویے سے التنازی کو اس کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر پشیمان کیے رکھتے۔ وہ نرم پھوار سے لہجے اور بے نیازی کا عجیب متوازن تازی کی ضرورت کا خیال رکھتے بہت کرتے تو کبھی سے بھی سختی نہ جھلکتی۔ اس سے کوئی کام بگڑ جاتا یا نقصان ہو جاتا تو یوں ظاہر کرتے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک طرف وہ اچھے شوہر کے فرائض پورے کر رہے تھے اور دوسری طرف ان کی آنکھیں بولتیں۔ ”تمہارے احساسات تمہارے جذبات تمہاری سوچ۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ میرا رستہ نہیں۔“

اس کے ہاتھوں کے کس پکارتے سبب سے آگے ایک عمری دل کی گھڑی ہے، جہاں صرف اس کے کمین کا حکم چلا ہے۔

عماد کے دل کا کمین بہت ڈیلا تھا۔ انہیں کسی اور سمت دیکھنے ہی نہ دیتا۔ وہ چپ رہ کر سب پلور کروا جاتا۔ کچھ لوگ چہروں پر۔ نوک کینسی کا بورڈ لگائے پھرتے ہیں عماد بھی ان ہی لوگوں میں سے تھے۔

\*\*\*

ہس روز کی شدید کھانسی کے باعث ماں کا پلاں بھی پھٹا پھٹ گیا تھا۔ دایاں پہلے ہی لٹی کے شدید حملے کے باعث ناکارہ تھا۔ فوری طور پر اسپتال لے جانے کے باوجود وہ جان بھر نہ ہو سکیں۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تین روز گزارنے کے بعد زندگی کی سرحد پار کر گئیں۔ دکھ کے ان لمحوں میں انکل جبرار کی پوری

فیملی ہس کے گرد موجود تھی۔ ہس کے باوجود یہ احساس کہ موت کی سرحد کے اس طرف وہ اکیلی کھڑی رہ گئی ہے۔ پہلی بار بہت شدت سے اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ ”ماں! یوں اچانک آپ کیسے جاسکتی ہیں۔ کج بھی آپ نے میری ایک نہیں سنی۔ پہلے بھی کبھی نہیں سنی۔“ ہڈیالی کیفیت میں روتے ہوئے وہ سفید پلور میں بڑھکے ماں کے وجود کی طرف بڑھی تھی۔

”نہیں گڑیا نہیں۔ مگر کف اللہ کی یہی مرضی تھی۔“ عماد بھائی نے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ خود بھی رورہے تھے اس کی ہر خواہش ہر خوشی پوری کرنے والے عماد بھائی آج بالکل بے بس تھے۔

جنانہ گھر پہنچا تو محلے والوں کو شینسی بلانے کے ان دیکھے رشتہ داروں کو اطلاع دینے کی فکر سنانے لگی۔ اس سے پوچھا گیا تو جو خالہ کے سوا کوئی نام اس کے ذہن میں نہ آسکا۔ جو خالہ شہر کے دوسرے حصے میں اپنے سو بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہی اس کی کل رشتہ دار تھیں سوچ لی آئیں۔

”باب تو پہلے ہی نہیں تھا۔ اب ماں بھی دنیا سے چلی گئی۔ اکیلے بچے کیسے رہیں گے۔“ محلے والوں کو بچاؤ کے لیے ان کی ہمدردی کا فائدہ چڑھ گیا تھا۔

”ماں خالہ ہی ان کی ہمدردی کی وجہ سے ہو گئی ہو۔ اب انہیں ساتھ لے کر ہی جانا۔“

سوئم والے دن ایک بڑوسن نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ خالہ متذہب تھیں۔ ان کی ہوسو خواہشیں بشکل برداشت کر لی تھیں تو ان کی رشتے کی بھانجی کے بیٹیم بچوں کو رکھنے پر کیونکر آمادہ ہوتی۔

”ارے بہن! اب تم بھی تو انہیں نہیں رکھ سکتیں جو ان بچی کا معاملہ ہے۔ کوئی رشتہ داری تو ہے نہیں۔“ کوئی اور بڑوسن بولیں۔

”آئی! ایسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ یہ لوگ غیر نہیں۔ ہمیں سکے بہن بھائی کی طرح عزیز ہیں۔“ فرزانہ آپلی کے جواب نے اس کے ڈوبتے ہوئے دل کو دھارس دی تھی۔

”نہ نہ بیٹا! یہ تمہارے کرنے کی باتیں نہیں۔“ ان کی بچی کی ذمہ داری۔ بھی بڑا نازک معاملہ ہے۔ ویسے گل یہ تو لڑکوں والا گھر ہے اور منہ بولا رشتہ بھی کوئی رشتہ ہے۔ ایک اور خاتون کی ندمانی بات پر راحیلہ بیگم کو تپو آیا۔ کچھ کہنے کے لیے انہوں نے لب کھولے ہی تھی کہ جو خالہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کر دیا۔

”بچے میرے ساتھ ہی جائیں گے۔“ انہوں نے ایک جملے میں ساری بات سمیٹ لی۔

\*\*\*

”ماں! ہمیں ہنی مون پر بھیجنے پر اصرار کر رہی ہیں۔ پلیز آپ منع کر دیجئے گا۔“

عماد نے کڑوی کافی کا گھونٹ بھر کر شیریں لہجے میں اسے مخاطب کیا جبکہ ان کی بات سن کر تازی کو اپنی آنکس کریم زہر سے زیادہ کڑوی لگنے لگی تھی۔

”دراصل میں کچھ مصروف ہوں۔ فی الحال۔“ وہ مکمل بے نیازی سے کہہ رہے تھے تازی جانتی تھی وہ جتنا خود کو من کا موٹی ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے کیس زیادہ ماں باپ کے فرماں بردار ہیں۔ ان کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں جس کی قریب ترین مثال آج کی کوٹنگ تھی۔ راحیلہ آنٹی نے نیچے آکر آج صبح ناشتے پر ہی کہہ دیا تھا۔ شام کو جلدی گھر آنا اور تازی کو کہیں باہر لے جانا۔ حکم کی فوری تعمیل ہوئی تھی۔

”ہوں! اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ تازی نے چٹکانے لے کر سوچا۔

”آپ منع کروں گی نا۔“ عماد اس کے چہرے کے تاثرات کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”جی بہت بہتر۔“ اسے کہتے ہی نیلی۔

\*\*\*

اجنبی گھر اجنبی چہرے اور اجنبی لہجے۔ جو خالہ کے بیٹے کے گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ راستے

بھر سوجھتی آئی تھی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے بھی ماں انہیں کبھی یہاں لے کر نہیں آئی تھیں جس کی بچہ جی وجہ جو خالہ کی ہوسو رہی ہوں گی۔ وہ بد زبان اور جھگڑالو ہونے کے ساتھ ساتھ آرام طلب بھی تھی۔ سارا دن بوڑھی ساس سے کام کرائی خود پٹنگ توڑتی یا جھگڑنے کے منصوبے بناتی۔ اس کا شوہر کاٹھ کا الو تھا۔ اس کی زبان اور ہاتھ سے بندھے دھاگوں کے سرے بیگم کے ہاتھ میں تھے۔

یہاں کس طرح رہنا ہے، پہلے ہی دن اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا۔ ایک طویل جھگڑے کے بعد وردانہ ماں انہیں رکھنے پر راضی ہوئی تھی۔ یہ بھی قیمت تھا۔ منہ بولے رشتے تو انہیں ایک دن بھی نہ رکھ پائے۔ وہ جن پر اسے بہت مان تھا، زمانے نے انہیں غیر بنایا اور وہ بن گئے۔ کتنا آسان ہوتا ہے منہ بولے رشتے بنانا اور پھر انہیں توڑ دینا۔ خون کے رشتوں نے جیسے تیسے ہی سہی انہیں اپنا تو لیا تھا۔ اس کی سوچیں بہت اذیت پسند ہو گئی تھیں۔ سارا دن کام میں جتی جائے کیا التماسید حاسو جتی رہتی۔

”کوئی رشتہ اگر نہیں تھا تو بنایا تو جاسکتا تھا۔ آخر عماد بھائی سہاں عماد بھائی اگر گھر پر ہوتے تو ضرور اسے روک لیتے۔ انہیں پتا چلے گا تو بہت لڑیں گے گھر والوں سے۔“

امید نے ایک نیا دارو شن کیا تھا۔ دراصل ماں کی تدفین سے اگلے دن ہی عماد بھائی کو شہر سے باہر جانا پڑا۔ ان کا لائنٹمنٹ لیٹر آگیا تھا اور فوری جوائنٹنگ کے لیے کہا گیا تھا۔ ایک کھٹی سی آس ایک انتظار نے تھکن سے بھرے شب و روز میں اسے ڈھے جانے سے بچا رکھا تھا۔ آخر ایک دن او ایس بھاگتا ہوا گلی سے اندر آیا۔

”دیکھو دیکھو! گڑیا کون آیا ہے۔“ فرزانہ آپلی اور جوادہاتھوں میں بہت سے شاپر لیے جھونکے پیچھے اندر آگئے۔ راحیلہ آنٹی نے کھلے پنے کا بہت سا سامان اور ان سب کے لیے کپڑے بھیجے تھے جنہیں دیکھ کر ماں کی کبھی نہ رکھنے والی زبان وقتی طور پر خاموش



ہو گئی۔

”راجیلہ آئی خود کیوں نہیں آئیں اور عمار بھائی وہ کہیں ہیں۔“ وہ بھاگ کر دروازے تک گئی اور باپس ہو کر لوٹ آئی۔

”وہ تو آنا چاہتے تھے مگر امی نے منع کر دیا۔“ فرزانہ آپنی نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”تھیں انہیں؟“

”کہتی ہیں۔ بھائی کے آنے سے تمہاری مای تمہیں الٹا سیدھا سناٹا نہ شروع کر دے۔“

”جی! وہ نا سبھی سے ان کا منہ ٹکنے لگی۔“

\*\*\*

پھر وہی ہوا جس کا نازی کو یقین تھا۔ راجیلہ آئی کا اصرار برہا تو عمار کو ٹھٹھنے ٹکٹنے پڑے اور وہ ایک ہفتہ کے لیے مری روانہ ہو گئے۔

”میں بہت بور انسان ہوں شاید آپ میری کمپنی انجوائے نہ کر سکیں۔“

لاہور سے مری تک کی ڈرائیو میں عمار کی جانب سے از خود کی جانے والی یہ پہلی بات تھی۔ اعتراف تھا یا دھمکی وہ سمجھ نہ پائی۔ وہ مری کی چڑھائی چڑھ رہے تھے اور نازی کو محسوس ہوا عمار بھی اپنے مزاج کی شدتوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

”مجھے آج تک ایک بہت سمجھ میں نہیں آئی لوگ شادی کرتے ہی مری کی طرف کیوں بھاگ پڑتے ہیں۔ ہونہ ایڈٹس! جنہوں نے کبھی مری نہیں دیکھا وہ بھی اور جنہیں اذہر ہے وہ بھی۔“ ان کے لہجے میں عجیب سی کھولن تھی۔

”کیوں کہ محبت ہر چیز کا مفہوم بدل دیتی ہے۔ ہزار بار کی بیکس چیزیں اور جگہیں نئی لگنے لگتی ہیں۔“

نازی نے اپنی مسلسل چپ آخر تو ڈھکی تھی اور عمار نے سارا غصہ گاڑی کی بریک پر نکال دیا۔ ٹائر بری طرح چرچرائے اور گاڑی ٹھٹھکے سے رک گئی۔ شرے ہوئے خواہدہ پانیوں میں جب کوئی ٹنگر دے مارے تو پانی جاگ اٹھتے ہیں۔ دائرہ دوراثرہ جنم لیتا ہوا غلام کچھ

دیر تک کناروں سے سرنگراتا ہے پھر وہی سرفہ سکون اوڑھ لیتا ہے۔

عمار بھی اس وقتی اشتعال کے بعد اپنی پرسکون جوان میں لوٹ آئے تھے۔ گھرے سرد خوابیدہ پانیوں کی طرح باقی کے چھ دن نازی ان کے بظاہر پرسکون خول کو توڑ دینے کی خواہش کرنے پر خود کو کوستی رہی۔

\*\*\*

میں نے دو مہینے بعد جواد ان کی طرف چکر لگایا کرتا تھا۔ کبھی گھبراہ فرزانہ آپنی بھی آجائیں۔ بہت سے تحائف اور کھانے پینے کی اشیاء ہر بار آئیں جن کی بدولت خالہ کی بہو جواد کو آواہا گھنٹہ تک برداشت کرنے کا جبر خود پر کیے رکھتی۔ وہ آواہا گھنٹہ مگر اس کے لیے بہت انمول خزانے کی طرح ہوتے۔ وہ کرید کرید کر جوار سے سب کا احوال پوچھتی۔ کئی کئی بار ایک ہی سوال حد ہراتی لیکن تشفی نہ ہوتی۔

”اگر لڑکے اب یہ کیا تماشایا رکھا ہے تمہاری ماں نے۔“ آخر ایک دن مای کو خوش آئی گیا۔

ابھی جواد نے بہت سے شاپ لاکر چارپائی پر رکھے ہی تھے کہ وہ صحن میں نکل آئی۔

”اگر کچھ دینا دلانا ہی ہوتا ہے تو ڈرائیور کے ہاتھ بھیج دیا کرو۔ تمہارا آنا ضروری ہے کیا۔ حد ہے بے شری کی۔ میری اپنی بھی بیٹیاں ہیں۔ آئندہ نہ آنا بھی یہاں۔“ مای نے صحن میں کھیلتی ہوئی اپنی چار اور پانچ سال کی بیٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔

جواد اس کے بعد پھر کبھی نہیں آیا۔ البتہ ڈرائیور کبھی کبھار اولیس کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ صرف چھوٹو کو۔ اب وہ بھی سمجھنے لگی تھی۔ اس لیے کبھی چھوٹو کے ساتھ جانے کا نہ سوچا۔ جواد جوان جزواں بہن بھائی کا تیسرا ہم زاد تھا۔ ساتھ جنم نہیں لیا تو کیا ہوا تھا تو اسے اولیس ہی کی طرح عزیز اس کے بارے میں بھی غلط سوچا جاسکتا تھا تو پھر کچھ بھی ممکن تھا۔ چھوٹو مای کے لیے رشوقی تحائف اور اس کے لیے جان فرما خبریں لے کر آتا۔

”فرزانہ آپنی کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔“ ایک دن اس نے بتایا۔

”عمار بھائی! آج کل بہت اداس رہتے ہیں۔ دراصل وہ کسی کو پسند کرتے ہیں اور راجیلہ آئی ان میں ہیں۔“

”کیس کو؟“ اس کا دل رک کر دھڑکا۔

”ہے کوئی۔ ان کی کلاس فیلو تھی۔ اب ان ہی کے دفتر میں کام بھی کرتی ہے۔“

اسے لگا ایک دم اس کے گرد اندھیرا چھا گیا ہے۔ اسید کا آخری چراغ بھی بجھ گیا۔ ایک ایک کر کے اس کی واپسی کی تمام کششیاں جلائی جا رہی تھیں آج آخری کشش کو بھی آگ لگا دی گئی۔

”میں نے ایک اور بات بھی تمہیں بتانا تھی۔ انگل جزار مجھے اپنے پاس رکھنے پر راضی ہیں۔ میری تعلیم کے اخراجات بھی وہی اٹھائیں گے۔ یہاں رہا تو مای کبھی گھر بیٹھ کر بڑھنے نہیں دیں گی۔ کیا ہمیشہ ہم مای کے غلام رہیں گے۔ میرا مطلب۔“

”جو دل چاہے کرو۔“ وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ جس کا اپنا وجود آندھیوں کی زد میں تھا۔

\*\*\*

”نمن اپنی پہلی بارش اور مرد اپنی پہلی چاہت ذرا مشکل ہی سے بھول گئے۔“

راجیلہ آئی شاید اسے رعایت دے رہی تھیں۔ ورنہ انہیں کہنا چاہیے تھا مٹی اپنی پہلی بارش بھول بھی جائے تو مرد اپنی پہلی چاہت کبھی نہیں بھولتا۔ وہ کل ہی مری سے لڑی تھی اور فوراً ہی ان سے ملنے چلی آئی۔ پہلی نظر میں ہی آئی نے اس کے چہرے پر نرم کرپڑھ ل تھی۔ ”میرا مقصد تمہیں مزید آزار نہ کرنا نہیں ہے دراصل تم حقیقت جانتی ہو۔ شہلا سے اس کی محبت کی شادی تھی۔ بعد میں دونوں میں نہ پائی یا ہے اولادی وجہ بنی جو کچھ بھی تھا لیکن عمار اپنے جلدیوں میں سچا تھا۔ اس لیے ہرٹ بھی زیادہ ہوا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسا رہے۔“

گھگھ تمہارے جیسی محبت کرنے والی بیوی ہو تو ماضی بھولتے دیر نہیں لگتی۔“

انہوں نے اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

”یاد رکھنا بیٹی! وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔“

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ کر نری سے دہرایا تو وہ نظریں چرائی۔ گزشتہ سات دنوں نے اس کے دل کی دنیا کو تہہ دیلا کر دیا تھا۔ جو صلے پہنچ کر کے وہ کسی کو جیت لینے لگی تھی اور رقابت کی آگ میں گھر کر سب کچھ ہار گئی۔ وہ کبھی کسی اور کے ساتھ بھی یہاں آئے ہوں گے۔ نازی کے دل کی سوئی اسی نقطے پر اڑی رہی۔ عمار کے تقصیروں میں صدم ہوتے کسی اور کے تقصیرے ابھی تک ان نفاذوں میں گونج رہے تھے۔ اپنے ساتھ چلتے پھرتے عمار کا گونگا وجود ہر لمحہ کسی اور سے جو ”تھنگو محسوس ہوتا۔ وہ کڑھتی ککستہ رہی اور یہی کڑھن واپسی پر ساتھ لے آئی۔

”اے بھائی! آپ لوگ آ بھی گئے۔ میرا خیال تھا مہینہ نہیں تو کم از کم بیس بائیس روز تو ضرور لگا کر آئیں گے۔“ جواد ابھی ابھی گھر میں داخل ہوا تھا اسے سامنے دیکھتے ہی چمک اٹھا۔

”پلو ہو! ہر کوئی اب تمہاری طرح آوارہ گرد ہونے سے رہا۔“ آئی نے جواب دے کر اسے مشکل میں پھنسنے سے بچالیا تھا۔

”تھامیہ بتائیں کہاں کہاں گھومے شاپنگ تو خوب کی ہوگی۔“ وہ سیپیلوں کے سے انداز میں کرسی ٹھیکٹ کر پاس آ بیٹھا۔

”شاپنگ کہاں کیوں نہیں۔“

عمار نے کہا تھا۔ ”ای نے وہ دھمکی دی ہے۔ ان کی بہو کو شاپنگ نہ کروا کی تو گھر آنے کی کوشش نہ کروں۔“ ایسی ہی کوئی تاکید مختلف مقامات دکھانے کے بارے میں بھی شاید کی ہو۔ اسی لیے وہ اسے سی سے بندھے قریبی کے جانور کی طرح پکڑ کر ہڑانہ ”تھامیہ“ لگی اور دامن کبھ کھالایا تھا۔

”چھامیں چلتی ہوں!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلنے کو مزید کچھ نہیں تھا۔





”آئے ہائے اسل! بھر سے میرے گھر کا رونق کھا رہی ہے۔ اب کیا ضرورت کے وقت بھی کام نہیں آسکتی۔ سچ کہتی ہوں چاچی تم اور تمہارا خاندان بہت احسان فراموش ہے۔“

وردانہ مای کی کڑکتی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ دراصل مای اسے اپنی بہن شاہینہ کے پاس کو بیٹھ بھیجنا چاہتی تھی جس کے ہاں بچے کی ولادت متوقع تھی اور ایک بے زبان خدمت نگار کی تلاش میں اس کی نظر انتخاب نازی پر آٹھری تھی۔ خلاف توقع فوجو خالہ کے منہ سے انکار سن کر مای آپس سے باہر ہو گئی۔ فوجو خالہ نے پہلی بار اس کی طرف باری کرنے کی جسارت کی تھی اور پہلی بار اسے فوجو خالہ کی اس جسارت سے اتفاق نہ تھا۔ عارضی طور پر ہی سہی وہ اس شہر سے دور جانا چاہتی تھی۔ فرزانہ آتی اور عمار بھائی کی شادیوں کی باتیں دوپٹے بعد کی رکھی گئی تھیں۔ اس کے لیے انیس کے ہاتھ کارڈ بھیج دیا گیا۔ کیا اب وہ اتنی بے وقعت ہو گئی تھی کہ کسی ایک نے بھی خود آکر دعوت دینا ضروری خیال نہ کیا۔ کیا واقعی مای کا خوف اس قدر طاری تھا سب پر۔

”مای! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں کو بیٹھ جانے کے لیے تیار ہوں۔“

اس نے میز پر پڑے شادی کارڈ پر آخری نظر ڈالی اور فیصلہ سنا دیا۔ رضا مندی دیتے ہی مای اس پر صدقے واری ہو گئی۔ زندگی میں پہلی بار۔ مگر اچنک بھا کیسا! اس کی زندگی میں چونکا دینے والے واقعات کی ایک لمبی فہرست تھی جو پہلی بار رونما ہوئے اور زندگی کا دھارا بدل گیا۔

فوجو خالہ کا بیٹا اسے کو بیٹھ چھوڑ گیا تھا۔ ایک بار پھر بنا ماحول نئے لوگ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی، لیکن شاہینہ باجی بہت اچھے طریقے سے ملیں۔ وہ مای سے قدرے مختلف اور خاصی معقول عورت تھیں، ان کی

چار سالہ بیٹی سے بھی نازی جلد ہی کھل مل گئی۔ چھوٹا سا گھر اور مختصر کتبہ میاں بیوی اور بیٹی اب چوتھی ہوتی۔ شاہینہ باجی کے تین مس کینج ہو چکے تھے اب کی بار ڈاکٹر نے بہت احتیاط کی تاکید کی تھی۔ وہ سارا وقت لیٹی رہتیں۔ نازی جھٹ پٹ کلام نہ بنا لیتی۔ دن کا باقی حصہ کپ شپ لگاتے اور بچی سے کھیلتے گزارتے۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا سوائے قدر بھائی کے۔ اس کی نگاہیں اگلے پن کے ملبوم سے آگہ نہ تھیں۔ نازی کو سامنا ہونے پر خوف آتا، لیکن کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

”میں نے کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔“ وہ خود کو تسلی دیتی، لیکن یہ بھی اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ جن چند مہینوں کے ایک ایک دن کو وہ گمن کر گزار رہی تھی وہ اس قدر پھیلے کہ اسے ساری لگتی سارے حساب بھولنے لگے۔

شاہینہ باجی کا ایک بار پھر مس کینج ہو گیا۔ کمزوری، صدمہ اور پھر اس بار پیچیدگی بھی زیادہ تھی۔ وہ چالیس روز بعد بھی بستر سے اٹھنے کے قابل نہ تھیں۔ نازی کی واپسی کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔

مای کا فون اکثر آتا۔ وہ بہن کی طبیعت دریافت کر کے بند کر دیتیں۔ کاش کوئی خود سے ہی اسے لینے آجائے۔ اوپس بھی اپنا مستقبل بنانے کی فکر میں بہن کو بھولا ہوا تھا۔ وہ اکیلے میں بیٹھ کر سوچوں کے نائے بننے لگی، لیکن واپسی کا تقاضا کرتے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ شاہینہ باجی کی طبیعت تھی کہ روز بروز پہلے سے زیادہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ان کا خیال رکھنے کو وہ دل و جان سے تیار تھی، مگر اس میلی نگاہ والے بھیڑیے کا کیا کرتی فوجو کب سے گھات لگائے اپنے شکار کی کسی چھوٹی سی چوک کا مختصر تھا۔

”بہت اچھا کیا! فرزانہ آتی جو چلی آئیں، میرا بھی بہت دل چاہ رہا تھا آپ سے کپ شپ کرنے کو۔“ نازی آگے بڑھ کر خوش دلی سے گلے ملی اور انہیں اندر

”اگرے واہ بھی! تم نے تو گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی گھر ہے جسے شہلانے کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔“

وہ جوش میں کہتے ہوئے آخری جملے پر خود ہی جھجک کر رک گئیں۔ شاید غیر ضروری بول گئی تھیں ”جواباً“ نازی بھی چھٹی سی ہنسی دی۔

”آپ یہ بتائیں۔ کیا کھانا میں گی۔ میں جھٹ پٹ ہوں گی پھر بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔“ اس نے ارادنا ”نقشہ کا رخ بدلا تھا ان کے چہرے سے شرمندگی کے آثار کم کرنے کے لیے۔

”اگرے نہیں بھی۔ اسی کھانا بنا رہی ہیں سب دن چل کر اکتھے کھائیں گے۔ تم بس بیٹھو میرے پاس۔ آج میں صرف تم سے ملنے آئی ہوں۔“ انہوں نے نازی کو بانو سے پکڑ کر بٹھالیا۔

”انسان جنت میں آئے اور جنت کا میوہ نہ کھائے۔ یہ تو کفرانِ نعمت ہے۔“

جوانے با آواز بلند اپنے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ لوں بے اختیار ہنس دیں۔

”نازی! تم نے اس چٹورے کو زیادہ ہی شہرہ دے رکھا ہے، پہلے بھی کھانے کے سوا اور کوئی کلام نہیں کرنا تھا۔ اب تو بالکل ہی اسے شامی ریڈیٹرز (قوت شعلہ) تمہارے بچن کی طرف لگا کر بیٹھا رہتا ہے۔“

وہ کوکھیا ناسا ہو کر کان کھانے لگا۔

”ایسی بات نہیں ہے آئی! میں جب بھی کوئی اچھی بات کہتا ہوں تو خود ہی اسے بلا لیتی ہوں۔“

نازی کی حمایت پر وہ اکثر کرکار جھاڑنے لگا تھا، لیکن اسے ہی جملے پر پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”آخر کو میرا بھائی بھی ہے اور سہیلی بھی۔“

”وہ خواتین کے درمیان آج میری دال نہیں لگے گی۔“ وہ گھبرانے کی اور کاری کرتا ہوا چلا گیا۔

”آئی! شہلا کیسی تھی؟“ نازی نے بلا تمہید بات

فرزانہ کی بھی۔ فرزانہ خاموشی سے اس کے چہرے کو

دیکھنے لگی تھیں پھر کچھ شر کر کہنے لگیں۔

”جو لڑکی سرسراں میں داخل ہونے سے پہلے ہی گھر تقسیم کر دے اور جس کی فرمائش پر بوڑھی ساس اپنا کمر اکیا پورا گھر چھوڑ کر اوپر کے پورشن میں رہنے لگے تاکہ بیٹے کا گھر متاثر نہ ہو۔ سو پھر بھی اس بنے بنائے گھر کو سنبھال سکے نہ گھر والے کو قوت۔ تو وہ کیسی ہو سکتی ہے نازی!“ انہوں نے چند جملوں میں شہلا کی شخصیت کا خاکہ پیش کر دیا تھا۔

”پھر بھی۔۔۔ عمامہ کے دل میں تو وہی بستی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی نازی کے منہ سے پھسل گیا۔

”ہاں، کیوں کہ محبت خود غرض ہوتی ہے۔ اسے سوا کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتی۔“ انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا۔

”وہ شادی سے پہلے بھی ایک برے باپ کی بیٹی تھی اور بعد میں بھی برے باپ کی بیٹی ہی رہی۔ اس گھر کو نہ اپنا سکی۔ اس نے محبت تو کی تھی، مگر بھلائی پائی۔“

”اور ایک میں ہوں جو نو عمری کی محبت آج بھی نبھا رہی ہوں۔“ وہ سوچ کر رہ گئی۔

”محبت اگر محبوب کے لیے جھکنا نہ جانتی ہو تو فقط کلٹے والے تنگ جوتے کی مانند رہ جاتی ہے۔ جتنی دیر تک پنے رکھو گے، ”مٹم گمراہ“ ہوتا جائے گا۔ عمامہ بھی شاید ایسے ہی کسی احساس سے دوچار ہو گیا تھا اور نہ جتنے چاڑ سے اسے بیاہ کر لایا اور پورے چار سال جتنی والہانہ محبت اس پر بھجوا کر تار پل اس سب کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک صرف اولاد نہ ہونے پر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔ طلاق ہی دے ڈالی جبکہ ہم لوگوں نے نہ سمجھی اس کی کا احساس دلایا نہ ہی دیا ڈالا۔“

وہ ماضی کی کچھ گتھیاں نہ سمجھ پانے پر الجھ رہی تھیں۔ نازی کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ جذبات میں آکر کیے فیصلوں کا وقتی غبار جب بیٹھتا ہے تو وہ شخص ہوتا ہے اور بچھتاؤں کی دلدل۔ عمامہ بھی اب عمر بھر نکل نہیں پائیں گے اس دلدل سے۔

”آخر کب تک کھیلتی رہے گی یہ آنکھ مچولی مجھ



تنتالی قریب سے اس کی دبی دبی غصیلی آواز ابھری تھی۔ ہاتھ سے پلیٹ چھوٹ کر سنگ میں جا گری۔ وہ برتن دھونا چھوڑ کر دیوار سے جا لگی۔

”میرے صبر کو اور کتنا آزمائے گی۔ چار سال بیت گئے تیرے نخرے اٹھاتے۔ یاد رکھ! زبردستی کرنے پر اس کو اگلا بل نہ آئے۔“

قدیر نے اسے چوٹی سے پکڑ کر جھٹکا دیا تھا۔ وہ سسک کر رہ گئی۔ ذرا سی آواز بھی نکالتی تو ساتھ والے کمرے میں لیشی شاہینہ جی تک یا آسانی پہنچ جاتی۔ یہ بھرم وہ توڑتا نہیں چاہتی تھی۔ دن تو جیسے تیسے گزر رہی جاتا تھا مگر راستہ ہر رات بہت بھاری ہوتی تھی۔ گزشتہ چار سالوں میں ان گنت راتیں اس نے چھوٹی سی سحر کے وجود سے چمٹ کر جاگتے ہوئے گزار دی تھیں۔ برابر والے ہیڈ پر لیشی شاہینہ جی کی بے خوابی کی گواہی پلنگ کی ”چوٹیوں“ دیتی۔ اس کی طرح شاید وہ بھی ان دنوں سولی تھیں جب گھر میں کوئی مہمان نہ ہو تو ایسا کام یاد آجاتے۔ بار بار اسے بکا رہا۔ وہ بھی کبھی سحر کو بھیج دیتی۔ کبھی سحر کو ساتھ لے کر چلی جاتی۔

”کام نمٹا کر میرے کمرے میں آنا۔“ وہ موقع ملتے ہی سرگوشی کرتی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں مانے گی۔ اگلی صبح قدیر کا غصہ اشیاء کی اٹھان پر نکلا۔ وہ کانوں میں کڑوا تیل ڈال لیتی۔

آج بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔ وہ بکنا جھٹکا یا ہر چلا گیا تو اس نے شکر کیا، مگر اب شام ڈھلے لوٹا تھا تو غصہ ہنوز قائم تھا۔ اس کی چٹیا کو ایک جھٹکے سے چھوڑ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اسی تیزی سے واپس پلیٹ کر اس کے سامنے آکر اٹھا۔

”جیسے تو نے اپنی بیساکھی بنا رکھا ہے، وہ بہت کمزور سہارا ہے۔ کیا جھتی ہے اس کے پیچھے چھپ کر بچ جائے گی۔ لگتا ہے قطرہ قطرہ زہر لی کر مرنا اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ یہ قصہ میں آج ہی ختم کر دیتا ہوں۔“ وہ کچن سے نکل کر کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ اس کی مہم پاتوں میں ابھی دایں کھڑی الجھ رہی تھی۔

”قطرہ قطرہ زہر۔ قصہ ختم کر دیتا ہوں۔ کیا مطلب۔ کہیں شاہینہ جی کی نامعلوم اور اتنی طویل بیماری کی وجہ۔ او میرے اللہ۔“

وہ تیزی سے اس طرف لپکی۔ کمرے کے دروازے تک پہنچی تو وہ گلابا کر کچھ ”قصہ“ ختم کر چکا تھا۔ پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مگر وہ انداز میں ہنس رہا۔

”سحر! سحر! ہر گلی میں بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بھاگی لیکن دروازے پر موٹا سا تالا دیکھ کر رک گئی۔

”سحر کو میں نے محلے کے بچوں کے ساتھ میلے میں بھیج دیا ہے۔“ وہ مکمل منصوبہ بندی کر چکا تھا۔

”بی بی گل۔ بی بی گل مجھے بھاؤ۔“ اب آخری امید پر دس خالہ تھی۔ وہ خلق کے بل چیخا ہوئی سیڑھیوں کی طرف بھاگنے لگی لیکن ایک ہی جست لگا کر وہ راستہ روک چکا تھا۔

”کیوں خود کو تھکاتی ہے میری شہزادی! تیری بی بی گل تو ہفتے بھر سے میکے میں ہے اور اس کا شوہر ابھی منڈی سے نہیں لوٹا۔“

قدیر نے اسے اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود کو چھڑاتے ہوئے جتنی قوت سے چھین سکتی تھی، پیچ رہی تھی۔

”اللہ۔“ اس سے پہلے کہ قدیر اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیتا۔ اس نے اصل در کھٹکنا دیا تھا۔ اگلے ہی بل بیرونی دروازہ باہر سے دھڑو دھڑا جانے لگا۔

”کیا بات ہے بچہ! رو تا کیوں ہے؟“ بی بی گل کا شوہر خان چاچا پکار رہا تھا۔ دروازہ کھلنے میں وہ منٹ کی تاخیر ہوئی تو وہ دیوار پھلانگ کر اندر آجاتا۔

\*\*\*

وہ چار سال نہیں چار صدیاں تھیں بجنیں کلا

کر اپنے شہر کی فضلوں میں دوبارہ سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ وقت کی گاڑی کتنے اسٹیشن آگے بڑھ چکی تھی۔

اولیس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے میٹرک کا طالب علم نہیں لبا اونچا نوجوان کھڑا تھا۔ جو اد اور اولیس نے انٹر کرنے کے بعد آکٹھے آئی تھیں۔ ایس بی لوگ کورس کے لیے اپنا ہی کیا تھا۔ جو اد تو ٹیسٹ کلیمز نہ کر سکا۔ البتہ اولیس آج کل کاکول ملٹری اکیڈمی میں زیر تربیت تھا۔ نہ صرف اسے یہاں تک پہنچانے میں انکل جزار کا بھرپور مالی اور اخلاقی تعاون شامل تھا بلکہ ان کا گھر کھلوا کر اس کی ضروری مرمت بھی کروادی تھی۔ جہاں اب فوج خالہ بھی ان بہن بھائی کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔

ایک سلتی شام کی راتھ تک اب بھی اس کے وجود میں شور مچاتی تھی۔ اس شام بل بھر کی تاخیر اسے ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں دھکیل دیتی مگر اللہ نے اسے بچالیا تھا۔ اوہر قدیر دروازہ کھولتے ہی چاچا سے لپٹ کر دھڑاڑیں مارنے لگا۔

”میری بیوی مجھے چھوڑ کر دنیا سے چلی گئی چاچا!“ وہ چوہدر کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی تمنا کر رہی تھی۔ ”مصلحتاً“ خاموش ہو گئی۔ پڑوسیوں نے اس سے نمبر لے کر لاہور فون کر دیا تھا۔ اگلے ہی دن ملنا مانی اور فوج خالہ کے ساتھ اولیس اور جو اد بھی آگئے تھے اور وہ اپنا سامان باندھ کر خود بخود تیار ہو گئی۔

”راہیلہ آتی کیسی ہیں اور فرزانہ آئی؟ وہ کہاں ہوتی ہیں۔“

اس نے گھر پہنچنے تک انتظار نہیں کیا تھا۔ راستے میں ہی شروع ہو گئی۔

”دونوں ٹھیک ہیں۔ تمہیں یاد کرتی ہیں۔“ اولیس کے سیدھے سادے جواب سے جو اد کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”فرزانہ آئی؟ کا سوٹھی اور ان کی طوفان میل جو ہر وقت نازی خالہ، نازی خالہ کرتے ہیں۔ وہ نہیں بتاؤ گے۔“ اس کے لڑکا عورتوں والے انداز پر سب کو ہنسی آگئی۔

”اور عماد بھائی۔ ان کی سرنیہ وہ کیسے ہیں؟“ اس کا سوال اتنا مشکل تو نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”کیا بات ہے، چپ کیوں ہو گئے۔ جواب تو دو۔“ نازی کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

”ذرا اصل۔ عماد بھائی نے شہلا بھائی کو طلاق دے دی ہے اور بچے و بچے نہیں ہیں ان کے۔“ جو اد مختصر سا جواب دے کر گاڑی سے باہر دیکھنے لگا تھا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”محبت شادی، اولاد نہ ہونا۔ پھر طلاق۔ محبت ختم!“

گھر پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی وہ سب اسے ملنے آئے تھے۔ ان سب میں بس ایک ہی چہرہ نہیں تھا۔ سب سے پہلے آنا چاہیے تھا اور کوئی ناکانہ سی آنکھ اس کے دوست، غم گسار اس کے بہرہ رور ہے تھے۔ شاید اب اس رشتے کی اہمیت نہ رہی تھی۔

”عماد بھائی کیوں نہیں آئے؟“ آخر اس نے امت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”عماد اب وہ عماد کہاں رہا ہے۔ کم گوئی ہو گئے ہیں میں بدل گئی ہے۔ ملنا جلتا آنا جانا سب ختم۔ اپنے خول میں بند ہو کر رہ گیا ہے۔“ فرزانہ آئی نے اس لہجے میں بتایا تھا۔

”ٹوٹ کر بکھر گیا ہے میرا بچہ!“ راہیلہ آئی نے ایک لھنڈی آہ بھری۔

”اللہ کرے اس کے بکھرے وجود کو سمیٹ لینے والی کوئی اس کی زندگی میں آجائے۔“

نازی کو دیکھ کر آئی کی آنکھوں میں ایک خواہش جاگی تھی جسے سمجھ کر نازی نے سر جھکا لیا۔ عماد اس کے دل کے صحراب پر بسنے والی پہلی بارش کی طرح تھے۔ ایک طویل اور صبر آزا مسافت کے بعد ہی سہی، قدرت اگر وہ نام اس کے نصیب میں لکھنے جاری تھی تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مفہوم سب ہی کو بھا گیا تھا لیکن عماد۔

انہیں منانے کے لیے آئی کو خاص طور پر محنت





”ارے۔ ارے دیکھ کر بھی احتیاط سے چلو۔“

وہ کچن سے نکل کر سیدھی ان کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے راستے یعنی پورے لاؤنج میں ہر روز کی طرح کوئی بھی چیز نظر نہ آ رہی تھی۔ یہاں جگہ سے ہٹ کر نظر نہ آتی تھی مگر وہ ایسی کہ وہ خلیے کا ارادہ کرتی اور کوئی نہ کوئی شے، کرسی کا پایہ، میز کا کنارہ ٹھوکر کھانے خود ہی اس کے قدموں میں آتے۔ پھر وہی عمار کا آگے بڑھ کر اسے تمام لینا۔ خصلتیں کرتا ان کا فکر مندرجہ اور اپنی مسکراہٹ کو بمشکل چھپاتے ہوئے ان کی بانہوں میں بڑے ہان کے ساتھ سناٹا۔ بازی۔

ایک چھوٹی سی خوش خبری نے سارا منظر ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ جواب بھی اس دنیا میں نہیں آیا تھا اس کی آمد کی پیشگی اطلاع نے سوئے ہوئے شہزادے کو ایک لحظہ بیدار کر دیا تھا۔ عمار جیسے خود بخود اپنے خود ساختہ خول سے باہر آ گئے تھے۔ باقی سارا محل تو پہلے ہی نازی نام کے سحر کا اسیر تھا۔ اب یہ جادو مزید سرچڑھ کر بولنے لگا تھا۔

راحیلہ آنٹی باوجود جوڑوں کے درد کے ہر روز نیچے آتیں تاکہ دم کیا پانی اپنے ہاتھوں سے اسے پلا سکیں۔ فرزانہ آپا دن میں کئی مرتبہ فون پر اپنے تجربات اور مقید مشوروں سے اسے نوازتیں، انگل اور جواو کی خوشی کے تو کیا ہی کہنے۔ اب عمار کی طرف سے بھی کوئی کٹک باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ خوش تھی مطمئن تھی مگر کبھی بھی ایک خیال ایک سوچ اس کی ساری خوشیوں پر پانی پھیلاتا۔

”شہلا کی طرح اگر میں بھی ماں نہ بن پاتی تو کیا عمار مجھے بھی کیا اولاد کا ہونا اس قدر اہم ہے۔ میاں بیوی کا باہمی رشتہ اس کی کوئی اہمیت نہیں؟ صرف ایک چیز کے ہونے سے عورت معتبر ہے، ورنہ اس کی اپنی شناخت کہاں گئی! مرد بحیثیت مرد۔ مکمل!

عورت بحیثیت عورت۔ کچھ بھی نہیں!

روز بروز بڑھتی ہوئی ان سوچوں نے اس پر ڈپریشن طاری کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ہر بار خوش رہنے، اچھا سوچنے کی تلقین کرتی مگر عمل صفر۔ آخر اسے عمار کو اکیلے میں بلا کر ہدایات دینی پڑیں۔

”یہ سب کیا ہے اور اوسر کیوں رکھا ہے؟“ اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر لاؤنج میں دھری پرانی اشیاء کے ایک ڈھیر پر پڑی۔ رنگ برنگ کے زنانہ کپڑے جو تودیر استعمال کی اشیاء پرانے البمز۔ ”بیگم صاحبہ! آج صبح عمار صاحب نے اسٹور کی صفائی کروائی ہے اور یہ فالتو سامان نکال دیا ہے۔ کہہ رہے تھے تم نے لینا ہے تو رکھ لو ورنہ کسی اور کو دے دیتا۔“

حمیدہ نے اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔ اسے حال ہی میں عمار نے کل وقتی ملازمہ کے طور پر رکھا تھا۔

”آج تو سنڈے ہے۔ جلد اٹھ گئے تھے تو مجھے بھی جگا دیا ہوتا۔“ اس کی خود کھائی پر حمیدہ خاموش رہی تھی۔

”اور ناشتا۔ ناشتا کر لیا عمار نے؟“

”نہیں ابھی نہیں، اب ساتھ کریں گے۔“ لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے عمار نے جواب دیا تو حمیدہ کچن میں چلی گئی۔ نازی ایک بار پھر اشیاء کے ڈھیر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”یہ۔ یہ غالباً شہلا کا سامان ہے۔ آپ اسے پھٹکوا رہے ہیں!“ وہ متحیر تھی۔

اس کی ضرورت کا ہوتا تو لے جاتی۔ کسی کا بے کار سامان ہم اپنے گھر میں کیوں جمع کیے رکھیں، عمار کا لہجہ لاپرواہ سا تھا مگر کھوجی نظریں نازی پر مرکوز تھیں۔

”صرف بے کار سامان ہے۔ اس سے وابستہ یادیں نہیں؟“ شہلا کا براہ راست ذکر پہلی بار دونوں کے درمیان ہوا تھا۔ نازی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا

جبکہ عمار کی زیر لب مسکراہٹ گہری ہو کر پورے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ وہ اسٹنڈوں سے ڈاکٹر کی ہدایت پر نازی کے ڈپریشن کی وجہ دریافت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ آج کوئی نہ کوئی سراپا تھا آئی گیا۔

”اس کی محبت کو بھی یوں ہی بے کار جان کر مل سے نکال۔ نکال یا نہیں گے؟ آخر وہ امت کر کے سب کہہ گئی۔ جواباً عمار کا قہقہہ کمرے میں گونج رہا تھا۔

”او۔ آج تمہیں اپنے بارے میں سب بتانا ہوں۔“ نازی کا ہاتھ پکڑ کر وہ صوفے پر آ بیٹھے۔ ”شہلا میری کلاس فیلو تھی۔ بہت ذہین، ایکٹو اور حاضر جواب۔ دوسرے کلاس فیلوؤں کی طرح میں بھی اس کی ان خوبیوں کو اور ان کی وجہ سے اسے پسند کرتا تھا، لیکن یہ پسندیدگی اتنی ہی تھی۔ جیسے ہی ایم بی اے مکمل ہوا سب ہی نئی منزلوں کی تلاش میں اپنی اپنی راہ پر چل نکلے۔ تم بھی جانتی ہو اپنی ملازمت کی تلاش میں میں بھی ایک عرصہ سرگرداں رہا۔“

عمار رک کر کچھ سوچنے لگے پھر مبہم سا مسکرایے۔

”یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ جب شہلا نے فیس بک پر مجھے ایروج کیا تھا۔ باقاعدہ دوستی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ وہ ایک ملٹی ٹیشل کمپنی میں ملازمت کر رہی تھی۔ وہاں ایک سیٹ خالی ہوئی تو اس نے میری سی ڈی ریفر کر دی۔ یوں ہم کو لیگز بن گئے۔ کمپنی میں بہت اہم پوسٹ پر کامیابی سے اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اس کی خوبیوں کا معترف ہوا۔“

”پسندیدگی ہی تو محبت کا پہلا زینہ ہے۔“ نازی کی دھیمی سی سرگوشی پر عمار نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”ہاں! جیسے تم چپکے چپکے مجھ سے محبت کرنے لگی تھیں۔“ اب کے چونکنے کی باری نازی کی تھی۔

”جواو نے مجھ پر یہ انکشاف تمہارے جانے کے بعد کیا تھا۔ تب تک میں شہلا کی مٹی کو زبان دے چکا تھا۔ ایک روز وہ مجھے اپنی مٹی سے ملوانے کے لیے اپنے گھر لے گئی۔ وہاں اس کی مٹی نے ہاتھوں ہاتھوں میں کہہ

# حنا

بہنوں کا اپنا نام

لاہور

جنوری 2015 کا شمارہ سالگرہ فہرست شائع ہو گیا ہے

جنوری 2015 کے شمارے کی ایک جھلک

”ایک دن حنا کے ساتھ“ ناز ”مبشورہ ناز“ کے شپ ورڈ

”میں صوفے پر بیٹھی تھی“ رشادہ کامل ناول

”دسمبر موسم گل ہو“ حیات بھاری کامل ناول

”بجائے عمارت“ قرۃ العین رائے کامل ناول

”رہا جو تیرا ہو کر“ فرحت شریک کا ناول

”زندگی تیرے دم سے“ ایم ایم کا ناول

”ماں ازلہ“ بی بی عاتقہ، روحا طرہ، روحا نے سدا اقیام اور نازش امین کے اگلے

”اک جہان اور ہے“ نسرۃ الدین علی کا شپ ورڈ ناول

”تم آخری جزیروہ ہو“ ام مریم کا شپ ورڈ ناول

اس وقت چلا

اس کے علاوہ پیارے نئی شے کی بیماری، انشا، شہزادہ کی دنیا کی معلومات، صفحہ سے حیدر سے اور سب کچھ آپ پر حنا پڑے ہیں

2015 جنوری کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی کتاب خانے سے لے لیں









# شاہجہاں گل محبت کا لاجپتی

شام ابھی ڈوبی نہیں تھی کہ وہ چلی آئی۔ اکیلی نہیں تھی، ساتھ میں وہ بھی تھا۔ وہ بھی شام جیسا تھا اور حورا اور دکھی۔ وہ خود سویرے جیسی بھی من چلی نکھری ستھری اور پرامین۔  
وہ دونوں جب صوفوں پر بیٹھ چکے تو میرے گھر میں زندگی مکمل ہو گئی۔  
”شام اور صبح تو اب تک مل ہی نہیں سکے ہیں۔“  
دونوں کو ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر پیشہ کی طرح سوچا۔  
صبح جیسی عبور، مانتاب کی آنکھیں ہلکی سی سوچی ہوئی تھیں۔ گل ذرا ذرا سرخ تھے جیسے بے اختیار بتے آنسوؤں کو بے دردی سے رکھتی رہی ہو۔  
شام جیسے اسفند عمر کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔

ناؤلٹ





اب کیا ہو؟" اب بولنے کی میری باری تھی سو دونوں سے سوال کیا۔  
 "کچھ ہوا ہی تو نہیں۔" سرمئی آنکھوں والی پری ساری دنیا سے ناراض لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے نظر ہٹا کر اسفند پر نکائی۔  
 "یہ کچھ نہیں سمجھتی صاف ہے اسفند کا لہجہ بے چارگی کا بوجھ لیے ہوئے تھا۔  
 "تو اس کا حل کیا ہے آخر؟" میں نے اپنی باری نبھائی سوال کیا۔

"وہ اس سے پوچھیں اور پوچھ کر مجھے ضرور بتائیں۔" کہتے ہوئے عیبو نے ذرا سا اسفند سے رخ موڑا تھا۔

"میں کسے بتا چکا ہوں یہ سمجھتی ہی نہیں۔" اداس آنکھوں والے شہزادے کی آنکھوں میں تکلیف سی جاگتی۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ تب تک تم لوگ تھوڑی دیر لی وی سے ٹائم پاس کرو۔" میرے پاس سوالیہ حتم ہو گئے تو میں اٹھ کر کچن میں آگئی۔  
 تھوڑی دیر بعد تین کپ ٹرے میں رکھ کر وائس لاؤنج میں آئی تو لی وی چل رہا تھا اور وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔

"بس یونہی لڑتے رہو گے؟ آخر کیا سوچا ہے تم دونوں نے۔" دونوں کو کپ پکڑاتے میں نے باری باری دونوں کے خاموش چہروں کو دیکھا۔  
 "امید لگاتا ہوں دعا میں کرتا ہوں، کوششیں جاری ہیں اس کے علاوہ اور کیا کروں؟" اسفند نے وہیمی سی آواز میں جواب دیا۔

"تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ آپس میں لڑتے رہتے ہو، میں جانتی ہوں کہ ایک دوسرے کے لیے ہی لڑتے ہو۔ مگر بہتر یہی ہے کہ تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرو۔ ان شاء اللہ سب اچھا ہو گا۔"

اس کے ساتھ میں انہیں سمجھاتی رہی۔ وہ

میرے پاس ان ہی لفظوں کو منسنے لگے تھے گویا مجھ سے مزید محبت، ہمت اور محبت کی صداقت و طاقت کا یقین لے کر جاتے تھے مجھے سنتے، کبھی لی وی پر نظر ڈالتے اور کبھی انکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے۔  
 دونوں چائے پیتے رہے۔ میرے کپ میں چائے ٹھنڈی ہوتی رہی اور میں بولتی رہی۔ دل میں دلی سسکیوں کو باہر نہ لانے کی کوشش میں میں بولتی رہی۔

اداس دل کی دیرانیوں میں بکھر گئے ہیں گلاب سارے  
 میری بہتی سے کون گزرا  
 بکھر گئے ہیں گلاب سارے

بدلتے موسم کی وہ خوب صورت شام جب اس ستم گر کی گاڑی میرے گھر کے گیٹ پر آکھڑی ہوئی، ٹھنڈی سانس بھر کر میں کھڑکی سے جی بال سنوارے اور بیٹھے آگئی۔

"کیسی ہو؟" کی چین ہاتھ میں پکڑے وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ پہلا جملہ پہلا سوال یہی ہوتا تھا اس کا۔ اس سوال کا جواب اتنا طویل ہوتا تھا کہ میں دے ہی نہ پاتی تھی۔ بس ذرا سا مسکرا کر اسے بیٹھنے کے لیے کہہ دیتی تھی۔

"یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا۔" وہ ہمیشہ آنے کی وضاحت دیتا تھا حالانکہ میں جانتی تھی کہ جب جب اسے میری یاد آتی تھی تو وہ یہاں سے گزرنے کا سوچتا تھا۔

"کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟" تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"آوہا دن تو یونیورسٹی میں گزر جاتا ہے۔ گھر آکر تھوڑے بہت گھر کے کام نمٹاتے ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر سویتی ہوں۔"

"ان سب کے علاوہ کیا کرتی رہتی ہو؟" اس کے اگلے سوال پر میں نے بے ساختہ سراٹھا کر اس کی

آنکھوں میں دیکھا جس کی آنکھوں میں آج بھی مجھے اپنا آپ نظر آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اتنے کاموں اور مصروفیت کے بعد بھی میرے پاس بہت سارا وقت ابھی بھی بچتا ہو گا۔

"لکھتی ہوں۔" میں نے کشن اٹھا کر گور میں رکھتے جواب دیا۔  
 "کیا۔۔۔؟"

"محبت۔" اس کے سوال اور میرے جواب کے بعد کچھ نہ رہا۔ وہ کی چین سے کھیلتا رہا۔ میں اسے دیکھتی رہی۔

"چائے پیو گے یا کافی بناؤں؟" بہت دیر بعد میں نے اپنے خالی پیٹ سے آواز نکالی۔  
 "کافی۔"

اس کا جواب سن کر میں کچن میں آگئی۔ وہ بھی پیچھے آ گیا۔

ہم دونوں آج بھی ذہنی اور دلی طور پر اتنے قریب تھے جیسے محبت کے اولین دنوں میں ہوتے تھے۔ اسی طرح آج بھی ہمیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنا آپ نظر آتا تھا۔ بس یہ تھا کہ بیچ میں صدیاں خاں ہو گئی تھیں جو نظر نہیں آتی تھیں مگر محسوس ہوتی تھیں۔

"تمہارا بھائی محبت کرنے لگا ہے تم جانتے ہو؟" کافی کی شیشی اٹھاتے میں نے ذرا سا مڑ کر احمد عمر کو بتایا تھا۔

"جانتا ہوں۔" کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکنا وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔

"تم سے زیادہ محبت کرنے لگا ہے یہ بھی جانتے ہو؟" میری بات پر اس بار اس نے جواب نہیں دیا۔

"میں جانتی ہوں۔" میں نے خود کھائی کی۔

"تو تم نے اسے یہ نہیں بتایا کہ ہمارے خاندان اور برادری میں وہ کر محبت نہیں کی جاتی۔" احمد عمر کھڑکی سے باہر جاسے ایسا کیا دیکھنے میں محو تھا کہ میں اس کی پشت کو دیکھ کر رہ گئی۔

"کیوں نہیں کی جاتی۔ محبت تو ہو جاتی ہے۔ کوئی خاندان، کوئی برادری، ذات، نسل، ایسا کچھ محبت کی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ تم نے بھی تو کی ہے محبت۔ اسی خاندان کے ہو کر۔" کافی پھینکتے میں ایک دم تیز ہو گئی۔

"میں بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اسے تم یہ سمجھاؤ کہ ہمارے خاندانوں میں رہ کر محبت ہو جانا بڑی بات نہیں جس محبت کو پاتا بہت مشکل ہے۔" کھڑکی کے پار سرد اند میرے میں اب بھی کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

گزرتے لمحوں کی چپ میں میں کافی بنا چکی تو وہ ایسی سانس کھینچ کر میری طرف مڑا۔ "اند میرے سے کچھ نہیں لیا جس اعصاب تھک جاتے ہیں۔" میری پر اگر ہم کافی پینے لگے۔

ہمارے ارد گرد ادھوری محبت کے ادھار لٹھے بے میل اڑتے بکھرتے مرتے رہے۔

"تمہاری بیوی تمہارا انتظار کر رہی ہوگی احمد عمر!" کافی ختم کرنے کے بعد جب وہ کرسی سے ٹپک لگائے آنکھیں موندے بہت دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا تو میں نے اس کے ہاتھ کی پشت سہلائی۔

"ہوں۔" جواب دیا عمر آنکھیں نہیں کھولیں۔  
 "وہ لڑکی کیسی ہے؟"

"میرے جیسی۔" بے ساختہ میرے لبوں سے نکلا تھا مگر احمد عمر نے اب بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔

"تم اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاؤ گی نا!"

"نہیں۔" میرے اس جواب پر اب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں میں سوال تھا، میں نے نظریں پھر لیں۔

"میں خود کو نہیں سمجھا سکی اب تک تو اسے کیا سمجھاواؤں گی۔" کہہ کر میں نے رخ پھیر کر آنکھیں پوری کھول کر ہونٹ بھیج لیے۔ سرد ہوا میری آنکھوں میں گھس کر نمی خشک کرنے لگی۔

"تو مت کہو کہ وہ تمہارے جیسی ہے۔" کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے رخ نہیں موڑا۔ میری آنکھوں



کی نمی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی۔ اس شخص نے نہ بلایا نہ ہی سنبھالا۔ کمرے سے نکل کر گیت کی طرف بڑھ گیا۔ کب اٹھا کر میں کہن میں آگئی۔ ہر طرف اس شخص کی خوشبو تھی جو میرا نہیں تھا مگر میں اس کے علاوہ کسی کی نہ تھی۔

\*\*\*

دھوپ کا اک شہر ہے۔ خیر پور۔  
کئی محبتوں کا مرکز ہے۔ شاہ عبداللطیف  
یونیورسٹی۔  
محبت کی شروعات۔ جانے کون سے خوش نصیب  
تھے۔

محبتوں کی انتہا صالحہ ابراہیم اور احمد عمرا

چھوٹی سی بات کی لمبی کہانی ہے لیکن سچی ہے۔ جس کے کردار آج بھی زندہ ہیں اور اپنے اپنے مرکز پر دلوں میں زندہ محبتوں کی سچائیاں لیے جی رہے ہیں۔  
محبت کی کہانی ہمیشہ سے شروعات میں دلچسپ اور انجام میں افسرہ ہوتی ہے۔ ان کی محبت کی شروعات بھی بہت خوب صورت تھی۔ جیسے شیشے کے گھر کے خالہ جوں میں دیے جلنے کا منظر۔ منہ خور کرنے جیسا۔ مہوت کر دینے والا۔

اور محبت کا انجام۔ جیسے کھنڈر قلعوں میں چلتی آندھیوں کی آوازیں۔

صالحہ ابراہیم اور احمد عمر جب ملے تو دیے جل اٹھے تھے۔ وہ ہر محبت کرنے والے کی طرح آندھیوں سے بے خبر ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں سے مجاہد کے پیام سننا اور کہنا۔ مل کر رنگ رتوں میں خواب موسموں میں بھیگنا۔ وہ اسی تسلسل سے صدیاں جیتے اگرچہ میں ظالم سلج نہ آیا ہو گا۔ اور محبت میں کچھ بھی بچ میں آجائے تو دروازہ بڑھ جاتی ہے یہ تو پھر احمد عمر کا پاپ کا تھا۔ وہ اچانک بستر مرگ پر آگئے تھے۔ دل کے درد سے لڑتے لڑتے ان کی آخری خواہش بھی ہوئی تھی جو ہر دم توڑتے باپ کی اپنے جوان بیٹے سے ہوئی ہے۔ ایک

ایسا شخص جس کی بیوہ بہن کی دو جوان بیٹیاں بھی مرتے وقت نظروں کے سامنے آجائیں۔ کوئی رستہ ہی نہیں مل سکا فرار اور نافرمانی کا۔ بابا کی خواہش پر اس نے نکاح بڑھو لیا کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر۔ دل اگر زخمی تھا تو سینے کے اندر تھا صالحہ کا دل ٹوٹنے کا خیال آیا بھی تو یہ اندیشہ بھی فی الوقت دل کے زخموں کے ہمارا نہیں چھپا لیا۔ یہ شادی تو بس بابا کی نظر میں تھی بابا کی فرماں برداری کے طور پر۔ اس کے احترام کا ثبوت۔ خاندان کی بھلا۔ اور بابا کی خواہش کا مان تھی۔  
دل کا تعلق تو بس صالحہ ابراہیم سے تھا۔ دل کا رشتہ تو وہی تھی۔

اسنی کا نکاح اس نے نہیں ہونے دیا۔ وہ خود صرف بائیس سال کا تھا۔ اسنی تو ابھی محض سترہ سال کا تھا میٹرک کا معصوم سالز کا۔ یہ ہوا کہ بابا کی خوشی کی خاطر

اسے پھپھو کی بیٹی سے منسوب کر دیا گیا۔ کراچی سے بابا کو لندن لے جایا گیا جہاں سے پانی پاس سر جری کے بعد وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر گھر آگئے سب کچھ دینا ہی تھا۔ بس دو زندگیاں اپنی ذاتی سانسوں کا جینے کا ذائقہ بھول گئیں۔ دکھ دل میں گھر کر کے بیٹھ گیا تھا۔ بد حالی کے سال ختم ہوئے تو کرچی میں جاب لگ گئی ایک خاموشی سی ردیوں کے بیچ فاصلے ترتیب دے کر بیٹھ گئی تھی۔ صالحہ کے گھر والے شادی کرنے پر زور دے رہے تھے۔ احمد عمر سے محبت ہونے سے لے کر سب کچھ کھونے تک کے ان سات سالوں میں اس کے والدین دنیا چھوڑ گئے تو وہ اپنا شہر چھوڑ کر خیر پور آگئی شاہ عبداللطیف یونیورسٹی میں اسے نوکری بھی مل گئی۔ رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا گھر بھی بنا ہی لیا۔

احمد عمر کے وہ بیٹے ہو گئے تھے۔ دس سال بعد وہ واپس خیر پور شفٹ ہو گیا۔ اب بھی ان کے درمیان محبت مسلسل تھی اور یہ تسلسل وہ توڑ نہیں سکتے تھے کیوں کہ جہاں محبت تھی اور گہری ہو وہاں ایسا ممکن تھا ہی نہیں۔ بھلے سے صالحہ گھر اور خاندان کی ناراضیاں طعنے الزام برداشت کرتی آرہی تھی۔ دوسری طرف

احمد عمر گھر باب بیوی بچوں اور زمینوں کے ساتھ دنیا داری میں کتنا بھی مصروف ہو گیا ہو مگر محبت تول کے اندر رہتی ہے نا۔ جو کہیں نہیں جاتی ابھی نہیں جاتی۔  
اسی محبت کو اب بھی پانے کے لیے احمد عمر صالحہ ابراہیم کے دروازے پہ جاتا ہے مگر دوسرے لفظوں میں محبت کے دوسرے معنی بتا کر واپس کر دیتی ہے۔ پہلی بار وہ اس سے کب ملنے گیا تھا۔؟

\*\*\*

اے ہم نفسا صبر بڑی چیز ہے لیکن ہوتے ہیں محبت میں زیاں اور طرح کے اس دن چٹی دھوپ نکلی تھی ٹیکسی تیز مسنری دھوپ۔

”وہ جب صرف میرا تھا تو روز ملتا تھا جب پر آیا بنا تو کتنے دن بعد آیا تھا میرے پاس۔“

میں انگلیوں پر گنتے لگی بار بار گنا۔ حساب غلط ہوتا چارنا تھا۔ بنائے آکر بیٹھا تو جون کا دن بارش لے آیا نہیں سے۔ بے رنگ پانی دل کے اندر برستا رہا تھا۔ باہر تو مسنری دھوپ ہی دھوپ تھی۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو احمد عمرا۔“  
”تم ہی ہو صالحہ لیجو میرے گھر کے حالات سے دل کی حالت تک کو جانتی ہو پھر میری باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہی؟“

”نہیں احمد عمر! تم غلط سوچتے ہو تم کہتے ہو میں تمہاری پہلی محبت ہوں تو مجھے پہلی محبت ہی رہنے دو۔ دوسری بیوی مت بناؤ شادی اور محبت میں بہت فرق ہے۔“  
”جی سانس کھینچ کر میں نے اپنی بات مکمل کرتے آخر میں بس اتنا ہی کہا۔“

”اور میں نہیں چاہتی اب کوئی فرق مزید ہم دونوں کے بیچ آئے۔“  
”کہہ کر میں خاموش ہو گئی وہ بھی سن کر بہت دیر تک خاموش رہا۔“

”بابا میری خواہش اب رد نہیں کریں گے۔ جب ان کی خواہش تھی تو میں نے انکار نہیں کیا تھا اب وہ

بھی میری خواہش۔“

”بات بابا کی نہیں اب بات دل کی ہے جو نہیں مانتا۔ یہی ہو گا نا کہ بنا کسی اعتراض کے ہماری شادی ہو جائے گی اور تم مجھے الگ گھر میں رکھو گے مگر آؤ گے میرے پاس اسی طرح جس طرح اب آتے ہو تب یوں ہو گا کہ میں تمہاری بیوی کو برداشت نہ کر سکوں گی نہ تمہارے بچے مجھے برداشت کر پائیں گے۔ ایسے تعلقات کس کام کے جن میں دن رات بس برداشت کرنا پڑے۔ برداشت کر کر کے ملے بھی تو بس چند لمحوں کا ساتھ۔ تھوڑے بل کی آسودگی۔ ان سے کہیں بڑھ کر میں ابھی خوش ہوں۔“ میں نے احمد عمر کی بات کاٹ کر تفصیل بتائی۔

”تم رہ لو گی میرے بغیر؟“ اس نے پوچھا۔  
”اب بھی تو رہ رہی ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ذرا دل

# محبت میں محرم

سمیرا حمید



قیمت 300/- روپے

مکانات کا پتہ  
کتاب خانہ (اکٹوبر 37) 32735021





”تم سے شادی۔۔۔“ احمد عمر نے جملہ ادھورا اچھوڑ دیا۔

”اس خیال سے نکل آؤ۔“ مجھے اس کی بات اچھی نہ لگی۔

”مجھے تم سے محبت ہے۔“ اس نے گھیرنا چاہا۔

”مجھے جینے دے پلیز۔“ میں جھنجھلائی۔

تھوڑی حکایت اور مختصر سوالوں کے بعد لمبی خاموشی انکار اور تکرار کے بیچ گھربٹا کے بیٹھ گئی۔ وہ جاسے لگا تو میں نے اسے روک کر کہا۔

”تم یہ سوچ کر مت جانا کہ دوبارہ پھر کوئی کوشش کر لو گے۔ بھلے سے ہزار بار اگر تم یہی سوال دہراؤ میرا جواب یہی ہوگا احمد عمر! ہر ترے دل سے ہر سوال تجھ ہی نکال کر جائے۔“ میری بات پر رک کر وہ میری آنکھوں میں جھانک کر اپنا آپ دکھاتا رہا۔ میں مسکرائی رہی۔ کافی دیر بعد سہی ہر سوال کا گلا گھونٹ کر وہ بھی مسکرائی۔

ہاں شکستہ لہجوں کی مسکراہٹ سے بہت پرے ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے ٹک گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

میرا سوچنا تیری ذات تک  
میری گفتگو تیری بات تک  
نہ تم ملو جو مجھے کبھی  
میرا دھوڑنا مجھے پار تک  
میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا  
تیری نظروں سے پار تک  
کبھی فرصت جو ملے تو آ  
میری زندگی کے حصار تک  
میں نے جانا کہ میں کچھ نہیں  
تیری پہل سے تیرے بعد تک

میرے ہاتھ میں ادھوری محبت کا ناقص مسودہ تھا کہ وہ چلی آئی سوہ بھی محبت تھی اور ازل کی طرح ادھوری۔ وہی محبت جو کبھی بھی شام جیسے شخص کے بغیر میرے پاس نہیں آتی تھی۔

مگر آج وہ اکہلی تھی۔ مجھے بے ساختہ اسفند کی یاد آئی کہ اس وقت کہاں تھا اور کیسا لگ رہا ہو گا عبید کے بغیر۔ سلام دعا کے بعد وہ میرے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

”کیا لگ رہی ہیں؟“ میری مصروفیات کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔ میں جواب نہیں دے سکی۔ اس کے بکھرے چہرے کو دیکھتی رہی۔ آج یونیورسٹی سے چھٹی تھی ہم دونوں ہی فرصت سے تھیں۔ بے سروپا باتیں کب یا معنی گفتگو کا رخ اختیار کر گئیں وقت نے ہم کو محسوس ہی نہیں ہوتے دیا۔

”میرے دل میں بہت بے چینی ہے۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں اور بھاگ ہی جاؤں گی صالحہ! میری کیفیت عجیب ہو گئی ہے۔ میں چلتی ہوں تو ہانپ جاتی ہوں، سوتی ہوں تو تب بھی جاگ رہی ہوتی ہوں۔“

”سننے لگوں کھانے پینے لگوں؟“ کہیں آؤں جاؤں یا ایک جگہ بیٹھی رہوں۔ ہر کام میں یوں لگتا ہے کہ جیسے میں بہت تنگنے لگی ہوں۔ کوئی لن نہ کھا سا بوجھ ہے جو بڑھتا جا رہا ہے۔ دنیا تک لگنے لگی ہے میں کھلے آسمان تلے جانا چاہتی ہوں۔ بہت سونا اور بہت ہنسنا چاہتی ہوں! میں ایک لادن میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔“

جب تک عبید نے بات مکمل کی میں ناقص انسانے کے مسودے کو سمیٹ چکی تھی۔

”آپ نے کبھی محبت نہیں کی نا۔ اچھا کیا کہ محبت سے دور رہیں آپ۔“ عبید کا اگلا جملہ میرے دل کے شیشے پر پھرتی طرح لگا۔ میں دل میں کرچیوں کی جھپٹ کو برداشت کرتی رہی اور چپ رہی۔ محبت کی وجہ سے اب تک اپنے رشتہ داروں کے استے دوسرے برداشت کے تھے۔ کئی دعوے، بہت آنسو دیکھے تھے۔ اس شخص کی جدائی برداشت کرتی آ رہی تھی جس کی تصویر دل کی دیوار پر آج بھی پہلے دن کی طرح صاف ستھری نظر آتی تھی۔ اتنا کچھ برداشت کرنا ہے زندگی میں تو محض ان لفظوں کو برداشت کرنا کون سی بڑی بات تھی۔ دن کی دھوپ ڈھلنے کے سفر کی جانب گامزن تھی۔ میرا جی بھر آیا۔

”نہیں لگتا ہے میں نے محبت نہیں کی؟“ عبید

نے انسانہ اٹھا کر ابھی پڑھنا شروع نہیں کیا تھا کہ میں اسے زبانی بتانے لگی۔

”جب زندگی میں محبت کی شدت بڑھ جاتی ہے تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اسی طرح دنیا تک ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ کوئی ہماری کیفیت سمجھ نہیں پاتا نا نہ منزل ملتی ہے نہ سفر ختم ہوتا ہے تب نہ چاہتے ہوئے بھی صبر کرنا پڑتا ہے اس وقت صبر ہماری ضرورت نہیں بھجوری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ ہوتا جو نہیں۔ صبر کو اپنا کر ہم بہت خاموش ہو جاتے ہیں۔ اتنے سنجیدہ کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے کبھی محبت نہیں کی۔“ بہت خاموشی سے آنسوؤں نے میرے گالوں پر رستہ بنالیا تھا۔ عبید نے ایک نظر اٹھائی اور سب سمجھ گئی۔

”مگر میں آپ جیسی نہیں بن سکتی۔ مجھ میں صبر نہیں آ سکتا میں۔ میں نہیں۔“ عبید کے بال مجھے ہوئے تھے۔ وہ بکھری بکھری باتیں کر رہی تھی۔

”میں بھی تمہاری طرح ہوا کرتی تھی۔ میری سوچ بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھی کہ میں چند دن سخت خفا رہوں گی اور مجھے منالیا جائے گا۔ میں کچھ عرصہ او اس رہوں گی اور کوئی شخص کو ششیں کر کے میری او اسیاں لار کر دے گا مگر آسمانوں سے پرے لوح محفوظ میں ایک قصہ رقم ہوتا ہے عبید! جس میں ایک لفظ کی تبدیلی پر بھی ہم قادر نہیں ہوتے تو۔ تو جانے کیوں نظر آتے ہیں۔ پھر بھی کیوں او اس رہتے ہیں۔ سمجھ کیوں نہیں لیتے۔ صبر کیوں نہیں کر لیتے۔“ ہم باتیں کرتے رہے اور لاؤنچ کی شیشے کی دیوار کے باہر شام نے اپنے پر پھیلانے شروع کر دیے۔

”تو کیا میں بھی ہر مرحلے سے گزر کر پھر آپ جیسی بن جاؤں گی؟“ عبید مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت جاگ۔ وہ ایک دم صالحہ ابراہیم کی تصویر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی۔ ہمیشہ تصویر کے شیشے میں اپنا عکس نظر آتا ہے تو آدمی ایک لمحے میں خود کو پہچان کر چند ساعتیں خوفزدہ کیوں ہو جاتا ہے۔ عبید کی بات کا میں نے جواب نہیں دیا۔ اسے شیشے کے عکس میں

خود ہی جواب مل گیا تھا۔

”میں گھٹ گھٹ کے مرجاؤں گی صالحہ!“

”میں مر گئی ہوں؟“

”آپ تو گھٹ گھٹ کے جی رہی ہیں۔ مرنے کا نہیں کب جی تھیں۔“ عبید کی بات پر یہ سوال و جواب کا سلسلہ فی الوقت۔ دم توڑ گیا۔

رات آئی اور دم توڑتی شام کو نکل گئی۔ لمحے خاموشی کی جوبلی میں گونجتے رہے۔ عبید پیرسار کے بیٹھ گئی تو میں اٹھ کر رات کا کھانا بنانے کچن میں آئی۔ تب ہی شام کی چائے کا خیال آیا۔

”میں کل گاؤں جا رہی ہوں اور آپ اسے نہیں بتائیں گی۔ نہ ہی میرا ہاتھ دیں گی۔ ٹھیک ہے؟“ ٹیبل سے ایک چھوٹا سا گلاس اٹھائے وہ اس پر کندہ تحریر پر نظر پڑا لے ڈال کر کچن آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ بکٹ اور نمکو کی دو پلیٹیں ٹرے میں رکھ کر میں واپس لاؤنچ میں آئی۔ ٹرے ٹیبل پر رکھی اور پھر سے کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔

”ٹی وی کھول لو عبید۔“

”نہیں۔“

”واپس کب آؤ گی؟“

”نہیں آؤں گی۔“

”کیوں؟“

میں وقت بتانے کو وحشت گھٹانے کو سوال کرتی رہی کہ بے دلی سے جواب دیتے دیتے چپ ہو گئی۔ چائے بن گئی تو یہ کپ لے کر لاؤنچ میں آئی۔ وہ صوفے پر سو چکی تھی۔ ہاتھ میں نیلے رنگ کا گل دان تھا جس پر ہاتھ نہیں کس مفکر کا جملہ تحریر تھا۔

”ہر نارمل انسان کے اندر ایک پاگل چھپا ہوتا ہے۔“

☆ ☆ ☆

عبید چلی گئی۔ دوسری صبح اسفند عمر آیا۔

”تم نے اسے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ بتائے چلی گئی؟“

سلام دعا اور یہاں وہاں کی بہت باتیں ہو گئیں تو میں



نے اس سے وہ سوال کیا۔ جو مجھے پتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے یہی پوچھنے صبح میرے پاس آگیا تھا۔ میں کیوں پتائی بھلا عبیدر ماہتاب کا پتا۔ میں۔ جو وعدے کی پابند تھی۔

”میں نے اسے یہ بتایا کہ گھر میں کوئی نہیں مان رہا۔ سب سے کٹ کر اس تک پہنچتا ہوں تو بقول اس کے پھر اس کے گھر والے نہیں مانیں گے۔“ اسفند عمر کی شام جیسی آنکھوں میں اس وقت فقط خالی پن تھا۔ میں اس کے کپ میں چینی ملائی رہی اور چپ رہی۔

”آپ کے پاس تو اس کا پتا ہو گا۔“ اسفند کے لہجے میں اداسی بھلاں بھلاں کرتی محسوس ہوئی۔

”نہیں ہے۔“ کپ سے چچہ نکال کر میں نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”میں باہر جا رہا ہوں۔“ پہلا گھونٹ لے کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

”مست جاؤ۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ اسفند نے میری التجا سنی ہی نہیں چائے پیتا رہا۔ آسمانوں میں جانے کیا کھو جاتا رہا اور تھک کر ٹیبل پر بازو رکھ کر ان میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ میں محبت کی داستان کو تیزی سے آگے بڑھاتی قلم چلاتی رہی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ ہم دونوں بوضوح میں نہارے تھے۔ میں لکھنے میں مگن رہی وہ اٹھ کر جانے کب چلا بھی گیا۔ قلم سے سیاہی ختم ہوئی تو ارد گرد دیکھا۔ ارد گرد کچھ نہیں رہا تھا۔

موبائل کی بیل نے شور مچایا تو اسکرین پر دیکھا۔ عبیدر کا لنگ جگمگا رہا تھا شام جیسے شخص کے خالی بت میں بھلاں بھلاں کرتی اداسی میرے پاس ہی نہیں گونجی۔

”آپ کیسی ہیں؟“

”تم کیسی ہو عبیدر؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ یہاں بہت سردی ہے۔“

عبیدر اپنے باہر کا حال اور باہر کا موسم بتا کر خاموش ہوئی۔

”ہوں۔“ میں اپنے سامنے بڑے انسانے کو دیکھنے لگی جہاں سیاہی ختم ہو گئی تھی وہاں مجھے بہت کچھ

لکھنا تھا۔ جب کچھ نہیں رہتا تو ایسی کیفیت میں دل کے اندر برستے موسموں کو لکھنا تھا۔

جب کوئی ساتھ نہیں رہتا اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی صبر کر لیتے ہیں۔ ایسی حالت کو لکھنا تھا۔

شدتوں سے تنگ آکر اپنی جگہیں چھوڑ کر بھاگنے کو جواز بنا کر لکھنا تھا ابھی تو۔

”میں ابھی؟“ تھی تھی سوچا آپ سے بات کر لوں اور۔“ عبیدر کی بات ادھوری ہی رہی۔ اور کیا لکھنا

تھا؟ میں کہانی میں کم تھی۔

”اور مجھے لگا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا اسفند

آپ کے پاس آیا بیٹھا ہو جیسے۔“ عبیدر کی بات پر کہانی کے سارے لفظ صفحوں سے اڑ گئے۔ میری نظریں خالی صفحوں کی خالی سطروں پر ساکت رہ گئیں۔

”ہاں آیا تھا اسفند۔“

”کب؟“ دوسری طرف سے یوں محسوس ہوا عبیدر

فون سے جیسے نکل آتا چاہتی ہو۔

”تھوڑی دیر پہلے

”بیٹھا ہوا ہے اسفند؟“

”نہیں۔ ابھی ابھی گیا ہے۔“ میرے جواب پر

دوسری طرف سے مجھے سائیں سائیں سنائی دی۔

پوری کائنات گونگی ہو گئی۔ میری نظریں خالی کپ کے

پاس بڑے آنسوؤں کے ڈھیر پر پریں۔ مجھے مزید یہ بھی

لکھنا تھا کہ جو لوگ رو رو کر تھک جائیں تو یہ بھی بھول

جاتے ہیں کہ کہاں کہاں بڑھال ہو کر سوئے تھے اور

سوئے سوتے کہاں رو پڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

”ہماری محبت مکمل ہونے کا وقت ہی نہیں آیا

کیونکہ ہمارا ملنا مقدر میں لکھا ہی نہیں تھا ورنہ اگر

نصیب میں ہوتی منزل تو اتنا وقت تو مل ہی جاتا کہ ہم

اپنے لیے دوسروں سے لڑ سکتے۔ ہمارا مقدمہ تو حکایت و

ولا مل سے محروم ہی رہا۔ مگر عبیدر اور اسفندی کے لیے

میں لڑنا چاہتی ہوں۔ اس محبت کو ادھورا نہ رہنے کی

کوشش ایک بار ضرور کروں گی۔“

یہ دھوپ شہر کا سوتلے دن تھا۔ کئی دنوں سے

میرے گھر میں تنہائی ہو گئی تھی۔ وہ دونوں کئی

دنوں سے نہیں آئے تھے اور میں کئی دنوں سے احمد عمر

کا انتظار کر رہی تھی جس روز آیا تو سب سے پہلے بات

یہی کہی۔ مجھے انسانے کا انجام لکھنا تھا۔ مجھے محبت کا

ساتھ دینا تھا۔ میری بات سن کر احمد عمر کی آنکھوں میں

”تھماری ہر بات مان لیتا ہوں۔“ کا جواب ابھرا۔ کچھ

ہی دیر میں چادر لپیٹ کر میں اس کے ساتھ گاڑی میں

”نہیں لگتا ہے ان دونوں کی محبت گہری ہے؟“

”ہاں بہت گہری ہے۔“

”ثبوت کیا ہے؟“

”تم ثبوت مانگ رہے ہو۔ ان دونوں کی محبت کا

ثبوت مانگ رہے ہو؟“

”نہیں۔ میں ان دونوں کی محبت کی گہرائی کا ثبوت

مانگ رہا ہوں۔“

”اسفی اداس رہتا ہے اور عبیدر دن میں چالیس

کالیں کر کے اس کا پوچھتی ہے یہ کافی نہیں۔“

”ہاں یہ کافی نہیں۔ میں بھی باہر رہوں تو گھر پر

چالیس کالیں کر کے بیوی کی طبیعت پوچھتا ہوں۔ کبھی

پاپا کا بھی بچوں کا ان کی پڑھائیوں کا کسی مہمان کے

آنے جانے کا پورے گھر کی خیر و عافیت پوچھنے کے لیے

مجھے ایسا کرتا رہتا ہے۔“

”ہاں تو تم ان سے محبت کرتے ہو نا۔ ان سے

بہتر سے ہوئے ہو۔“

”وہ تم ان سے ایسی محبت نہیں جیسی تم سے ہے۔“

”مجھ سے کیسی ہے؟“

”ایسی محبت جسے ثبوت کی ضرورت نہیں۔“

سوال جواب کی اس تکرار میں احمد عمر کے آخری

جواب کو سن کر مجھے خاموش ہونا پڑا۔ گاڑی سیدھی

سڑک پر رواں دواں تھی۔ ہم دونوں کی نظریں بھی

سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔

”ان دونوں کی یہ اداسی اور چاہستہ وقتی ہے صالحہ! وہ

لڑکی اپنے ساتھ بچپن سے اسفی کا نام سنتی اسے چاہتی

آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ نا انصافی نہیں ہونی چاہیے۔“

احمد عمر کے جواب میں آج کی نسل کا وہ خاندانی

بزرگ بول رہا تھا جو پچھلی نسلوں کے بزرگ بے سمجھے

اپنے بچوں کی دلوں کی حالتوں اور چاہتوں سے بے خبر

اپنی مرضی سے فقط اپنے اونچے سطحوں کی لارج رکھنے

اور اپنے نام کی حاکمیت کی بقا کے لیے اٹے سیدھے

فصلے کرتے تھے۔ جن میں احمد عمر اور اسفند عمر کے بابا

بھی شامل تھے اور اب احمد عمر بھی۔

بہر حال میں نے احمد عمر کی بات پر ذرا دھیان نہیں

دیا۔ بھلا دو دنوں کی محبت کے لیے اس لڑکی کا کیا کام۔

اور اب بہت دیر سے میں پرانی حویلی کے جدید طرز

کے ڈرائنگ روم میں عمر سردار کے سامنے بیٹھی

اور حوری محبت کا مقدمہ لیے بولتی جا رہی تھی۔ احمد عمر

اور میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے جامنی رنگ

کے صوفوں پر بیٹھے تھے اور ہمارے بیچ عین اوپر سروں

پر نارنجی روشنیوں والا فالوئس لٹک رہا تھا۔ چھت پر

لگے چار پنکھوں کی ہوا سے روشنیاں ہولے ہولے لہلہ

رہی تھیں۔

”کون ہے وہ لڑکی؟“ اونچے شعلے والے کے ہونٹ

واہوئے بھی تو بس یہی سوال پوچھنے کے لیے۔

”جہاں میں پڑھاتی ہوں وہاں پڑھتی ہے۔“

”اس کے اماں بابا نے پڑھائی کے لیے ہی بھیجا ہو گا

نا اسے۔“ جملہ مکمل کرتے ہی کھن موچھوں تلے لیوں

پر عجیب مسکراہٹ آئی۔ میں اس جملے کی تہہ تک

چھٹی تو میری ہتھیلیاں بھیگ سی گئیں۔ سامنے سر

جھکائے بیٹھا احمد عمر ویسے ہی بیٹھا رہا۔ میں اکیلی ہی اس

کنسرے میں کھڑی تھی۔

”آپ کا مطلب ہے کب۔“

”میرا مطلب آپ سمجھ گئی ہیں استانی جی! اور آپ

یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ جن کے لیے یہ جنگ لڑنے آئی

ہیں۔ وہ آپ کے دائیں بائیں بھی نہیں سو آپ کے

لفظوں میں قطعاً ”کوئی وزن نہیں۔ آپ جتنی بھی کہانی

تیار کر کے آئی ہیں اس کا جواب بس اتنا ہی ہے کہ

بالفرض آپ کی کلاس میں اگر دس شاگرد ہیں آپ ان کا



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### مہمان خصوصی کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

تو وہاں پر اجنبیت آجاتی ہے۔ میرے دل میں بھی اس وقت کچھ نہیں تھا سو آنکھوں میں اجنبیت آگئی۔

”میر خاندان کی سب زندگیوں کے بچ اور وائس بائیں دو صدیاں راستہ بند کیے کھڑی ہیں۔ دو سو سال۔ ان دو صدیوں سے باہر نکلنے کو کوئی کسی کو راستہ نہیں دے گا۔“

”تم۔ تم لوگ۔ پرانی حویلیوں میں رہ کر نئے دور میں جینے والے بدبودار لوگ۔“ میری نظریں سامنے بیٹھے شخص سے ہم کلام ہوئیں۔ وہ پڑھ لیتا تھا میری آنکھوں کا ہر تاثر۔ پڑھ کر ایک دم اداس ہوا۔

”مجھے معاف کرو۔“ اس کی آنکھیں جو اب ”گویا“ ہوئیں۔

”ان پرانے پتھروں پر کندہ گھٹیا روایتوں کا تصور نہیں۔ سارا تصور تم لوگوں کا ہے جنہیں تم روز جوڑتے ہو۔ ہاتھ جوڑ کر ان حاکموں کو صبح شام کہتے ہو کہ یہ نہیں ہوگا۔ وہی ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔“ میری آنکھیں سرد تھیں۔ ان میں ابھرتا تھا تاثر سلگتا ہوا تھا۔

”مجھے معاف کرو۔“ تاریخی روشنی سامنے والے کی آنکھوں میں چہرہ رہی تھی۔

”مجھے تم سے نفرت ہے۔ تمہارے باپ سے تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد سے۔“ میں عبور کو چھوڑ کر اپنے لیے لڑنے بیٹھ گئی۔

”مجھے معاف کرو۔“ احمد عمر کی آنکھوں میں ایسے لمحے لہرانے لگے گویا ابھی ضبط کھو کر وہ بہت سارا درد دے گا۔

”احمد عمر! جب جدید دور میں قدیم محبتیں کھول جائیں گی تو ہم تم کہیں نہیں ہوں گے۔ اگر ہوں گے بھی تو لوگ مزید تمہ خاک و بادیں گے ہمیں کیا ملا۔ ہم کیوں جتنا بھی جیسے سلگتے رہے۔“

کہتے کہتے میری میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ سنتے سنتے احمد عمر نے آنکھیں موند لیں۔ ہم آج بھی ساتھ تھے پاس پاس تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھتے مگر صدیوں کے کناروں پر کھڑے ضبط کرتے کرتے تاریخی شعاعوں تلے آپس

امتحان لے چکی ہیں۔ نتیجہ بھی آپ نے ہی نکالنا ہے تو مجھے بتائیے ذرا کہ ایک شاگرد کو رانگہ چھوڑ گیا ہے تو آپ فقط ہمدردی کے تحت باقی شاگردوں کے نمبروں سے ذرا ذرا سے نمبر اس بالائق شاگرد کو دے کر آگے کر دیں گی۔ باقی ”حقیقتاً“ نہیں کریں گی۔ کیوں کہ آپ جانتی ہیں ایسا کرنے کے بعد تا عمر آپ کے ضمیر پر ایک بوجھ رہے گا سو میں بھی اپنے گھر میں نا انصافی نہیں کر سکتا۔ مجھے بھی ضمیر کا بوجھ قبول نہیں۔“

میر عمر سکندر بول کر خاموش ہوئے تو میں بھی خاموش رہی مجھے لگا میں لڑنے نہیں آئی تھی نہ ہی کوئی کوشش کرنے آئی تھی میں تو بس یہاں بسنے آئی تھی۔ میری زبان بند بھی نہیں اُٹھ سکتی تھی۔ میں نہیں لڑ سکتی تھی۔ میرا سامنا فقط میر عمر سکندر کے لفظوں اور دلائل سے نہیں تھا میرے سامنے تو پرانی روایتیں کھڑی تھیں۔ بوسیدہ عہد تھے جن کی سازشوں نے کئی محبتوں کو اوجھڑا کر رکھا تھا۔ پرانی حویلی کے پرانے لوگ آج بھی پرانے عہد نبھاتے جینا چاہتے تھے۔

”میں اگر کروں وہیں پر اسفند کی شادی تو اس کی منگ کہاں جائے گی“ آپ بتائیں۔ اور اگر آپ کہتی ہیں کہ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا ہی ہے۔ دو صدیوں سے ہمارے خاندان کے اندر نہ دوسری برادری کی عورت آئی ہے نہ کسی دوسرے خاندان میں ہم نے کوئی بیٹی بہا ہی ہے۔ دو صدیاں مطلب دو سو سال استانی جی! اسفند عمر صرف دو سال یونیورسٹی میں پڑھ کر اپنے خاندان کی دو سو سال کی روایت بھول گیا۔ قصور تو سارا اس کا ہے نا۔“

ابھی اتنا کہا تھا کہ ان کی موبائل پر بیل ہوئی۔ ٹھوڑی دیر کے لیے معذرت کرتے وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اب ڈرائنگ روم میں سرد تھائی اور بھیگی اداس رہ گئی۔ تاریخی شعاعیں ہمارے سروں کے اوپر جھول کر جانے کیا کہنا چاہتی تھیں۔

”قصور تو سارا اسی کا ہے۔“ اپنے باپ کا آخری جملہ بزرگ احمد عمر نے میری جانب نظر اٹھائی۔

دل سے کسی لمحے محبت اور نفرت لگاؤ یا گھاؤ نکال دو

ماہِ خواتین وائٹنگ 146 جنوری 2015ء





میں لڑتے اور معافی مانگتے۔ جب پرانی محبتیں کھولی جائیں گی تو کیا تاریخ میں یہ منظر بھی نکلے گا؟ اگر ملے گا تو کیا نے لوگوں کے دل کچھ لکھوں کے لیے بند نہیں ہو جائیں گے۔ جیسے اس وقت صالحہ ابراہیم اور احمد عمر کے دل بند ہو رہے تھے۔

\*\*\*

ایک شخص سے ہزار سالوں کے بعد ملنا ایسا ہوا کہ ہم کوئی وعدہ نہ کر سکے ہم ایک دوسرے سے محبت کے باوجود ہم ایک دوسرے کی تمنا نہ کر سکے سردی کے سارے دن گزر گئے۔ جس روز ہمارا تکیہ اس روز وہ ہماروں جیسی لڑکی بھی لوٹ آئی۔ وہ جب بھی آتی تھی اسکی نہیں آتی تھی اور ہمیشہ کی طرح اسفند کو دیکھا تو مجھے احمد عمر یاد آیا۔ فون کر کے میں نے اسے بھی آئے کا کہا۔ جب تک وہ آیا تب تک میں ان دونوں سے ایک دوسرے کی شکایتیں سنتی رہی۔

”تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہی ہوگی ورنہ میں تمہیں تمہاری محبت واپس کر دوں گی اور ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔ مجھے رونا ترنا نہیں آتا۔ زندگی جینے کے لیے سکھوں کو ڈھونڈنا چاہیے۔“

عبید کے ہاتھ میں نیلا گل دان تھا۔ اس وقت اس کے نازل انسان کے اندر کپاگل پن پور رہا تھا۔

”اور اگر شکستگی مقدور میں لکھی جا چکی ہو تو؟“ میں اس سے سوال نہ کر سکی۔ سو میری سوچ بے جواب میں رہی۔

”شادی سب کچھ نہیں ہوتی عبید! میں نے پہلی بار ان دونوں کے بچہ داخلہ کی۔“

”شادی سب کچھ ہوتی ہے صالحہ! اس نے مجھے خواب دکھائے تھے۔ پہلے اس نے مجھے پھنسیا تھا محبت میں۔ اسے ہی کوشش کرنی چاہیے۔ اسے لڑنا چاہیے۔“ کہتے ہوئے وہ اسفند سے لڑ رہی۔ جب تک اپنی بات مکمل کی ہاری باری تینوں کشن اسفند کو

دے مارے۔ اسفند مسکراتا اسے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر لاؤنچ میں خاموشی رہی۔ مجھے یاد آیا یونیورسٹی کا وہ پہلا دن جب عبید میرے پاس اسفند کی شکایت لے کر آئی تھی۔

”میں اب لڑکا مجھے ہر وقت گھورتا رہتا ہے جہاں بھی جاؤں وہاں آسودہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ٹھیک سے مجھ سے برصغیر نہیں ہوتی۔“ وہ اپنی لکڑیوں پر نظریں ٹکائے کہتی ہوئی اس وقت پرانے کی اسٹوڈنٹ لگ رہی تھی جس کا سموسہ اسفند نے چرا کر کھالیا ہو۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اسفند کو سزا دی جائے۔

”یہ یونیورسٹی ہے عبید! یہاں آپ کو اپنے مسئلے خود سلجھانے ہوں گے۔“ میرے جواب پر وہ پھر بھی یقین نہ رہی تو مجھے ناچار اسفند کو بلا کر اس کے سامنے بٹھاتا ہوا۔

”میں اب مجھے یہ اچھی لگتی ہیں۔“ دھوپ شہر کا باسی۔ بے ساختہ بولا تو در دس سے آنے والی بے اختیار اسی طرح پھر گئی تھی جیسے اس وقت بھری ہوئی بیٹھی تھی۔

وہ پہلا دن پہلی شکایت پہلا اعتراف مجھے آج بھی یاد تھا۔ اس کے بعد دونوں کی لڑائی کب سلجھی۔ کب دوستی ہوئی اور رابطے کب برید کر محبت کی سرحد عبور کر گئے۔ یہ میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ ہاں مگر بہت سارے دن بعد وہ دونوں میرے گھر آئے۔ عبید رتو ڈیرو شہر کے قریب ایک گاؤں سے یہاں پڑھنے آئی تھی اور ہاسٹل میں رہتی تھی۔

جس دن وہ دونوں میرے گھر آئے تھے تو احمد عمر کچھ ہی دیر پہلے اٹھ کر گیا تھا۔ اس کی خوشبو ابھی تازہ تھی میرے گھر میں۔ ویسی ہی خوشبو مجھے اسفند عمر سے بھی آتی تھی۔ تب ہی مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلی کہ یہ لڑکا اگر دل کے قریب رہتا ہے اور اس کی آنکھیں کسی اور کی آنکھیں یا دلاتی تھیں تو اس کا رشتہ اسی شخص سے تھا جو میرے دل میں تھا مگر زندگی میں نہیں تھا۔

ان دونوں نے کب مجھ سے دوستی کرنی۔ کب میں

میں کے بجائے ان کے لیے فقط صالحہ بن گئی یہ بھی پتا نہ چل سکا۔ میں ان کے رازوں میں شریک ہوتی رہی۔ وہ مجھے اپنی ملاقاتوں کا گواہ بناتے رہے اور یہ راستہ میں نے خود کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ میرے گھر میں ان ہی کے دم سے رونق بھی ڈگر نہ تھی تھائی کا راج تھا اور وہ اسی کی حکومت ہوا کرتی تھی۔

”آپ اجازت دیں تو میں یہ توڑ دوں۔“ عبید کی آواز میں نے دیکھا۔

”مجھے نہیں۔“ اس کے ہاتھ سے گل دان لے کر میں نے کارروائی ٹیبل پر رکھ دیا۔

”آپ اس کی جگہ تبدیل کر دیں۔ مجھے یہ یہاں اچھا نہیں لگتا۔“ وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے اپنی حالت کو نظر انداز کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

”جو چیز اچھی نہ لگے اسے توڑ دینا چاہیے؟“

”ہاں۔ اور جو شخص دھوکا دے اسے چھوڑ دینا چاہیے۔“ میرے سوال کے جواب پر اس نے ایک لمبی نظر اسفند پر ڈالی۔ وہ اس جملے کے جواب میں بس اپنے یوں کو دیکھتا رہا۔

”ایسا کر سکو گی تم؟“ میں نے اس کا امتحان لینا چاہا۔

”کر کے دیکھوں گی۔“ کندھے اچکا کر وہ لا پرواہی سے بولی۔ میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اب پوچھنے کو مزید کیا پڑتا تھا۔ شاید کچھ نہیں۔

”یہ دھوکے باز ہے۔ بے وفا ہے۔“ اس جملے پر اسفند اور میں نے اسے تڑپ کر دیکھا۔ اب وہ بولنا شروع ہوئی تو کوئی ہر گزر گئے۔

”آپ جانتی ہیں ایک لمبا عرصہ یہ میرے پیچھے پڑا رہا تھا صالحہ! ہاسٹل کے گیٹ پر مجھے ایک دن میں چار بار نظر آتا تھا۔ یونیورسٹی کا پورا نام مجھ سے بات کرنے کے پہلے وہ خود تار مارتا تھا۔ میں کب تک بیٹھے امرت سے پہلو تھی کرتی۔ عورت کر سکتی ہے کبھی محبت سے الگ نہ ہلا کر مجھ سے مخاطب ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ کر بھی گیا۔ ثابت ہوا کہ اس نے پھنسیا مجھے۔ اور جب ہم کسی کو جانا ہوا اس کا اس کے ساتھ نام گزارتے ہیں۔ میں

نے بھی اس کے ساتھ اپنا وقت بانٹا اور ایک دن جان لیا اسے۔ اس نے فقط اپنی پڑھائی کا سال پاس کرنے کے لیے مجھے استعمال کیا تب ہی میرا ساتھ چلا۔ میں اس کو شادی کے لیے اس لیے کہتی ہوں کہ یہ مجھے ثبوت دے اپنی اس چاہت کا۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی تا تو اپنے باپ بھائی اور خاندان سے تو کیا پوری دنیا سے لڑتی لگیوں کہ یہ دنیا کا نہیں میرے دل کا معاملہ ہوتا ہے۔ تو اس کے دل کا بھی معاملہ تو کیوں نہیں ہوتا اپنے رسموں رواجوں اور اپنے رشتوں سے اپنے لیے میرے لیے محبت کے لیے۔ میں بتاؤں آپ کو کہ یہ اس لیے نہیں لڑتا اس کے پاس بہت نہیں بہت اور طاقت آتی ہے صداقت سے۔ سو سچا تو اب یہ رہا ہی نہیں۔ کیوں کہ اب میں اس کے لیے پیار نہیں پریشانی بن گئی ہوں۔ آپ نے کہا محبت میں شادی ضروری نہیں۔ میں کہتی ہوں اسی لیے ضروری ہے۔“ وہ سانس لینے کو رہی۔

”آپ نے نہیں کی محبت میں شادی۔ اس لیے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سچے تھے تب شادی کی کوئی اوقات نہیں رہتی مگر میرے اور اسفند کے معاملے میں شادی ضروری ہے۔ کوئی ایک دم سے بے وفا نہیں ہوتا نہ ہی اچانک سے دھوکے باز بننا ہے اس راہ تک آتے آتے اسے کن مرحلوں سے ہو کر آنا پڑتا ہے یہ اس کا مسئلہ ہے۔ اسے میں نے یہی کہا تھا کہ سب مسئلے ٹٹا کر ساری مجبوریوں سمجھا کر ہی مجھ تک آنا پڑے۔ بے وفا نہیں بننا دھوکا نہیں دینا میں انتظار کروں گی۔ میں آخری دم تک اس کا انتظار کر سکتی تھی صالحہ! مگر اب یہ کتاب ہے گھر والے نہیں مانتے۔“

بولتے بولتے عبید چپ ہو گئی۔ میری حالت ایسی تھی جیسے پتا نہیں کتنے عرصے تک میں کوئی حرکت نہیں کر سکوں گی۔ اسفند دھیمی سی مسکان لے لے اسے بولتے سن رہا تھا۔ وہ چپ ہو گئی تب بھی مسکراتا رہا۔ عبید کی باتوں میں کتنی صداقت تھی یہ جاننے کے لیے میں نے اسفند پر نظریں مرکوز کر دیں کہ اب وہ جواب شکوہ بیان کرے تاکہ میں نتیجہ نکل سکوں۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں؟

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیرم کو الٹی، نارمل کو الٹی، کمپیوٹ کو الٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.poksociety.com](http://www.poksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/poksociety](https://fb.com/poksociety)



[twitter.com/poksociety1](https://twitter.com/poksociety1)

دروغ بوسیدہ ہونے لگے تھے۔ اس کا اختتام کرنا تھا اور انجام کرن لفظوں میں لکھنا تھا یہ سوچ مجھے پریشان کر دیتی تھی کیوں کہ نئے دور کے درکار محبت نہیں کر سکتے تھے، ہاں محبت کرنا ضرور چاہی۔ جو بے نام رہی اور بے مقصد سی ہو کر یہاں وہاں بکھر کر معدوم ہو گئی تھی۔ احمد عمر نے بتایا تھا "اسفند باہر چلا گیا تھا اور عبید کی اپنے خالہ زاد سے مل گئی تھی۔"

میرا وقت ویسے ہی گزر رہا تھا۔ یونیورسٹی گھر کے کام لکھنا، ٹی وی کے ساتھ اور ڈائری۔ جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھی ٹی وی آن تھا۔ باہر چڑیوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ میں اپنے لیے چائے بنا لائی۔ شام ابھی پوری طرح ہوئی نہیں تھی۔ دروازہ بجا تھا۔ مانوس دستک تھی، دستک میں بس زیراسی جگہ تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے عبید کھڑی تھی۔ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ اسے بٹھا کر چائے کا دو سرا کپ لانے کچن میں گئی اور مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ آج بھی اسی طرح تھی۔ بہت روپوشی، کھلی کھلی سی۔ تھوڑا فرق اس کے انداز میں آیا تھا، کپڑے نئے فیشن کے پہنے ہوئے تھے اور بالوں کی کٹنگ کروائی تھی۔ چائے کا کپ لے کر میں لاؤنج میں آئی تو وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی مجھے دیکھ کر فون بند کر دیا۔

"سفی تھا۔"

"چھاب۔" میں ذرا سی چونکی۔

"سفی آج بھی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں نے اسے اسکا ٹیپ آنے کو کہا ہے۔ تھوڑی دیر میں گپ لگاتے ہیں اس کے ساتھ۔" کھلکھلاتے کہہ کر عبید نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ میں نہیں اٹھا سکی۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ باہر چڑیاں خاموش ہو گئی تھیں یا شاید اڑی گئی تھیں میرے گھر کی دیواروں سے۔ مجھے ایک دم اداسی نے گھیرا۔ میں اس فسون سے تب ہی نکلی جب عبید اپنا ٹیپ آن کیے اسفند سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں بس تھوڑی دیر پہلے آئی ہوں خیر پور۔ ایک

"مجھے تم سے محبت ہے۔" اس کے پاس بس یہی جملہ تھا۔

"تمہارے پاس فقط لفظ ہیں اور ہے ہی کیا۔" کتنی ہوئے عبید نے ٹیبل پر پڑی رے اٹھا کر اس کے سر پر مار دی۔ اسفند ہنس پڑا تو وہ میری طرف مڑی۔

"آپ کو پتا ہے صالحہ! لفظ بہت بڑے فنکار ہوتے ہیں۔ دھوکے میں رکھتے ہیں اور کوئی دھوکے باز شخص ان کو محبت کے لیے اڑا کرے تو وہ بھی بہت بڑا فنکار ہوتا ہے۔" عبید کی بات پر ایک بار پھر میں نے اسفند کی طرف دیکھا۔

عبید نے دو سال کی محبت کو دو منٹ میں فاش کر دیا تھا وہ اگر اسفند کو جانتی تھی تو ٹھیک ہی جانتی ہوگی۔ عبید کی باتوں کے آئینے میں مجھے اسفند کھل کر نظر آ رہا تھا۔ وہ واقعی بہت بڑا فنکار تھا جس نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا۔ میں اس کے لیے پریشان رہتی تھی۔ دعا میں مانگتی تھی۔ دکھی رہتی تھی۔ اس کی ہر غلط بات اور خطاؤں کو نظر انداز کرتی آئی فقط اس لیے کہ میں وہ دو سرا احمد عمر نہ بن جائے۔ میں اس کے لیے یہ سب کیوں نہ کرتی۔ وہ بھائی کس شخص کا تھا جس پر مجھے خود سے بڑھ کر اعتبار تھا، مگر اسفند عمر اتنا فنکار؟ اتنا دھوکے باز؟ کتنا بڑا؟

ان مشتعل لفظوں اور بوائی خاموشی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ میں رک رک کر شیشے کی دیوار کے پار دیکھتی رہی نہ دونوں اٹھ کر چلے بھی گئے۔ وہ نہیں آیا۔

\*\*\*

وہ دونوں کیا چلے گئے میرے گھر سے جیسے سارے موسم اور زندگی سے سارے لوگ ہی چلے گئے۔ ہر طرف اک خالی پن تھا اور وقت تھا کہ گزر جائے۔ ان گزرے چھ مہینوں میں وہ آتا رہا، جسے آتے رہنا تھا۔ وہ نہیں آئے، جو ہمیشہ آتے تھے میرے کمرے کی ٹیبل پر پڑے اور حوری محبت کے نامکمل افسانے کے

150 جنوری 2015





دوست کی شادی اینڈ کرنی ہے۔ وہاں سے آکر آج کی رات صاف کے پاس رکوں گی۔ کل واپس چلی جاؤں گی۔ تم بتاؤ۔“ عبید بولتے ہوئے اپنے خوب صورت ہاتھوں میں ہاتھ بھی چلاتی رہی۔

”صالحہ سے بات کرواؤ۔“ اسفند کے کہنے پر وہ اٹھ کر میرے والے صوفے پر آ کے بیٹھی۔

”کیسے ہوا سنی؟“

”ایک دم فٹ آپ سناؤ۔“

پھر یوں ہوا کہ اوپر اوپر اور پہاں پہاں کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے اندر عجیب قسم کی محضن بڑھتی جا رہی تھی۔

”تمہیں یاد ہے ہمارا اک کلاس فیلو تھا شیراز۔ وہ شیراز کل میرا اس کے ساتھ لٹچ کا پروگرام ہے۔“

”خدا کا خوف کرو۔ ایک منگیتیر کے ہوتے تم لوگوں سے پروگرام سیٹ کیے بیٹھی جو۔“ اسفند کی بات پر عبید نے بے اختیار اک قعبہ نکالیا اور بس۔

”تم اپنی سناؤ۔“

”تین چار گرل فرینڈز کے ساتھ گزر رہی ہے۔ اچھی چل رہی ہے۔“ ساتھ ہی دونوں کی ہنسی۔ مجھے ان کی باتوں اور ہنسی سے وحشت سی ہونے لگی۔ اٹھ کر باہر آئی تو شام ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد عبید اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر باہر آئی۔

”صالحہ! میں نینا کے پاس جا کر بھی تیار ہو جاؤں گی۔ بارہ بجے تک واپس آ جاؤں گی پھر ہم بہت ساری باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے؟“ جھٹک کر میرا گال چوما اور گلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ بہت دیر تک میرے کانوں میں اس کی ہیل کی ٹک ٹک گوونجتی رہی۔ صرف چھ ماہ میں کوئی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اتنا بدل جاتا ہے؟ اور ہماری محبت کیسی بھی جواتے سال بعد بھی ایسی ہی تھی۔

یہ سوچ تیز لمبوں جیسی ہنسی جس میں اس وقت غوطہ زن تھی۔ شام کب کی ڈوس گئی تھی۔ خالی سنان اند میرے گھر میں لی دی چل رہا تھا۔ ٹیبل پر میرے کپ میں چائے لھنڈی ہو چکی تھی۔ گھر کے

اندر کھیتی شام تھک کر رات کی گود میں سو چکی تھی۔ گھر کے باہر زندگی کے معمول کی ڈھیروں آوازیں تھیں۔ مجھے یہاں گونگا بہا بنے بیٹھے جانے کنٹن صدیاں بیت گئی تھیں کہ اچانک ہی وہ چلا آیا جس کے انتظار میں میں صدیوں سے اپنے گھر میں ایلی بیٹھی تھی۔

اس کے ہاتھوں میں کی چھن تھی اور کی چھن میں سرخ پھول جھولتا تھا۔ چوکور بنے چھوٹے سے شیشے کے ڈبے کے اندر وہ پھول اور اس پر بڑے عجبم کے قطرے۔ باہر سے دیکھنے پر یوں لگتا تھا جیسے ابھی کسی کے ہاتھوں نے تازہ گلاب توڑ کر اس میں بند کر دیا ہو۔ یہی وہ پھول تھا جس کی تلاش میں میں نے پوری پونہ سو سال چھان ماری تھی۔ اسی پھول کی تلاش میں مجھے احمد عمر ملا تھا۔ دس سال پہلے لاہور کی ٹیبل سے اٹھائے اس شیشے کے ڈبے کو وہ آج بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ کہیں دوسری جگہ نہیں رکھ پاتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر شیشہ کبھی بے احتیاطی میں ٹوٹ گیا تو وہ پھول کو کہاں رکھ پائے گا۔ شیشے کے بنا تو پھول مر جاتا ہے گا پھر؟

محبت کی دنیا میں جو چیز جیسی پہلے دن تھی اب بھی ویسی ہی تھی۔ چیزیں، احساس، یادیں اور محبت کہیں نہیں جاتے، بس وقت گزر جاتا ہے اور انسان مر جاتا ہے۔

قریب آکر احمد عمر بہت خاموشی سے میرے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ میرے عقب میں لی دی چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

محبت کو محبوب سے ہاند متی ہے غم ہے باخوشی ہے تو میری زندگی ہے تو دوستوں کے درمیاں۔

وجد دوستی ہے تو میری ساری عمر میں ایک ہی کمی ہے تو ایک ہی کمی۔ احمد عمر کی آنکھوں میں اپنا آپ

دیکھنے کی چاہ میں، میں اٹھ کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی۔ ہم دونوں مراٹھ کی اس خانقاہ کے طالب علم لگ رہے تھے جو حصول علم کے شوق میں خانقاہ کے اصول کے مطابق پہلے صدر دروازے پر آئے گئے لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے کے لیے بٹھائے جاتے تھے۔ اور جنہیں خانقاہ کے اندر برتن دھونے، دسترخوان سمیٹنے اور بستر لگانے غرض کے ہر قسم کے کام کے لیے پہلے آنا یا جانا تھا پھر لا خرا نہیں ترقی مل جاتی تھی اور وہ علم حاصل کرنے میں ایک دن کامیاب ہو جاتے تھے۔

ہم دونوں بھی کامیاب تھے۔ ہم نے بھی محبت کی خانقاہ کے اندر بہت درد جھیلے تھے اور ہمیں بھی آج ترقی مل گئی تھی۔

وہ ترقی جو ہر عبید مہتاب اور اسفند عمر کے حصے میں نہیں آتی جو صرف صالحہ ابراہیم اور احمد عمر جیسے لوگوں کو ملتی ہے۔ جو اپنے جذلوں میں فقط بچے ہوتے ہیں جو محبت کے موسموں میں مستقل بھیکتے رہنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ کائنات کے اس منظر میں ہم کہیں نہیں تھے۔ ہم دونوں اس وقت ایک دوسرے کی آنکھوں میں تھے۔ مسکرا رہے تھے۔ رو رہے تھے اور ہمارے پاس شیشے میں گلاب پڑا تھا۔

اسفند عمر اور عبید مہتاب جیسے پھلے لوگ محبت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ احمد عمر اور صالحہ ابراہیم جیسے لوگ کبھی محبت کا ساتھ نہیں چھوڑتے تب ہی انہیں نصیب ہوتا ہے لا ازال سکون۔ جو اس تھوڑی سی زندگی کے لیے بہت ہوتا ہے۔ صبر سہل نہیں مگر اس آجائے تو بہت مٹھا ہے۔

”زمانے گزر گئے احمد عمر! مگر پھر بھی تم میرے پاس آتے رہے۔ میرا رستہ نہ بھولے۔“

میں نے غم آنکھوں سے احمد عمر کی طرف دیکھا اور اس کی گود میں پڑے اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”مگر احمد عمر! میں تھک گئی۔ میں فطرت سے نہیں بھاگ سکتی۔“

میں خاموش ہو گئی۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی کائنات کی ہر چیز ساکن ہو کر ہماری محبت کا اگلا پیر دیکھنے کی منتظر تھی جیسے سائنٹ جانے پر لی ہو بھی رہا ہو گیا تھا۔ ”ہماری محبت کے دس سال نکل گئے۔ آتے والے دس سال بھی مجھے یقین ہے ہماری محبت ایسے ہی رہے گی مگر آئندہ کے دس سالوں میں مجھے صرف محبت نہیں حیثیت بھی چاہیے۔ میں محبت کے نام پر تاریخ میں امر نہیں ہونا چاہتی۔ ایک عام عورت کی طرح تمہارے نام کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ تمہارے نام کے ساتھ مرننا چاہتی ہوں۔“

نیلے کا اختیار اس ہاتھ میں دے کر میں اٹھی۔ مجھے کسی نے بڑھنے نہیں دیا۔ ہاتھ تمام کر روکا گیا۔ زمین سے سرخ گلاب اٹھایا اور ہم دونوں کے خدوں میں جھلایا۔

”محبت اس سرخ گلاب جیسی ہے صالحہ! جو اپنا گھر اپنا ٹھکانہ بدل کے کہیں نہیں جاتی بس یہ ہے کہ اس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اسے ساتھ ساتھ رکھنا پڑتا ہے اسے بسانا ہوتا ہے۔“ اب وہ بولا تو مجھے خاموش رہنا تھا۔ میرے گھر کی خاموشی کو بے حد لطف ملا اس شخص کے منہ سے محبت کہانی سن کر۔

”تم ہمیشہ مجھے۔“ منتظر ملیں۔ میں کیوں نہ آتا تم تک۔ مجھ سے بڑھ کر تو تم نے بھلیا ہے اس تعلق کو۔ ہم نے صبر کیا۔ شکر کیا کہ باقی نہ کہلائے۔ ساغرمان نہ کہلائے۔ اب اپنے صبر اور شکر کا انعام پانا ہے۔ اب اپنی محبت بسائی ہے۔ تعلق کو رشتہ بنانا ہے۔ دو صدیوں والی روایت توڑتی ہے۔ آئندہ سالوں میں کسی کو احمد عمر نہیں بنانا جو کسی صالحہ ابراہیم کو انتظار کروائے۔“ احمد عمر کے لفظوں میں اعتراض تھا۔ احساس تھا۔ میں مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ ہم دونوں کی نظریں سرخ گلاب پر تھیں۔ سرخ گلاب جو محبت جیسا لگتا ہے۔ خوب صورت۔ تازہ۔ ملائم۔



## دور کا سلام



”بس کس باتوں میں پتا ہی نہیں چلا نماز کا وقت نکل رہا ہے۔“ ذکیہ بیگم نے جیسے بلال کی بات سنی ہی نہیں اور اٹھ کر جانے لگیں۔

\*\*\*

بلال کی نوکری کہتے ہی اس کی بہنوں اور امی کو شادی کی فکر شروع ہو گئی۔ وہ انجینئر تھا اور ایک برائے سیٹ کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ بڑی دونوں بہنیں شادی شدہ تھیں اور بلال دو بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ سب گھروالوں کی متفقہ رائے تھی کہ بلال کے لیے اس کی پھوپھی زاد عروس کا رشتہ مانگا جائے۔ ابھی براہ راست ان سے بانٹ نہ ہوئی تھی کہ بلال کو عیشا نظر آ گئی۔

خاندان میں ہونے والی کسی شادی کی تقریب میں اس نے عیشا کو دیکھ لیا۔ دور سے پڑنے والی ایک نظر

میں ہی وہ اس پر فدا ہو گیا۔ اس کی نیلی آنکھیں گھوری رنگت، کانڈھوں پر پھیلے سیدھے گولڈن براؤن بال، فیشن ایبل ڈریس، بلال کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگا تھا۔

اور اس کے بعد اس کی ایک ہی تکرار تھی کہ وہ عروس سے نہیں بلکہ عیشا سے شادی کرنے کا۔ حالانکہ وہ اسے جانتا تک نہ تھا۔ صرف دور سے دیکھ کر ہی وہ اس کے طلسم میں جکڑ گیا تھا اور اس کے دل و دماغ پر نیلی آنکھیں گھوری رنگت اور گولڈن بال سوار ہونے لگی تھیں۔

”عیشا ہمارے خاندان کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔“ وہ سوچتا رہتا اور خوش ہوتا رہتا۔ اسے عیشا کو ہر قیمت پر حاصل کرنا تھا، چاہے کوئی خوش ہو یا نہ ہو۔

اسے اندازہ ہوا امی بھی جب باہر سے آئیں اور دروازہ کھلتے میں ذرا سی در ہو جاتی تو یہی حال ہوتا ہو گا۔ جو اس کا ہو رہا ہے۔ اب بھی اس کے باہر آنے تک کتنی ہی دفعہ کھنٹی بج چکی تھی اور اب تو مسلسل بجے جا رہی تھی۔

”آف کیا مصیبت ہے، جھنڈ ہو گیا ہے میں دھوپ

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کشش کھودیتا ہے اور آج کل تو خوب صورت لگنا، کوئی مشکل کام نہیں، سب میک اپ اور مصنوعی طریقوں کا کمال ہوتا ہے۔ اصل خوب صورتی تو بیادلی کے اندر ہوتی ہے، باطن کی خوب صورتی۔“ ذکیہ بیگم اکیسویں صدی کے نوجوان کو یہ بات سمجھا رہی تھیں، جو دل ہی دل میں ان کی باتوں پر ہنس رہا تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔ میں شادی کروں گا تو صرف عیشا سے۔“

”اور تم بھی کان کھول کر سن لو صاحب زادے! تمہاری شادی ہوگی تو صرف عروس سے۔“

”امی جان۔۔۔ میری پیاری امی جان! پلیز۔۔۔ آخر آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔“ بلال اب باقاعدہ منتوں پر آ رہا تھا۔

”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ کے خاندان سے لڑکی پسند کی ہے میں نے اور آپ کی اور پھوپھی کی تو ساری زندگی سرد جنگ رہی ہے اور اب آپ نے عروس کو میرے لیے پسند کر لیا۔“

”مجھے کوئی خوشی نہیں ہے۔ لڑکی کوئی تمہارے ماموں، خالہ کی بھی ہوتی تو ٹھیک تھا۔ میرے چچا کی بیٹی کی بیٹی۔ پہلے چچا جان شینہ بیٹی کے ہاتھوں پستے رہے اور پھر بیٹیوں کے چرچے اور اب فرحت نے تو اعزاز میاں کی ساری جائیداد عیاشیوں میں اڑا دی، سبائی بیٹیوں کا بھی یہی حال ہے۔ ہمیں گھر بسانے والی چاہیے۔ ہم نے کوئی اسے سجا کر رکھنا ہے گھر میں۔“

”امی! آپ نہ جانے کون سے زمانے کی کہانیاں سنا رہی ہیں لیکن میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر۔۔۔“

”بس میں نے کہہ دیا ہے۔“

”اور میں نے بھی کہہ دیا ہے جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔ غضب خدا کا ماں کے سامنے زبان چلاتا ہے۔“

”لیکن امی! آخر اس میں برائی کیا ہے؟“

”اس میں کوئی برائی نہیں میاں! برائیاں ہم میں ہیں۔ ہم اس کے فیشنوں کے خرچے پورے نہیں کر سکتے۔ تمہارا باپ سنسر نہیں ہے اور نہ تم کسی سلطنت کے شہزادے ہو، ہمیں اپنے جیسی ہی لڑکی چاہیے۔“

”پتا تو امی! اس کا باپ کون سا مل اونر ہے۔ ہمارے جیسے ہی سیدھے سادھے لوگ ہیں نوکری پیشہ۔ اور پھر امی جان! وہ خوب صورت بھی تو کتنی ہے، ہے نا۔“ بلال نے جذب کے عالم میں کہتے ہوئے ماں کے ہاتھ پکڑے۔

”اگر تمہارے ابو سن لیں نا تمہاری باتیں۔ تو یہ ہے ترجیح کی اولاد اور ہمارے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے پڑھی لکھی، خوب صورت، سادہ اور حیا دار۔“ ذکیہ بیگم نے آخری الفاظ پر زور دے کر کہا۔

”تو وہ بھی تو ہمارے خاندان کی ہی ہے نا امی۔ آپ خواہ مخواہ ضد کر رہی ہیں۔“

”تم نہیں سمجھو گے بلال! میں تمہارے ہی پھلے کی بات کر رہی ہوں۔ تم صرف اس کی ظاہری خوب صورتی سے متاثر ہوئے ہو۔ ورنہ تم صحیح سے اسے جانتے تک نہیں ہو۔ اس کی عادات و اطوار کا کچھ علم نہیں ہے تمہیں۔ اور یہ ظاہری حسن وقتی ہوتا ہے۔“

میں کھڑا سوکھ رہا ہوں۔“ عروس نے دروازہ کھولا تو سامنے بلال کھڑا تھا۔ گرمی شاید اس کے دماغ کو لگ گئی تھی۔

”اب اندر آنے دیں گی محترمہ۔“ وہ سلام کر کے ایک طرف ہو گئی۔

”امی اور مامی تو بازار گئی ہیں۔“ عروس نے اپنی طرف سے اسے اطلاع فراہم کی۔

امی نے اسے شام کو پہنچنے کو کہا تھا لیکن وہ عرصہ ہی آگیا تھا۔ آفس سے فارغ ہوا تو سیدھا یہیں چلا آیا۔ کمرے میں کولر آن تھا۔ ایک دم جھلسائی گرمی سے خوش گوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ دھڑ سے صوفے پر گر کر بیٹھ گیا۔

”کھانا کھاؤ گے؟“ بڑے شائستہ اور منہذب انداز میں پوچھا گیا۔

”نہیں۔“

”ٹھنڈا چائے؟“

”نہیں۔“ دوبارہ نکاسا جواب دیا۔ وہ کچھ کے بغیر کچن میں چلی گئی۔ واپس آئی تو ٹرے میں کولڈ ڈرنک



اور فروٹ تھا۔

”آپ بیٹھیں۔ میں ابو کو بلا کر لاتی ہوں۔“ ساتھ لہجہ نرم آواز عروسہ ہمیشہ سے ہی ایک باوقار لڑکی تھی۔ تمام خاندان کی پسندیدہ ہستی۔

بلال کے حواس اب کچھ بحال ہو چکے تھے۔ اس نے یوں ہی بلا ارادہ عروسہ کی طرف دیکھا۔ صاف شفاف گندی رنگت، کالی سیاہ آنکھوں پر لمبی گھنی پلکیں، گھنگھریالے بالوں کی لمبی اور موٹی چوٹی جو اس کے سر پر جسے دوپٹے سے پیچ لٹک رہی تھی۔

مگر عیشا اور عروسہ کا کیا مقابلہ؟ بلال نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے ارادے کو مزید پختہ کر لیا۔

اور پھر پورے پانچ دن وہ اپنے دوست اور ماموں زاد آذر کے گھر رہا۔ اس نے گھر چھوڑ دیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر اس کی بات نہ المی گئی تو وہ یہ شہر ہی چھوڑ جائے گا۔ ماں، باپ، بہنیں دڑی چلی آئیں۔ آخر سب کو اس کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔

سب لوگ اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ ای، ابو، بہنیں اور خاندان کے بزرگ رشتہ طے ہونے پر انگوٹھی پہنا آئے اور منگنی والے روز ہی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی۔

دعوت پر اپنی سسرال گیا۔ تب بھی دور سے ہی عیشا کی ایک جھلک دکھائی دی۔

اس کے ساتھ کا تصور ہی اتنا زور آور تھا کہ وہ سب کچھ بھلا بیٹھا۔ ای، ابو کی محبت، بہنوں کے ارمان۔۔۔ سب کچھ عیشا کو حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

ان سب دنوں میں جو خاص بات ہوئی وہ آذر اور عروسہ کا رشتہ طے ہونا تھا اور نہ صرف رشتہ بلکہ بلال اور عیشا کی شادی سے پہلے ہی ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔

اور پھر اس کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ نیلی آنکھوں، گوری رنگت اور گولڈن بالوں والی عیشا اس کے من کی مراد بن کر اس کے آنکھوں میں آ گئی۔ شروع کے کچھ

دن وہ ہواؤں میں اڑتا رہا۔ کھوئے پھرنے بھی گئے۔ دعوتوں کا سلسلہ کچھ کم ہوا تو امی کو فکر ہوئی کہ آذر اور عروسہ کی شادی کی دعوت ہے۔

بلال بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ عروسہ ہلکے پھلکے میک اپ، میچنگ جیولری میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ کلپ لگا کر گھنگھریالے بال کھول رکھے تھے۔ دہشتا سر پر حسب معمول جمار کھا اور لمبے بال باہر جھانک رہے تھے۔

عیشا بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ دوپٹا بڑی لا پرواہی سے گلے میں ایک طرف جھول رہا تھا۔ آج پہلی دفعہ بلال کو اس طرح سب لوگوں کی موجودگی میں خاندان کے بزرگوں کے سامنے یوں عیشا کا گلے میں دوپٹا لٹکا کر پھرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چلو سر پر نہ لے مگر ڈھنگ سے تو اوڑھ لے۔ صرف سوچا ہی رہا کہ نہ سکا۔ خواجواہ شرمندہ ہونے لگا۔

رفتہ رفتہ زندگی روٹیں پہ آ گئی۔ وہ صبح آفس جاتا تو امی ہی اس کے لیے ناشا بنائیں۔ عیشا نے ایک دن بھی اٹھنا اپنی ذمہ داری نہ سمجھا۔ وہ امی کے سامنے نظریں جھکا کر رہ جاتا۔

شام کو گھر آتا تو عیشا تیار ملتی۔ آج یہاں جانا ہے۔ تو کل وہاں۔ آج بلال نے خود ہی آفس سے فون کر کے کہا تھا کہ تیار رہے آج ماموں کے گھر چلیں گے۔ کتنے دن ہوئے تھے آذر سے ملے ہوئے وہ اس کے بچپن کا دوست تھا اور کزن بھی۔ اکٹھے کھیلے، پھر اسکول، کالج پڑھا بھی ساتھ ہی۔ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ وہ گھر آیا تو حیران ہو گیا۔

”تم تیار نہیں ہوئیں؟ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ ماموں کی طرف جانا ہے۔“

”میں کیا کرتی بلال! تم نے اچانک ہی پروگرام بنالیا۔ آج تو میری کہیں کی تیاری نہیں تھی۔ لاسٹ بھی نہیں ہے۔“ وہ اسے بڑی سمولت سے تم کہتی تھی۔

”تو اس میں کیا پرالیم ہے۔ اتنی تیاری کی کیا

ضرورت ہے۔ ماموں کے گھر ہی تو جانا ہے۔ الماری میں بس جوڑے لٹکے رہتے ہیں تمہارے۔“

”آج پار لمبی تھی۔ وہ بھی بند تھا اور ایک مسئلہ یہ ہے کہ میرا ایک آئی لینس بھی ٹوٹ گیا ہے۔ اچانک ہی پتا ہی نہیں چلا ہاتھ سے گر گیا۔“ وہ صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”تو اس کاموں کے گھر جانے سے کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے نا، بس میں نہیں جاسکتی ہے۔“ عیشا نے ہٹ دھرمی دکھائی۔ بلال نے غور سے دیکھا۔ ایک بار دوبار پھر غور سے دیکھا۔

”عیشا! تمہاری آنکھوں کا رنگ کیسے بدل گیا۔“

”کیا مطلب۔۔۔“ عیشا نے حیرانی سے بلال کو دیکھا۔

”مطلب کہ یہ تو نیلی نہیں ہیں۔“

”اے بلال! لہو تو ان دنوں میں بلیو کالر کے لینس پوز

کر رہی ہوں اس لیے۔ ورنہ میری آنکھیں تو ایسی ہی ہیں بلال کے سر پر جیسے کوئی ہم گرا۔

”اور تمہاری اسکن۔“ اس نے پاس بیٹھی عیشا کے چہرے پر نظریں گاڑ لیں۔

”ہاں اسکن میری بہت ڈل اور رف ہے۔ میری سب بہنوں میں سے ایک میری ہی اسکن ایسی ہے۔ وہ تو میں باقاعدگی سے پار لڑ جاتی ہوں۔ کوئی میک اپ استعمال کرتی ہوں۔ اس لیے اچھی نظر آتی ہے۔ آج بھی پار لمبی تھی، مگر بند تھا۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ماموں کے گھر کل چلیں گے۔ میں صبح پار لمبی ہو آؤں گی اور لینس بھی لے لوں گی۔ ویسے میرا خیال ہے اب کلر چیئنج کر لوں۔ گرین سوٹ کرے گا؟“ وہ اٹھ کر ڈرائنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئی، یہ جانے بغیر کہ بلال کی حالت کیا ہو رہی ہے۔

”اسے تو جیسے کسی نے گہری کھائی میں دھکا دے دیا تھا۔ اور وہ گرا بھی منہ کے بل تھا۔“

”ایک تو آج لاسٹ بھی مصیبت بن گئی ہے۔“

عیشا نے کوفت سے ہیرا ٹر ٹر اٹھا کر دیکھا۔ پھر نیچے رکھ دیا۔

”تمہارے بل بھی تو۔“ بلال نے چڑیا کے گھونسلے جیسے عیشا کے بالوں کو دیکھتے ہوئے فقرہ ادھر ادھر اچھوڑا۔

”اف بلال! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ میرے بل کمری ہیں مگر مجھے سیدھے اچھے لگتے ہیں۔ جب ہی اسٹریٹرز نوذ کرتی ہوں۔ ہاں مگر یہ گولڈن ٹر زیار سوٹ نہیں کر لیا۔ مجھے پراس ولند ڈارک براؤن کمر کر اؤں گی۔ اچھا لگے گا نا؟“ وہ اس کے کانڈھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی۔

جبکہ وہ گردنوں لاج سے بے خبر تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ عیشا انکشاف برائے انکشاف کر رہی تھی اور دوری کا طلسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ نیلی آنکھوں، گوری رنگت اور گولڈن بالوں کی جگہ شہابی آنکھیں، ڈل اور رف اسکن اور چڑیا کے گھونسلے جیسے بال تھے۔

ہیولی جیکس کا تیار کردہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چند دنوں میں نگیل ختم ہو جاتی ہے۔

کرتے آئے انوں کو روکتا ہے۔

بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔

قیمت - 100/- روپے

رہنوی سے منگوانے پر اور مٹی آرڈر سے منگوانے والے

روپے 250/- روپے 350/-

اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

بذریعہ اک سے منگوانے کا پتہ

پتہ: 53 مارگرٹ، ایکٹ ایم اے چاندر (راکھی)۔

دفتر خریدنے کے لیے:

کنجہ مران ڈائجسٹ 37 مارگرٹ (راکھی)۔ فون نمبر 32216361





# فلسفہ

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ فارس غازی اپنے سوتیلے بھائی رابرٹ غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف غازی کا بھائی ہے جو اپنے ماموں فارس غازی سے جیل میں رہتے ہوئے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین برس بھائی ہیں ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدی یوسف کی والدہ نے کڑی مشقت کر کے بچوں کی پرورش کی ہے جن میں اور اسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریٹائرمنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی یوسف کی چھوٹے ہیں۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ بھی فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انٹریز عورت اپنا گروہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ فارس غازی سعدی یوسف کا ماموں ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسا یا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے جس کی بنا پر زمر اپنے پیچھے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پریشانی اور امکان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔ ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کاردار کی ایک بیٹی سوہیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔ ہاشم سوہیا کی سالگرہ و خوم و خام سے منانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ فارس غازی 'ہاشم کاردار کی پیپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے۔





رہائش پذیر تھا۔ فارس غازی کے جیل جانے کے بعد اس کا پر رشن مقفل ہے۔

سعدی یوسف کے لیے وہ دن خوشیوں سے بھرپور تھا جب اسے فارس غازی کے رہا ہونے کی خبر ملتی ہے۔

ہاشم نے یہ خبر سن کر عمو کیا کہ اگر اس میں سعدی کا ہاتھ ہے تو اسے اس کا حساب دینا ہو گا۔ فارس غازی جیل سے نکلتا ہے تو سعدی یوسف ان کا منتظر ہوتا ہے۔ فارس اس سے قبرستان چلنے کو کہتا ہے۔ قبرستان جا کر فارس وہ قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ غازی سے اترتے ہوئے سعدی کا موبائل لے لیتا ہے۔ قبرستان میں وہ کسی کو فون کر کے کوئی ہتھیار منگواتا ہے۔

ہاشم کا دروازہ مڑا اپنی بیٹی سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دینے کے ساتھ سعدی کا کارڈ بھی زمر کو دے دیتا ہے۔

زمر کے والد کو اپنے پوتے سعدی یوسف سے بہت محبت ہے۔ وہ زمر سے کہتے ہیں سعدی کو لکیر پرورش کرنے ان کے گھر جائے۔ وہ پھول لے کر کارڈ دینے سعدی کے گھر جاتی ہے۔ زمر کو دیکھ کر سعدی کے ساتھ تمام عروا لے حیران ہو جاتے ہیں۔ زمر سعدی کو سونیا کی سالگرہ کا کارڈ دیتی ہے۔

زمر کے جانے کے بعد سعدی نے ہاتھ میں پکڑے سیاہ اور سنہرے کارڈ کو دیکھا۔ اسی وقت ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلک اٹھا۔ اس نے ہوش میں ہاشم کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگایا تھا۔ وہ اس کے لیپ ٹاپ سے ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سعدی نے جب بیگ سے فلیش ڈیٹا نکالا تو اسے پریس کرنے کے بعد اسکرین پر پیغام آیا کہ آپ کی ڈیو اس کو ایک بار ڈرائیو کی ہے کیا آپ سارا ڈیٹا کاپی کرنا چاہیں گے؟ سعدی نے مسکراتے ہوئے ”نہیں“ دے دیا۔ اسکرین پر ”دوسرا پیغام“ دیکھ کر سعدی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

اسکرین پر پیغام چل رہا تھا کہ ”پاس اور ڈیٹا داخل کریں“ سعدی کے پاس پاس ورڈ نہیں تھا۔ سعدی یوسف ہاشم کا دروازہ کی سابقہ بیوی شیرین سے ایک شاٹنگ مال میں مل کر کہتا ہے۔ مجھے آپ سے ہاشم بھائی کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ چاہیے۔ شیرین سعدی سے کہتی ہے کہ ”تم کیا کرنے جا رہے ہو؟“ سعدی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا ہے کہ ”ہاشم بھائی نے جو ہم سے چاہا تھا میں دے دیا ہوں۔“

شیرین نوٹس والے پاس جا کر کہتی ہے کہ سونیا کو اس کی اور ہاشم کی اتنی مون کی پکچرز چاہئیں۔ یہ جھوٹ بول کر نہایت چالاکی سے شیرین نوٹس والے سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

حشیں یوسف پر اس کی دوست کی وجہ سے کمزور امتحان میں نفل کا اثر اہم لگتا ہے نیچر حشیں سے کہتی ہیں کہ اس پر کیس بنے گا اور وہ تین سال تک پیچھے نہیں دے سکتی۔ وہ حشیں کو آفس میں بٹھا کر ملی جاتی ہیں تو حشیں کی نظر میز پر پرنٹڈ کے رس کے ساتھ رکھے موبائل پر پڑتی ہے۔ حشیں موبائل اٹھا کر دھڑکتے دل سے ہاشم کا نمبر دیکھ کر اسے تمام صورت حال سے آگاہ کرتی ہے۔ ہاشم کچھ دیر بعد ہی امتحانی مرکز میں پہنچ جاتا ہے اور کمال ہوشیاری سے حشیں کو مشکل وقت سے نہ صرف نکالتا ہے بلکہ حشیں کو پیچھے کھینچ کر اپنے نیچر سے ایکسٹرا ٹائم بھی دلواتا ہے۔

پیچھے دینے کے بعد حشیں ہاشم کا شکریہ ادا کرتی ہے اور ہاشم سے کہتی ہے کہ سعدی بھائی کو اس معاملے کے بارے میں مت بتائیے گا۔ ہاشم حشیں سے پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے جس پر حشیں کہتی ہے کہ پارٹی میں ہم سب آئیں گے۔

قصر کے سبزہ زار میں سیاہ شام سنہرے تاروں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ روشنیاں قلعے سیاہ اور سنہری امتزاج سے تھی سونیا کی سالگرہ کی تقریب کی رونق عروج پر تھی۔

حشیں سنہری فرائڈ میں جبکہ سعدی کیم اور زمر سیاہ سوٹ میں لمبوس تقریب میں شریک تھے۔ شیرین ان کی میز کے پاس آکر زمر کو ڈی اے کہہ کر پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے۔

آکر زمر کو ڈی اے کہہ کر پارٹی میں آنے کا پوچھتا ہے۔ سعدی نیپ کو کوٹ کی اندر دینی جیب میں رکھ کر سوچتا ہے کہ آدھا کام ہو گیا مگر ابھی پاس ورڈ لیتا باقی ہے۔

جواہرات دو تین خواتین کے ساتھ سعدی اور زمر کی میز کی طرف آتی ہے۔ جواہرات اپنی فریڈ سے زمر کا تعارف کراتی ہے پھر سعدی یوسف کا تعارف بھی کر دیا کر سعدی سے کہتی ہے کہ وہ اپنا شجرہ نسب ان خواتین کو بتائے نوٹس والے

سے فاصلے پر کھڑا تند نظروں سے ادھر دیکھ رہا تھا۔ سعدی سمجھ جاتا ہے کہ جواہرات اس وقت نوٹس والے کی بے عزتی کر رہی ہیں۔ پھر سعدی اپنا شجرہ نسب ایسا بتاتا ہے کہ جس سے نوٹس والے کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور جواہرات کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اسی دوران جواہرات اپنی فریڈ سے زمر کے سابقہ منگیتر جواد کا ڈکریٹجیو دیتی ہے جس کی وجہ سے زمر سنبھل جاتی ہے۔

شیرین بڑی ہوشیاری سے سعدی کو اس ورڈ تادیبی ہے۔

دوسری جانب زمر کا لیٹ روم میں فارس سے سامنا ہو جاتا ہے فارس کو دیکھ کر زمر غصے میں جا کر ہر کی طرف جاتی ہے۔ اس ورڈ لٹنے کے سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری آفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے۔

ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے لیکن سعدی پکڑ میں آئے بغیر وہاں سے لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم غصے میں خاور سے کہتا ہے کہ سعدی جیسے ہی ایگزٹ پر پہنچے اسے روکو۔ جبکہ ملازمہ فیونا ہاشم کے کہنے پر جان بوجھ کر سعدی سے ٹکراتی ہے اور اس کے کوٹ میں نیپ کلس ڈال کر معذرت کرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔

جیسے ہی زمر سعدی حشیں اور وسم گھر جا رہے ہوتے ہیں تو خاور انہیں روک کر بتاتا ہے کہ مسز جواہرات کا نیپ کلس چوری ہو گیا ہے۔ زمر غصے میں خاور سے کہتی ہے کہ یہ میری بجلی کے بجے ہیں ان کی تلاش لینے سے پہلے میری تلاش لینا ہو گی۔ اس دوران ہاشم بھی وہاں آ جاتا ہے اور پھر بگڑتی صورت حال دیکھ کر اٹھیں جانے دیتا ہے۔

ریسٹورنٹ کا بل دینے کے لیے سعدی حشیں سے اپنے کوٹ سے وائٹ نکالتے کو کہتا ہے حشیں کے ہاتھ میں والٹ کے ہوائے نیپ کلس آ جاتا ہے۔ زمر کی نگاہیں نیپ کلس کو دیکھ کر ٹھہر جاتی ہیں زمر غصے میں سعدی کو کہتی ہے اسے گھر ڈراپ کر دے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شیرین نے نوٹس والے کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔

دوسری جانب بڑے اپاز مر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گمراہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

زمر سعدی کے ریٹورنٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بڑے ابانے اسے بتا دیا ہے کہ اسے گمراہ کسی خاتون نے نہیں بلکہ اس نے دیا ہے۔ اسی دوران فارس وہاں آ جاتا ہے جسے دیکھ کر زمر نفرت آمیز نگاہ فارس پر ڈال کر وہاں سے چلی جاتی ہے۔

سعدی بہت دنوں بعد آفس جاتا ہے اور اپنی باس سارہ کو فیلڈ رپورٹ دے کر کہتا ہے کہ اس نے کام مکمل کر لیا ہے اور ہالہ جانے کی تیاری بھی مکمل کر لی ہے۔

مخروم ذوالفقار یوسف کے گھر میں سعدی کے دادا پھپھو زمر والدہ اور بن بھائی خوش گہیوں میں مصروف تھے۔ اسی

ان حشیں سعدی کے کمرے میں جاتی ہے تو وہاں سعدی کے کھلے لیپ ٹاپ کے اسکرین پر چلتے نمبرز دیکھ کر حیران ہوتی

سعدی جلدی سے آکر لیپ ٹاپ میں اپنا ایک ہاتھ مار کر بند کر دیتا ہے۔

ہاشم سعدی سے ملاقات کا کہتا ہے۔ وہ ہاشم کو ٹائٹل کے لیے ہاں کہہ دیتا ہے۔

نوٹس والے ایک بار پھر زمر گز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات ٹھہر جاتی ہے۔

لیکن اپنے اور وسم کے مشترکہ کمرے میں آتی ہے جب الماری کھولتی ہے تو اس کی نظر سنہری مٹھلیں ڈبے پر پڑتی ہے تو

کے اندر ایک الگ رکھا تھا۔ اس کی زنجیر میں سیاہ ہیرے کی شکل کا پتھر بیویا تھا جس کے اوپر سنہرے حروف میں

ہائیں اور آفٹر آفٹ تھا۔ یہ سعدی کی چمن کا جزو تھا۔

سعدی زمر سے ایک رشتے دار کی شادی میں جانے کا پوچھتا ہے جس میں زمر کا سابق منگیتر جواد بھی آئے گا۔ زمر سعدی



سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو شادی میں جائے کی یہ بات جب بڑے ابا کو بتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔  
 سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسا یا گیا تھا۔  
 ہاشم کی سیکرٹری کال کر کے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آ رہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا تو اس سے ملاقات کو یونہی ہٹا رہا ہے گا۔  
 ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں یا اب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پہ سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔  
 دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز میج ہو جاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سرور فون ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آئے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہو گئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح کھوم رہے تھے۔  
 سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آٹس ایور آفٹر" (Ants ever after) لکھا ہوتا ہے وہ علیشاہے درجہ بیٹیا سے۔ حنین کی علیشاہے دوستی ہو جاتی ہے۔  
 سعدی نے ہاشم کے کمپیوٹر سے جو فائلز نکالی تھیں وہ انہیں آرہٹ نہیں کیا تا وہ ڈیٹا تباہ ہو جاتا ہے۔  
 ایک رشتے دار کی شادی کی تقریب میں زمر اور سعدی کی ٹیلی کے ساتھ زمر کے سابق منگیتر حماد اور اس کی بیوی کلن بھی آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلن زمر کو دیکھ کر اپنی گزراں سے زمر کے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہے جسے سن کر زمر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔  
 اسی دوران سعدی کی والدہ ندرت زمر کو سعدی کے لیے لڑکی دکھاتی ہیں۔ زمر کو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔  
 سیم ندرت سے کہتا ہے کہ اگر لڑکی والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو؟  
 اس پر زمر کہتی ہے کہ کیوں انکار کریں گے کوئی وجہ ہوتی ہے کیا؟ اس بات پر حنین بے ساختہ کہتی ہے۔  
 "بغیر وجہ کے بھی انکار ہو جاتے ہیں جیسے آپ نے فارس ماموں کے رشتے سے انکار کیا تھا۔" یہ سن کر زمر بالکل ساکت کا موش رہ جاتی ہے۔  
 درحقیقت زمر کو فارس کے رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کب رشتہ مانگا گیا تھا؟ کب انکار ہوا؟  
 زمر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے فارس نے اس سے ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔  
 زمر بصیرت صاحب کو فون کر کے کہتی ہے کہ اسے ایک کیس فائل چاہیے۔  
 "سرکار بنام فارس عازمی۔"

## چھٹی قسط

پانی سے گاڑھا  
 اور دنیا کے پہلے قاتل کو سزا  
 سنائی تھی خود منصف اعلیٰ نے  
 کیا وہ موت تھی؟  
 نہیں!

بلکہ وہ "زندگی" تھی۔  
 اور کہہ دیا تھا خدا نے کہ۔  
 اے قاتل!  
 تم بھوکے زمین میں  
 مفروز بد نصیب نشان زدہ ہو کر

اور تمہاری پیشانی کے نشان سے پہچان لے گا  
 جس پر ملنے والا  
 اور یہ بھی فرمایا کہ  
 (کوئی قاتل نہ کرے قاتل کو کیونکہ)  
 جو کوئی قاتل کرے گا قاتل کو  
 میں اسے خود سزا دوں گا  
 سات گنا زیادہ۔  
 ("ہنریٹا ٹنگ فیلو" کی تحریر "نیبل ٹاک"  
 سے ماخوذ)

جواہرات بالکل سن ہی ہوئی زمر کو دیکھ رہی تھی۔  
 "تو کہہ دینی چاہتی تھی کہ زمر فارس سے انتقام لے لے کر  
 پھر بھی اتنا تجزی سے ہو آسب کچھ اسے مضطرب کر  
 رہا تھا۔ اس نے بظاہر مسکرا کر سامنے دیکھا، جہاں  
 شادی کا فنکشن اور روشنیاں نظر آرہی تھیں اور حماد  
 اور کلن بھی۔"

"آف کورس! میں تمہاری مدد کروں گی، لیکن یہ  
 انتقام فارس سے ہے یا خود اپنے آپ سے؟"  
 "اگر پہلا پورا ہو جائے تو دوسرا بھی قبول ہے  
 شیش۔" زمر بھی سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی  
 تھی۔  
 "کیا تم اس کا مقدمہ ری ایورن نہیں کر سکتیں؟ اگر  
 عدالت اس کو سزا دے تو زیادہ بہتر ہے۔"  
 "آپ میری مدد کریں گی یا میں کسی اور کے پاس

جاؤں؟ آپ کو یاد ہو گا، آپ نے میرے پاس آکر مجھے  
 پیش کش کی تھی کہ اگر کبھی میرا ارادہ بدلا تو آپ میرے  
 انتقام میں میری مدد کریں گی۔" اس نے سر د سپاٹ  
 سے انداز میں اسے دیکھا تو جواہرات فوراً "مسکرائی۔  
 آگے بڑھ کر زمر سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"شیور میں اپنی بات یہ قائم ہوں۔ یہ سب قدرتی  
 طریقے سے ہو گا، نہ بہت جلد تمہارے گھر تمہارا رشتہ  
 لینے آئے گا، بس تم اس امر کو یقینی بنانا کہ تمہارے والد  
 انکار نہ کریں۔"

"تھمنکس۔" زمر کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ جواہرات  
 خاموشی سے سامنے دیکھنے لگی۔ وہ ذہن میں ایک نیا  
 لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی۔

فنکشن اب اپنے اختتام کی جانب رواں دواں  
 تھا۔ سعدی حنین کے ساتھ خاموشی سے بیٹھا گا ہے  
 بگا ہے، دور بکھری، ہلکی آواز میں باتیں کرتی زمر اور  
 جواہرات یہ نظر ڈال لیتا۔ جواہرات نے اسے خود کو  
 دیکھتا پایا تو نزاکت سے مسکرائی۔ سعدی جبراً "مسکرایا  
 اور سرخ پھیرا تو حنین نے نظر پڑی، وہ گردن ذرا موڑ کر دور  
 ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ناپسندیدگی ابھری۔  
 چہرہ حنین کے قریب کیا۔

"آئندہ ان سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں  
 ہے، نہ ہی ان کی کسی بات کا اعتبار کرنا۔" حنین نے  
 چونک کر اسے دیکھا، قدرے دل گرفتہ سے۔  
 "تجھوت نہیں کہہ رہے تھے، ان کو واقعی افسوس ہے؟"  
 قدرے رکی۔ "ان کو علیشاہے کے لیے واقعی افسوس

"جانے بھی دو حنین!" وہ بے زار سا چپے ہوا، پھر  
 وہاں سے اٹھ آیا۔ ہال کے کونے میں کھلتے دروازے پہ  
 وہ رکا، وہ مردوں کے لیے مختص ریسٹ رو مزے اندر  
 شیشے سے ڈھکی دیوار اور سامنے لگے بیسن کی قطار اس  
 کے آگے ہاتھ رو مزے تھے۔

سعدی ایک بیسن کے سامنے آکھڑا ہوا، "ٹل کھولا،  
 چہرے پہ چھینٹے مارے، تل بند کیا۔ ساتھ رکھے ٹشو  
 اٹھائے ہاتھ صاف کیے، چہرہ اٹھایا تو ٹھنک کر رکا۔

آئینے میں اپنے عقب میں ہاشم کھڑا نظر آ رہا تھا۔  
 دونوں ہاتھ پیٹت کی جیبوں میں ڈالے، لٹل کوٹ کا بٹن  
 بند، نرمی سے (بغیر مسکراہٹ کے) اسے دیکھا۔

"تم میرے آفس نہیں آئے، میری سیکرٹری نے  
 دوبارہ تمہیں فون کیا مگر تم نے نہیں اٹھایا۔"  
 "میں مصروف تھا۔" وہ سر جھکائے، ہاتھ صاف  
 کرتے ہوئے بولا۔ ہاشم سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا  
 چہرہ دیکھتا رہا۔



سے کہتی ہے کہ اگر وقت ملا تو شادی میں جائے کی یہ بات جب بڑے ابا کو بتا چلتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔  
 سارہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ فارس آجاتا ہے۔ فارس سارہ سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کے خیال میں اس نے ہی وارث کو قتل کیا تھا؟ سارہ جواب میں کہتی ہے کہ اسے یقین ہے کہ اسے پھنسا یا گیا تھا۔  
 ہاشم کی سیکرٹری کال کر کے اسے بتاتی ہے کہ آج سعدی اپنی مصروفیت کی بنا پر نہیں آ رہا۔ وہ سمجھ جاتا ہے کہ سعدی کو جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا تو اس سے ملاقات کو یونہی ہٹا رہے گا۔  
 ہاشم سعدی کو فون کرتا ہے کہ کیا ہم اچھے وقتوں میں واپس جاسکتے ہیں یا اب تم مجھے دل سے ہاشم بھائی کہتے تھے۔ ہاشم کی بات پر سعدی "شاید نہیں" کہہ کر کال کاٹ دیتا ہے۔  
 دوسری طرف سعدی لیپ ٹاپ پر فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمج ہو جاتی ہیں۔ سعدی پریشان ہو کر سرور فون ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ اس وقت سعدی اپنے ماضی کے اچھے وقتوں کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ سب باتیں یاد آئے لگتی ہیں جب ہاشم کو دل سے بھائی کہتا تھا اور جواہرات کے دل میں اس نے کس طرح اپنی جگہ بنائی تھی اور نوشیرواں سے بھی اس کی اس وقت دوستی ہو گئی تھی۔ ماضی کے تمام واقعات ایک ایک کر کے سعدی کے سامنے کسی کہانی کے کرداروں کی طرح کھوم رہے تھے۔  
 سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ گیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے، حنین حیران ہو کر اپنی گیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آٹس ایور آفٹر" (Ants ever after) لکھا ہوتا ہے وہ علیشاہے درجہ بیٹیا سے۔ حنین کی علیشاہے دوستی ہو جاتی ہے۔  
 سعدی نے ہاشم کے کمپیوٹر سے جو فائلز نکالی تھیں وہ انہیں آرہٹ نہیں کیا تاؤ وہ ڈیٹا تباہ ہو جاتا ہے۔  
 ایک رشتے دار کی شادی کی تقریب میں زمر اور سعدی کی ٹیلی کے ساتھ زمر کے سابق منگیتر حماد اور اس کی بیوی کلن بھی آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلن زمر کو دیکھ کر اپنی گزراں سے زمر کے بارے میں ایسی باتیں کرتی ہے جسے سن کر زمر کو بہت دکھ ہوتا ہے۔  
 اسی دوران سعدی کی والدہ ندرت زمر کو سعدی کے لیے لڑکی دکھاتی ہیں۔ زمر کو وہ لڑکی اچھی لگتی ہے۔  
 سیم ندرت سے کہتا ہے کہ اگر لڑکی والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو؟  
 اس پر زمر کہتی ہے کہ کیوں انکار کریں گے کوئی وجہ ہوتی ہے کیا؟ اس بات پر حنین بے ساختہ کہتی ہے۔  
 "بغیر وجہ کے بھی انکار ہو جاتے ہیں جیسے آپ نے فارس ماموں کے رشتے سے انکار کیا تھا۔" یہ سن کر زمر بالکل ساکت کا موش رہ جاتی ہے۔  
 درحقیقت زمر کو فارس کے رشتے کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا کہ کب رشتہ مانگا گیا تھا؟ کب انکار ہوا؟  
 زمر کے ذہن میں یہ بات آتی ہے فارس نے اس سے ٹھکرائے جانے کا انتقام تھا۔  
 زمر بصیرت صاحب کو فون کر کے کہتی ہے کہ اسے ایک کیس فائل چاہیے۔  
 "سرکار بنام فارس غازی۔"

## چھٹی قسط

پانی سے گاڑھا  
 اور دنیا کے پہلے قاتل کو سزا  
 سنائی تھی خود منصف اعلیٰ نے  
 کیا وہ موت تھی؟  
 نہیں!

بلکہ وہ "زندگی" تھی۔  
 اور کہہ دیا تھا خدا نے کہ۔  
 اے قاتل!  
 تم بھوکے زمین میں  
 مفروز بد نصیب نشان زدہ ہو کر

اور تمہاری پیشانی کے نشان سے پہچان لے گا  
 جس پر ملنے والا  
 اور یہ بھی فرمایا کہ  
 (کوئی قاتل نہ کرے قاتل کو کیونکہ)  
 جو کوئی قاتل کرے گا قاتل کو  
 میں اسے خود سزا دوں گا  
 سات گنا زیادہ۔  
 ("ہنریٹا ٹنگ فیلو" کی تحریر "نیبل ٹاک"  
 سے ماخوذ)

جواہرات بالکل سن ہی ہوئی زمر کو دیکھ رہی تھی۔  
 "تو کہہ دینی چاہتی تھی کہ زمر فارس سے انتقام لے لے کر  
 پھر بھی اتنا تجزی سے ہو آسب کچھ اسے مضطرب کر  
 رہا تھا۔ اس نے بظاہر مسکرا کر سامنے دیکھا، جہاں  
 شادی کا فنکشن اور روشنیاں نظر آرہی تھیں اور حماد  
 اور کلن بھی۔"

"آف کورس! میں تمہاری مدد کروں گی، لیکن یہ  
 انتقام فارس سے ہے یا خود اپنے آپ سے؟"  
 "اگر پہلا پورا ہو جائے تو دوسرا بھی قبول ہے  
 شیش۔" زمر بھی سپاٹ نظروں سے سامنے دیکھ رہی  
 تھی۔

"کیا تم اس کا مقدمہ ری ایورن نہیں کر سکتیں؟ اگر  
 عدالت اس کو سزا دے تو زیادہ بہتر ہے۔"  
 "آپ میری مدد کریں گی یا میں کسی اور کے پاس

جاؤں؟ آپ کو یاد ہو گا، آپ نے میرے پاس آکر مجھے  
 پیش کش کی تھی کہ اگر کبھی میرا ارادہ بدلا تو آپ میرے  
 انتقام میں میری مدد کریں گی۔" اس نے سر د سپاٹ  
 سے انداز میں اسے دیکھا تو جواہرات فوراً "مسکرائی۔  
 آگے بڑھ کر زمر سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"شیور میں اپنی بات یہ قائم ہوں۔ یہ سب قدرتی  
 طریقے سے ہو گا، نہ بہت جلد تمہارے گھر تمہارا رشتہ  
 لینے آئے گا، بس تم اس امر کو یقینی بنانا کہ تمہارے والد  
 انکار نہ کریں۔"

"تمہیں مکس۔" زمر کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ جواہرات  
 خاموشی سے سامنے دیکھنے لگی۔ وہ ذہن میں ایک نیا  
 لائحہ عمل ترتیب دے رہی تھی۔

فنکشن اب اپنے اختتام کی جانب رواں دواں  
 تھا۔ سعدی حنین کے ساتھ خاموشی سے بیٹھا گا ہے  
 بگا ہے، دور بکھری، ہلکی آواز میں باتیں کرتی زمر اور  
 جواہرات یہ نظر ڈال لیتا۔ جواہرات نے اسے خود کو  
 دیکھتا پایا تو نزاکت سے مسکرائی۔ سعدی جبراً "مسکرایا  
 اور سرخ پھیرا تو حنین نے نظر پڑی، وہ گردن ذرا موڑ کر دور  
 ہاشم کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ناپسندیدگی ابھری۔  
 چہرہ حنین کے قریب کیا۔

"آئندہ ان سے زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں  
 ہے، نہ ہی ان کی کسی بات کا اعتبار کرنا۔" حنین نے  
 چونک کر اسے دیکھا، قدرے دل گرفتہ سے۔  
 "تجھوت نہیں کہہ رہے تھے، ان کو واقعی افسوس ہے؟"  
 قدرے رکی۔ "ان کو علیشاہے کے لیے واقعی افسوس

"جانے بھی دو حنین!" وہ بے زار سا چہرے ہوا، پھر  
 وہاں سے اٹھ آیا۔ ہال کے کونے میں کھلتے دروازے پر  
 وہ رکا، وہ مردوں کے لیے مختص ریست رو مزے اندر  
 شیشے سے ڈھکی دیوار اور سامنے لگے بیسن کی قطار اس  
 کے آگے ہاتھ رو مزے تھے۔

سعدی ایک بیسن کے سامنے آکھڑا ہوا، "تلی کھولا،  
 چہرے پر چھینٹے مارے، تل بند کیا۔ ساتھ رکھے ٹشو  
 اٹھائے ہاتھ صاف کیے، چہرہ اٹھایا تو ٹھنک کر رکا۔

آئینے میں اپنے عقب میں ہاشم کھڑا نظر آ رہا تھا۔  
 دونوں ہاتھ پیٹت کی جیبوں میں ڈالے، لٹلہ کوٹ کا بٹن  
 بند، نرمی سے (بغیر مسکراہٹ کے) اسے دیکھا۔

"تم میرے آفس نہیں آئے، میری سیکرٹری نے  
 دوبارہ تمہیں فون کیا مگر تم نے نہیں اٹھایا۔"  
 "میں مصروف تھا۔" وہ سر جھکائے، ہاتھ صاف  
 کرتے ہوئے بولا۔ ہاشم سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا  
 چہرہ دیکھتا رہا۔



”کیا اس ہفتے آؤ گے؟“

”جی، آؤں گا۔ مجھے اور آپ کو بات کرنے کی واقعی ضرورت ہے۔“ نشو تو کرسی میں پھینک کر سعدی سنجیدگی سے کہتے ہوئے مڑا۔

”تمہارے پاس کچھ ہے سعدی جو میرا ہے، تمہیں چاہیے کہ تم مجھے وہ پر اس طریقے سے لوٹاؤ۔“  
”جیسے تو کیا کریں گے آپ؟“ سعدی قدم قدم چلتا اس کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔  
ہاشم یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ سات سال پہلے جس معصوم لڑکے سے وہ ملا تھا، وہ یہ نہیں تھا۔ ہاشم کے ماتھے پر تل آئے۔

”میں کچھ بھی نہیں کروں گا بچے! سوائے ایک نصیحت کے جس شخص کے خاندان کے دو لوگ قتل ہو چکے ہوں، اس کو احتیاط سے کام لینا چاہیے کہ کہیں اگلا نمبر اسی کا نہ ہو۔“ سعدی کے چہرے پر یہ عجیب سا دکھ ابھرا، بھنوس سکیڑ کر اس نے قدرے تعجب سے ہاشم کو دیکھا۔

”کیا آپ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں؟ کیا آپ میری جان لے سکتے ہیں؟“  
ہاشم نے جیب سے ہاتھ نکال کر عادتاً سعدی کا شانہ ہتھکڑی کو آگے بڑھایا، مگر جیسے ہی اس کا ہاتھ سعدی کے کندھے کو چھوا، وہ کرنٹ کھا کر ایک قدم پیچھے ہوا، دونوں ہاتھ اٹھا دیے اور بہت ضبط سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”اپنے ان ہاتھوں سے مجھے مت چھوئیے گا۔“ ہاشم کا ہاتھ ہوا مطلق میں رہ گیا پھر اس نے سخت

تاثرات کے ساتھ سر کو خم دیا، ہاتھ واپس نیچے کر لیا اور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سعدی تیزی سے باہر نکل گیا۔  
ہاشم نے ایک نظر اپنے خال ہاتھ کو دیکھا۔ وہ پید تھا، پسلی انگلیاں باقاعدگی سے مٹی کیورڈ شدہ۔ اس نے ہلکا سا سر جھٹکا۔ دل میں گہرا کرب اتر آیا۔ کیا وہ دونوں واقعی واپس نہیں جاسکتے تھے؟ انچھوہ قوتوں میں واپس؟ وہ باہر آیا تو نوشیرواں بے زار سا کھڑا دور کرسی پر

بیٹھی حسین اور سعدی کو گھور رہا تھا۔ جیسے بس نہ چلتا دونوں۔ ہنسن بھائی کو گویا ہار دے۔

”کیا ہوا اس کی تھی میں نے؟ اس کی بہن کا بچپن چھوڑ دو!“ اس نے آکر سختی سے کہا تو شیرو نے گڑبڑا کر بھائی کو دیکھا، پھر لاپرواہی سے شانے اچکائے۔  
”مجھے کیا ابونہ!“ ہاشم نے گھور کر اسے دیکھا۔  
”تم ابھی تک اس شہر میں ٹراما سے نہیں نکلے شیرو، بہت ہو گیا۔“

”اس کی وجہ سے میں شہر میں کو کبھی نہیں پاسکوں گا پچھلے ایک ہفتے سے یہی سوچ سوچ کر میرا دل کھول رہا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں بہت ہو گیا۔“

”اوہ پلیر!“ ہاشم نے بے زار سا ہو کر سر جھٹکا۔  
”ہمارے پاس اس سے بڑے مسائل ہیں۔“

”اور کیا مسئلہ ہے؟ آپ نے کہا تھا وہ آپ کے ڈاکیومنٹس نہیں کھول سکے گا۔ پھر؟“ نوشیرواں حیران ہوا۔

”مگر وہ جانتا ہے کہ میرے ہاتھ پر کس کس کا خون ہے۔“ کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔  
نوشیرواں کے ابد تعجب سے تھمتھمتے۔

”وہ وارث غازی کی فائلز وغیرہ کے پیچھے تھا، فارس کو باہر لانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اسے یہ کیسے پتا چل سکتا ہے کہ آپ کسی قتل میں ملوث۔“

”اسے معلوم ہے شیرو! اور فی الحال یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مگر ہاں، تم اس کو نہیں پیچھڑو گے۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم کچھ نہیں کرو گے۔“ براہی سے اس کو تنبیہ کی۔ نوشیرواں نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ ”اوکے“ اور پھر سے ان کی نظروں

سے دور بیٹھے سعدی کو دیکھنے لگا۔  
وہ لوگ اب گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ فنکشن ڈھلتے چاند کی طرح دم توڑ رہا تھا۔ آگے اندھیری رات تھی۔

\*\*\*

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی وہ بڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں زمر شادی کی تقریب سے لوٹی تو اس کی ہدایت کے مطابق صداقت پر اسکیوٹر بصیرت سے کیس فائلز لے آیا تھا۔ وہ ایک بڑا سا بکس تھا جو اس کے کمرے کے فرش پر رکھا تھا۔ وہ ابا کو سلام اور شب بخیر ایک ہی سانس میں کہہ کر آئی، دروازہ مقفل کیا، پرس پرے پھینکا، پھر الماری کھولی۔ نچلے خانے سے ایک چھوٹا سا بکس اس میں سے اخبار کے تراشے اس کی تسبیح نکل کر باہر جا کر رہے تھے جب فارس بری ہوا تھا۔ وہ صبح جب سب کچھ بدل گیا تھا۔ ڈبا اس نے بڑے باکس کے قریب اوندھا کر دیا۔ کلنڈر، تراشے، نوٹس کا ڈھیر لگ گیا۔ پھر اس نے باکس کو بھی الٹا دیا۔ جھک کر جوتوں کے اسٹریپ کھول کر انہیں پرے اچھالا۔ گھنگھریالے اہوں کا گول مول جوڑا بنا کر وہ نیچے بیٹھ گئی۔ جلدی ہلدی ان چیزوں کو الٹ پلٹ کرتی وہ کچھ تلاش کر رہی تھی۔ ابرو ہنپتے ہوئے لب سختی سے پوست، آنکھوں میں غصہ۔ پھر ڈھیر تلے سے اس نے ایک تصویر نکالی، پھر دوبارہ ہاتھ مارا۔

”یہ رائی دوسری تصویر۔“ ضبط بھری سانس لی، تصاویر لے کر اٹھی۔ ننگے پاؤں چلتی دیوار تک گئی جہاں اونچا اور چوڑا سا گرین پورٹ آویزاں تھا۔

زمر نے ایک بن اتاری اور پہلی تصویر وہاں سامنے لگائی۔ پھر دوسری بھی، قدرے پیچھے ہٹ کر تندی سے ان کو دیکھا۔

زمر ناشہ غازی اور وارث غازی۔  
یہ اس کا بورڈ تھا اور ابھی اسے بھرنا تھا۔

وہ واپس پلٹ آئی۔ نیچے ڈھیر لگی چیزوں کو اٹھا کر

اسڈی نیبل پر رکھا۔ ترتیب سے اسلٹ سے اندر الٹا بال کچھ تم ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔ مگر پہلے حجت تمام کرنی تھی۔ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا تھا کہ ہاں واقعی ہر راستہ بند ہونے کے بعد میں نے یہ قدم اٹھایا۔ انصاف کے دروازے بند ہوئے تو

میں انتقام کی طرف آئی۔

وہ نیاٹ سنجیدہ چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔ کلنڈرات کا کلنڈر سامنے رکھا۔ نیبل لپٹ آن کیا۔ پہلے صفحے کی پیشانی پر درج تھا۔

”سرکار بنام فارس غازی“

زمر کی نگاہیں لفظ لفظ عبور کرتی گئیں۔ کھڑکی کے باہر رات گہری تھی اور ہرگز نہ تامل اس کو مزید اندھیرا کرنا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تاریکی کی انتہا کو پہنچ گئی اتنی سیاہ، اتنی سیاہ کہ جیسے ساری روشنیاں دم توڑ گئی ہوں۔

اور پھر پوچھ گئی۔ صبح کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ روشنی کو جیسے کوئی روزن مل گیا۔ وہ پھیلتی گئی، قطرہ قطرہ کرن کرن اور پھر روشنی بھی خوب تیز ہو کر پرانی ہوئی گئی۔

سفیدنی شرٹ اور نیلی جینز میں بلبوس سعدی نے جب زمر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو سورج سوا نیزے پر تھا۔ اتوار کی ست صبح آج بھی ست تھی۔ اس کو پچھلے اتوار کی صبح یاد آئی، جب زمر اس کے ریٹورنٹ آئی تھی اور اس سے گروے کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وہ اداسی سے مسکرایا، پھر سر جھٹکا۔ دروازہ دوبارہ بجلیا کوئی جواب نہیں۔

سعدی نے آہستہ سے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر واضح ہوا۔ فرش پر بے شمار کلنڈر بکھرے ہوئے تھے، تصاویر، فوٹو اسٹیٹس، وہ آہستگی سے چلتا اندر آیا۔ تعجب سے سر اٹھا کر دیوار کو دیکھا۔

بورڈ بھرا ہوا تھا، اوپر وارث اور زمر ناشہ کی تصاویر اور ان کے آگے پیچھے، اوپر نیچے بے شمار تراشے کلنڈرات اور sticky notes چسپاں تھے۔ سرکار بنام فارس غازی سے متعلقہ شواہد تین، شہرت، نام انعام

جوابات، ناگانی گواہیاں۔ سب وہاں مختصر، سچا تھا۔ سعدی نے گرہن موڑ کر اسڈی نیبل کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی فائلز بکھری تھیں اور ایک کھلی فائل پر سر رکھے وہ سوری تھی۔ آنکھیں بند، ناک کی لوٹنگ چمکتی



ہوتی اور ڈھیلا جوڑا کھل کر بھر چکا تھا۔ وہ ہلکا سا مسکرایا پھر قریب آیا۔ میز کے کنارے ہاتھ رکھ کر جھکا۔

”پھپھو! سعدی نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ میں آپ کا سردار ہوں؟“

”ہوں“ کہہ کر سر اٹھانے لگی تو وہ سیدھا ہو گیا۔ بند آنکھوں سے چہرے سے ہل ہناتی سیدھی ہو بیٹھی۔ ٹیس کان کے پیچھے اڑیں۔ آنکھوں کو پوروں سے مسلا۔ پھر چہرہ موڑ کر گلابی خوابیدہ آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائی۔

”تم کب آئے؟“

”ابھی۔ مجھے رات کو لگا تھا آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ کچھ پریشان لگ رہی تھیں۔“ ذہن کے پردے پہ جو اہرنت سے بات کرتی زمر ابھری۔ پھر ایک فکر مند نگاہ بکھرے کفندوں پہ ڈالی۔

”آپ کیا کر رہی ہیں زمر؟“

”اوہ یہ! اس نے ادھر ادھر دیکھا۔“ یہ پراسکوٹر بصیرت نے بھجوائے ہیں۔“ وہ کسل مندی سے اٹھی اور چیزیں ست روئی سے سمیٹنے لگی۔

”ڈیڑھ سال پہلے میں بھی یہی کر رہا تھا۔ مگر آپ کو یہاں کچھ بھی نہیں ملے گا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ خلاف توقع زمر نے سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔ سعدی اک دم چپ سا ہو کر اسی کو دیکھنے لگا۔

”واقعی یہ کیسے مر رہا ہے۔ کوئی بھی چیز یہ ثابت نہیں کرتی کہ فارس مٹی ہے۔“ وہ اب فائل میں صفحے ترتیب سے لگا رہی تھی۔

”سوائے آپ کی گواہی کے۔ مطلب۔۔۔“ وہ احتیاط سے ایک ایک لفظ کہہ رہا تھا۔ ”مطلبہ جو آپ نے کورٹ میں کہا۔ یعنی کہ۔۔۔ فائرنگ سے پہلے فارس غازی کے نمبر سے فارس غازی کی آواز میں آپ کو کال کی گئی تھی۔“

”اور تم نے۔۔۔“ زمر نے پرسکون ٹھنڈی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”اپنے وکیل کے ذریعے کورٹ میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ کال جعلی تھی کوئی سافٹ ویئر نوڈر کے فارس سے مشابہ آواز بنائی گئی تھی۔“

”جی۔ کیونکہ وہ جعلی تھی اور اسی لیے جج نے ماسوں کو رہا کر دیا۔“

”یو لو سعدی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ زمر نے سمجھنے والے انداز میں اذیت میں سر ہلایا۔ ”ہو سکتا ہے مجھے واقعی سیٹ اپ کیا گیا ہو۔ وہ سب جھوٹ ہو۔ میری غلط گواہی کی وجہ سے فارس (نام لینا بھی اذیت ناک تھا) نے چار سال جیل میں کالے۔ یہ کیس مکمل طور پر پڑھنے کے بعد غیر جانب داری سے مجھے واقعی لگ رہا ہے کہ میں ہی غلط ہوں۔ مجھے نہیں پتا۔ مگر یہ نہیں خیال کہ اب میرے پاس کوئی وجہ باقی رہ گئی ہے۔ تمہارے ماسوں کو مورد الزام ٹہرانے کی۔ اس لیے کہ میرا دل پوری طرح صاف نہیں ہوا مگر میں اپنے الزامات سے پیچھے ہٹی ہوں۔“ سنجیدگی سے کہتی وہ اب فائل کمرے کی چیزیں اپنی جگہ پہ واپس لارہی تھی۔ ”اگر میں غلط ہوں اور تم سب ٹھیک ہو اور شاید ایسا ہی ہو تو میں ہار مانتی ہوں۔“

”میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ ہار مائیں۔“ اس کو دیکھ ہوا تھا۔

”گڈ! پھر تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ فارس نے جو مجھے کال کی تھی جو تمہارے بقول جعلی آواز تھی۔ واٹ ایو۔ اس کی ریکارڈنگ تمہیں کہاں سے ملی؟“

”ریکارڈنگ! سعدی کے حلق میں کچھ پھنسا۔“

”ڈیڑھ سال پہلے تمہارے وکیل نے وہ ریکارڈنگ عدالت میں پیش کی تھی اور تمہارے ایکسپٹ گواہ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس آواز کا وائس پرنٹ فارس کی آواز کے وائس پرنٹ سے مختلف ہے۔ اور اس ریکارڈنگ کا سورس تم لوگوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ کیا تم مجھے بتاؤ گے وہ تمہیں کہاں سے ملی؟“ اس کی سنجیدہ بھوری آنکھیں سعدی پہ جمی تھیں۔

سعدی نے اس کو دیکھتے ہوئے لب کھولے پھر بند کیے۔ ذرا سا سوچا پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں اس بنیاد پہ کہ میرا جواب مجھے مرتکب جرم ظاہر کر سکتا ہے۔“

”قانون شہادت آرٹیکل 15 کے تحت تمہیں یہ استثنیٰ حاصل نہیں ہے کیوں کہ ایسے جواب پہ تمہارے خلاف کارروائی کی جاسکتی ہے۔“

”چونکہ ہم کورٹ میں نہیں ہیں اس لیے میں جواب نہ دینے کا حق رکھتا ہوں۔“

”اوکے۔“ زمر گہری سانس لے کر مسکرائی، مہر کو خم دیا اور باہر آکر صداقت کو چائے کے لیے آواز دی۔

سعدی الجھا ہوا کھڑا رہا۔ پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔

”کیا آپ فارس غازی کو بے گناہ کہہ رہی ہیں؟“

”میں یہ کہہ رہی ہوں کہ میں دوبارہ اس پر الزام نہیں لگاؤں گی۔“ وہ مطمئن سی کہتی راہداری میں چلتی گئی۔

سعدی نے نظرس موڑ کر بورڈ کو دیکھا جو مختلف کاغذات سے بھرا تھا۔ زمر نے کیس پر دھا، شہادتیں، ثبوت۔۔۔ سب دیکھا جس سے وہ ہمیشہ منہ پھیر کر چلی جاتی تھی اور اسے یقین آ گیا کہ فارس بے گناہ ہے۔ سیدھی سی بات تھی۔ اسے تو خوش ہونا چاہیے۔ مگر پرل کا کون سا ٹکڑا عائب تھا؟ ساوا بات میں پچھلی کون سی پیچیدگی اسے الجھا رہی تھی۔

سعدی نے کئی سال اس لمحے کا انتظار کیا تھا جب پھپھو تسلیم کر لیں کہ فارس بے گناہ تھا۔

وہ لمحہ آیا اور گزر گیا مگر وہ مطمئن کیوں نہیں تھا؟ کیا اس لیے کہ وہ کئی سال پہلے والا معصوم سعدی نہیں تھا؟ اور آج کے سعدی کا دلغ اسے بتا رہا تھا کہ زمر اتنی آسانی سے مڑنے والی نہیں تھی۔ پھر؟

وہ خود سے الجھتا ہار گیا۔ ابھی اسے ایک جگہ اور بھی جانا تھا۔

ہر اک قدم اجل تھا ہر اک گام زندگی ہم گھوم پھر کے کوچہ کمال سے آئے ہیں کاردار نصیب وہ اتوار معمول کی چستی اور گہما گہمی کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔ سعدی نے پچی چار دیواری پہ مارن دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈز نے دروازہ کھول دیا۔ کارخصوص چیک پوائنٹس سے گزر کر آگے آئی ڈھلان عبور کی اور وہ رہا سامنے اونچا محل بار اس کے عقب میں، نشیب میں چھوٹی سی انگیسی۔

وہ کار اس روش پہ آگے لے گیا جو اونچے نیچے سبزے کے درمیان سے گزر کر انگیسی تک جاتی تھی۔ دفعتاً اس نے رفتار آہستہ کر دی۔ ہاشم کی عقبی بالکونی کا منظر سامنے آیا، وہ نیچے سبزے پہ کھڑا تھا۔ ٹراؤزر اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں بیٹے ہوئے جھک کر اپنے پالتو لیبر ڈارکتے کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ ساتھ بے اختیار ہنسی پر جوش سی سونیا کھڑی تھی۔ وہ دونوں بدھم آواز میں باتیں کرتے بیٹے جارہے تھے۔

گاڑی کی آواز پہ ہاشم نے سر اٹھایا، ایک نظر ڈرا سینگ سیٹ پہ بیٹھے سعدی کو دیکھا، دوسری کار کے منہ پہ ڈال۔ (مطلب وہ انگیسی جا رہا تھا)۔ پھر مسکرا کر سیدھا ہوا ہلکا سا ہاتھ ہلایا۔

سعدی نے جواب میں ہنا مسکرائے دایاں ہاتھ اٹھایا، پیشانی کے قریب لے جا کر سر کو خم دیا، خاموش سلام (ادب پہلا قریب ہے دشمنی کے قریبوں میں) اور کار آگے لے گیا۔ ہاشم سروس مسکراہٹ سے اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر سونیا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اسے کچھ کہہ رہی تھی۔

سعدی نے کار انگیسی کے قریب کھڑی کی۔ پیچھے دیکھے بغیر برآمدے میں آیا۔ نیل دہائی، بجلی نہیں تھی کبھی گھنٹی نہیں بجی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ آیا۔ اس نے انتظار نہیں کیا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ فارس نے جیل کے نلے سے اسے دے رکھی تھی۔



اندر آیا تو گھر خاموش کھڑا تھا وہ قدرے حیران سا ایک کمرے سے دوسرے تک گیا باہر فارس کی کار تو کھڑی تھی۔ پھر؟

”اُدھر ہوں نیچے۔“ فارس کی آواز آئی تو وہ چونکا۔

پھر مہر سانس لے کر سیٹ کو جاتی بیٹھیوں تک آیا۔ نیچے پورے گھر کے رتبے جتنا بڑا سا کمرہ تھا۔ جس میں بڑے بڑے ستون تھے ارد گرد کاٹھ کباڑ پرانا فریزر کھاڑی کا سامان وغیرہ رکھا تھا۔ ایک دیوار پر خالی رکھیں تھے۔ یہاں کسی زمانے میں فارس کی پستولوں اور بندو قلوں کی کلکیشن ہوتی تھی۔ جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو سب لے گئی۔ کچھ بھی واپس نہیں کیا۔

سعدی زینے اتارنا نہ خانے کے فرش تک آیا۔ اندر سفید بلب جل رہے تھے۔ پھر بھی روشنی کم لگتی تھی۔ فارس دیوار سے لگی میز کے آگے کھڑا تھا۔ سعدی کی طرف پشت تھی۔ سر جھکا کر منہ میں کچھ چباتا کچھ کانڈات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ مگر سعدی نے اسے نہیں دیکھا۔ وہ میز کے پیچھے موجود دیوار کو دیکھتا قدم قدم آگے کیا۔

وہاں کوئی بورڈ وغیرہ نہ تھا۔ دیوار پر ہی تصاویر کانڈات کلنگز وغیرہ چسپاں تھیں۔ اوپر نیچے دائیں بائیں یہ زمردی دیوار سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ سعدی کے ابرو مگر مندی سے اکٹھے ہوئے۔ ذرا اٹھکی سے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔

”تو آپ دھتے سے یہ کر رہے تھے؟“

”کوئی اعتراض؟“ وہ پیالے میں رکھی سونف کے دانے اٹھا کر منہ میں رکھتا مڑے بنا بولا۔ ابھی تک سعدی کو نہیں دیکھا تھا۔

”مگر آپ کر کیا رہے ہیں؟“ وہ اس کے ساتھ آکھڑا ہوا، آنکھیں سکڑ کر اس کا دہانہ رخ دیکھا۔ چھوٹے کٹے بال اور سنجیدگی سے سکڑی سنہری زرد آنکھیں جواب دیوار پر جمی تھیں۔

”جو ساری زندگی کیا ہے۔ تفتیش۔“ وہ سرخ مار کر لے کر دیوار تک گیا۔ ایک کٹنگ چسپاں کی اور مار کر

سے اوپر سوالیہ نشان بنایا۔ پھر واپس مڑ کر سعدی کو سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

”تم کیسے آئے؟“

مگر وہ اب گردن موڑ کر میز کے کنارے بیٹھ کر رکھے ایک کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں اس کی تازہ آواز منگوائی گئی گنز تھیں اور گولیاں۔ اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سعدی کو غصہ آنے لگا۔ وہ اس کی بے گناہی کے ثبوت دیتا تھا۔ کیا اور اوھر آکر کوئی یہ سب دیکھ لے تو؟

”کیا یہ آپ کے نام؟“ لائنس شدہ ہیں؟“

ناپسندیدگی سے گنز کو دیکھ کر اس نے مشکوک نظروں سے فارس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔ اگر گرفتار کرتا ہے تو کراؤ۔“ تنگی سے کہتا وہ میز تک واپس آیا اور کانڈات اٹھا کر دوسری طرف رکھنے لگا۔ سعدی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”ڈیڑھ سال پہلے میں یہی کر رہا تھا۔ مگر یہ تفتیش آپ کو نہیں نہیں لے کر جائے گی۔ اس کے آگے بند کٹی ہے۔“

”تو پھر تم مجھے سکھاؤ کہ تفتیش کیسے کرتے ہیں؟“

میں ساری کلاسز اینڈ کروں گا۔“ ناک سے مکھی اڑاتا وہ اثر لیے بنا بولا۔ سعدی آف کر کے رہ گیا۔ پھر گھوم کر اس کے سامنے آیا۔

”اگر آپ کو پتا چل بھی گیا کہ یہ سب کس نے کیا ہے تو آپ نے یہ اسلحہ اس لیے لیا ہے نا کہ اس کو جا کر گولی مار دیں۔“

”تم خون کے بدلے خون پر یقین نہیں رکھتے؟“

”بالکل رکھتا ہوں مگر انتقام لینے کے بھی طریقے ہوتے ہیں۔ آپ اس کو مار دیں گے کل کو اس کے خاندان والے کسی اور کو مار دیں گے اور یہ سائیکل آف ریوٹ (انتقام کا چکر) کبھی نہیں ختم ہو گا۔“ اس نے فکر مندی سے سمجھاتے ہوئے آہستہ سے فارس کی کہنی تھامی۔

”ساموں! ہم ان کو سزا ضرور دلوں گے مگر قانونی طریقے سے۔ اس طرح نہیں۔“

فارس تکیہ آنکھیں کر کے اسے دیکھتا رہا۔

”اور اس ”ان“ میں کون کون شامل ہے وضاحت کرو مجھے؟“

سعدی نے کہنی چھوڑی، پیچھے ہوا، تھوک لٹکا۔ ذرا سے شلے اچکائے۔ ”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟“

”یہی تو پوچھ رہا ہوں جو تمہیں پتا ہے وہ کسے پتا ہے؟“

سعدی نے تھپڑ بھڑک کر نظر ملانے بنا دیوار کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں جواب دینے سے انکار کرتا ہوں اس بنیاد پر کہ میرا جواب مجھے مرتکب جرم ثابت ہو سکتا ہے۔“

”اوہ کم آن“ تمہیں یہ امستھلی۔“

”قانون شہادت آرٹیکل 15 کے تحت حاصل نہیں ہے“ وغیرہ وغیرہ پیچھے پتا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ فارس نے واقعی ابرو اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھا۔ سعدی نے کندھے اچکائے۔ ”زمر پھو کا بھتیجا ہوں آخر! اتنا قانون تو مجھے بھی آتا ہے۔“

فارس کے تاثرات قدرے پتھر گئے وہ سنجیدہ سا واپس ہڑ گیا۔ سعدی کی مسکراہٹ مدھم ہوئی۔ ”کیا ہوا؟“

”جو تمہاری پھپھو نے میرے ساتھ کیا وہ میں نہیں بھولا“ اس لیے بہتر ہے ہم اس طرف نہ جائیں۔ چائے پیو گے؟“

سعدی کا دل بری طرح دکھا، مگر بس نے لب کھول کر منہ کر لیے۔ پھر سر ہلایا۔ ”جی پیوں گا۔“ اور کرسی کیچنے لگا۔

”اوپر کچن میں سارا سامان رکھا ہے، ہنالو۔ دو کپ۔ میرے میں چینی نہ ہو۔“

وہ جو بیٹھے لگا تھا ارکا ناراضی سے اسے دیکھا اور بہت اچھا کہہ کر بیٹھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ فارس بدستور گردن جھکائے کانڈات کھنگال رہا تھا۔

انیکسی کا کچن لاؤنج سے ملحقہ تھا۔ بالکل ادریں۔ اس نے سامان ڈھونڈا۔ چولہا جلایا۔ پانی میں پتی گویا نہوئی۔ پھر کھڑکی کو دیکھا۔ اس پر وہ وغیرہ نہ تھا کھڑکیوں کے شیشے پہ گفٹ پیپر لگا کر بھونڈی سی بچت

کی گئی تھی، اور یہ تو سب کو پتا تھا کہ ذرا تاہم ایک انتہائی پھونڈی لڑکی تھی۔

سعدی نے کھڑکی کھولی تو سامنے اونچے قعر کا عجب حصہ نمایاں ہوا۔ بائیں بال کتے کی طرف اچھا تاہم اسے منہ میں بیچ کر کے سونیا کی طرف بھاگتا۔ سونیا منہ ہنس کے دیوہری ہو رہی تھی۔

سعدی کے چہرے پہ زخمی سا تاثر آیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ زور سے ٹھک۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا، ہاشم کی فاکٹروہ لے کر بھی بے بسی سے بیٹھا تھا۔ اسے جلد از جلد ثبوت اکٹھے کر کے ہاشم کیس جانا تھا۔ تاکہ زمر اور فارس کی آپس کی غلط فہمی دور ہو جائے۔ ذہن میں آگے کا لائحہ عمل ترتیب دیتا وہ چائے بنا کر نیچے لایا تو فارس اپنی بھری دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ پچھلا بدانت سے دبائے، آنکھیں سکڑ کر کچھ سوچتا۔

”یہ آئی!“ اس نے الیاس فاطمی کی تصویر پہ انگلی سے دستک دی۔ ”یہ وارنٹ کا پاس تھا اور اس نے وارنٹ سے اسٹیفی مانگا تھا۔ ہر بندگی کا سرا اس شخص تک جاتا ہے۔ یہ یقیناً“ کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔“ اس نے تائیدی نظروں سے سعدی کو دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے اور کپ فارس کی طرف بڑھا دیا۔

فارس نے گھونٹ بھرا پھر دمنی سے اسے دیکھا۔

”اس میں چینی ہے۔“

”اوہ میں بھول گیا۔ سو ری۔“ سعدی نے معصومیت سے معذرت کی مگر سی پی بیٹھا اور اپنے کپ سے گھونٹ گھونٹ بھرنے لگا۔ فارس نے اسے گھور کر سر جھٹکا، پھر دوبارہ دیوار کو دیکھنے لگا۔ وہاں چسپاں تصویریں بلیک اینڈ وائٹ تھیں۔ پھر ٹیکہ ان میں رنگ بھرنے لگے۔ کوئی قوس قزح چھائی اور زرد موسم میں بہا اتر آئی۔

فارس بالکل خاموش سا ان تصویروں کو دیکھتا گیا، یہاں تک کہ وہ چلنے پھرنے لگیں گویا چار سال پہلے کے مناظر ابھی ان کے آس پاس پیش آرہے ہوں۔



شہر ہوا میں چلتے رہنا اندیشوں کی چوکھٹ پر رات گئے تک الجھے رہنا بے مقصود خیالوں میں چار سال قبل (وارث غازی قتل کے ساتھ دن بعد)

قصر کاردار کے لوگ روم کی اونچی کھڑکیوں سے دھوپ چھن کر آ رہی تھی۔ اورنگ زیب کاردار بگڑے تاثر اور خفا آنکھوں کے ساتھ فون پہ بات کر کے بٹے اور موبائل پھینکنے کے انداز میں صوفے پہ اچھالا۔ ٹالی کی ٹاٹ ڈھیلی کی ضبط کرتے ہوئے صوفے کے آگے دو تین چکروں میں شلے۔ دفعتاً ہیل کی ٹک ٹک آتی سنائی دی۔ اورنگ زیب نے پلٹ کر خشکیں نگاہوں سے دیکھا۔

راہداری سے جواہرات چلتی آ رہی تھی۔ بند گلے کا سفید لمبا گاؤں پنپے 'وہلی پتلی' اسٹارٹ 'جوانا اور خوب صورت سی۔ یقیناً 'ابھی کیس سے لٹی تھی۔ کہنی پر انکا پرس مسکراتے ہوئے میز پر رکھا اور قریب آئی۔

"گمڈ ایونگ! گاؤں کے گلے پہ لگے بٹن کو دو انگلیوں سے چھینتی 'یہ میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ اور نگریب کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ فارس کے بھائی کے قتل کا کیا چکر ہے؟ پولیس میرے گھر کیوں آ رہی ہے؟" وہ سخت نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"تمہارا مطلب ہے 'تمہارے' بھانجے کے سوتیلے بھائی کا کیا چکر ہے؟ اور یہ کہ پولیس تمہارے گھر کی انٹیکسی میں کیوں آ رہی ہے؟ وہ سوری 'وہ تو تم کئی سال پہلے اپنے بھانجے کو دے چکے ہو۔"

"جواہرات! وہ بظاہر طیش سے غرائے مگر اس جارحیت میں مدافعانہ سی جھٹک تھی۔

"بے فکر رہو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ لوگ اس کے بھائی کی خود کشی کو قتل قرار دے رہے ہیں اور اس کا الزام فارس پہ لگا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے کہ فارس قتل کے وقت پارٹی میں نہیں تھا۔" وہ نرمی سے کہتی آگے آئی 'گازر میں نصب ایکو بریم تک آرکی مگر دن

جھکا کر اس میں جھانکا "اور ٹھیک ہے وارث کا موبائل فارس کی کار سے ملا ہے۔" دو انگلیوں سے ایکو بریم کا شیشہ بجایا 'پچھلیوں میں ہلچل سی گئی 'جواہرات مسکرائی۔ "اور ہاں 'وہ رسی جس سے وارث کے ہاتھ پیر باندھے گئے 'وہ بھی اس کے پاس سے لی ہے اور وہ تھا بھی فارس کا سوتیلے بھائی مگر 'سیدھی ہوئی 'شینڈ میں رکھے جارہے خوراک کی مٹھی بھری اور پانی کے اوپر کھول دی۔ سارے واسے پانی میں گر گئے۔

"مگر اس سب سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہارے بھانجے کو گنز جمع کرنے کا شوق ہے 'استعمال کرنے کا تھوڑی ہے۔ یقیناً 'یہ ایک خود کشی ہوگی 'ناکہ قتل۔" وہ انداز میں گراہتہ نشو سے صاف کرتی 'چمکتی آنکھوں سے مسکراتی ان کے سامنے آئی۔ "ہے نا؟" اور غصے سے کھولتے اورنگ زیب اس سے پہلے کہ مزید کچھ کہتے 'وہ ان کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

تیز تیز چلتی وہ راہداری میں آگے آئی تو مسکراہٹ اضطراب میں تبدیل ہو گئی۔ کنٹرول روم کے دروازے کو کھولا تو اندر موجود خاور اور ہاشم دونوں چونکے 'وہ دروازہ بند کر کے ہاشم کے سامنے آکھڑی ہوئی اور سنگتی نظروں سے اسے گھورا۔

"تمہارے باپ کی کیمین ڈسٹرب ہو رہی ہے اس سب سے گور وہ خوش نہیں ہے۔"

"دیکھ چکا ہوں۔" ہاشم نے بے زاری سے دیوار پہ نصب اسکرینز میں سے ایک کی جانب اشارہ کیا 'جہاں لاؤنج کے سی سی ٹی وی کیمرہ کی فوج چل رہی تھی۔ بنا آواز کے ویڈیو۔ بائی اسکرینز پہ دوسرے مناظر تھے۔ (لاؤنج کے علاوہ 'ٹیٹ لان بیرونی برآمدہ جیسے چند مقامات پہ ہی یہ کیمرے نصب تھے۔)

"میں نہیں چاہتی کہ وہ فارس کے ساتھ کھڑا ہو جائے اس لیے جو کرنا ہے جلدی کرو۔"

"ہاشم سنبھال لے گا 'آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔" وہ مضطرب سایہ کہہ کر آگے آیا 'اور خاور کی کرسی کے ساتھ جھک کر لیپ ٹاپ کو دیکھنے لگا 'جس پہ خاور ٹھک ٹھک کام کیے جا رہا تھا۔

"آج تم سعدی اور فارس کے ساتھ پراسیکیوٹر کے پاس گئے تھے کیا کہا اس نے؟"

"اسے فارس کی بے گناہی کا یقین ہے 'کیونکہ فارس کے پاس قتل کی وجہ نہیں ہے۔"

"تو تمہیں ہاشم 'اسے قتل کروانے سے پہلے وجہ ڈھونڈ کر فارس پہ یہ سب پلانٹ کرنا چاہیے تھا۔"

جواہرات غرائی تھی۔ وہ طیش سے اس کی طرف مڑا۔ "میں کارپوریٹ لائبر ہوں 'کرائے کا قاتل نہیں اور میں نے کچھ بھی پلاننگ سے نہیں کیا تھا 'آپ کو معلوم ہے یہ ایک غلطی تھی اور مجھے اس کو فکس کرنا ہے۔" رک کر اس نے غصے سے ماں کو دیکھتے ہوئے ایک دہانسی لیں۔ "اور یہ سب اتنے آرام سے فکس نہیں ہو گا۔ صرف فارس نہیں 'خاور بھی قتل کے وقت پارٹی میں نہیں تھا۔" اسی ٹیل دروازہ رسی ی دستک کے ساتھ کھلا۔ ہاشم اور جواہرات کرنٹ کھا کر اس طرف گھومے۔ خاور بھی بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابہ آئی ایم سوری 'میں۔۔۔ انکل نے بلایا تھا تو۔۔۔" وہ زرتاشہ تھی 'چوکھٹ پہ رک کر واپس جانے لگی تھی۔ "آپ لوگ بڑی ہیں 'اٹس اوکے۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔" قدرے تذبذب سے معذرت کرتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹا۔ باری باری سب کے چہرے دیکھے جو سفید پڑ گئے تھے۔

"نہیں۔۔۔ ہم بس۔۔۔ بات کر رہے تھے۔" ہاشم نے تھوک نگلا تھا 'چہرے پہ زبردستی مسکراہٹ لاتا آگے آیا 'مگر اڑی رنگت اور آنکھوں میں آتی پریشانی دبا نہیں پا رہا تھا۔

"سوری 'میں ایسے ہی آگئی۔" وہ ذرا شرمندہ 'ذرا سوچتی 'انجنتی نگاہوں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ آپس میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ اسے آتے اسکرینز کی فوج میں نہیں دیکھا۔ افس!۔

"کوئی بات نہیں 'ہم ایک ہی خاندان ہیں۔" جواہرات پھیکا سا مسکرائی 'اپنی جگہ سے وہ ایک لڑچ بھی نہیں ہل پارہی تھی۔ کیس اس نے کچھ سن تو نہیں

لیا۔ "انکل فارس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وارث بھائی کے کیس کی پیش رفت دیکھو۔ میں بھی آپ سے پوچھنے آئی تھی۔ مجھے تو کوئی کچھ بتانا ہی نہیں ہے۔" کہتے کہتے اس نے ترچھی نظر خاور پہ ڈالی جو بالکل دم سادھے کھڑا تھا۔

ساونڈ پروف دروازے کو کھولتے وقت آخری فقرہ کان میں پڑا تھا۔

"صرف فارس نہیں 'خاور بھی اس وقت پارٹی میں نہیں تھا۔"

"آہم۔۔۔" ہاشم کھٹک کر گلا صاف کرتا باہر گیا 'زرتاشہ بھی چوکھٹ سے ہٹ کر راہداری میں آکھڑی ہوئی۔ ہاشم نے بات شروع کرنے سے قبل ذرا احتیاط سے اسے دیکھا۔ وہ جو بیس 'چھبیس برس کی خوش شکل 'سیاہ آنکھوں اور اسٹیمپ میں کئے بالوں والی لڑکی تھی۔ اس وقت ابھو ذرا الجھن سے سکڑ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہم سب کو پتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ اس کی گاڑی سے کچھ ملنے سے کچھ ثابت نہیں ہو جاتا زرتاشہ۔" وہ کلنی سنبھل کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ "رہی بات پراسیکیوٹر کی تو وہ خواخواہ فارس پہ شک کر رہی ہے اور اس کو بار بار سوال جواب کے لیے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ پراسیکیوٹر زمر پونو! سعدی کی بھینس۔ ابھی دیکھو کو بھی فارس وہیں تھا۔" زرتاشہ کی الجھن مدھم ہوئی 'اس کی جگہ ناگواری سی ابھری۔

"وہ فارس پہ شک کر رہی ہیں؟"

"اس نے فارس کو کہا ہے کہ وہ اسے اپنی alibi لڑکی سے ملوائے 'اس کو فارس کی بے گناہی کا ثبوت چاہیے۔ اب معلوم نہیں کتنے دن وہ بے جاہد اس کے آگے کے چکر لگا رہے گا۔ مگر زمر کو کون سمجھائے؟"

"تو جب تک اس کو یقین نہیں آئے گا 'وہ فارس کو اپنے پاس بلواتی رہے گی؟" وہ تیزی سے اسے دیکھتی



بولی۔

”اگر کم آنے۔“ ہاشم نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔  
”روز کے چند گھنٹے اس کے ساتھ گزار لینے سے ان کے درمیان کوئی پرانی بات پھر سے نہیں شروع ہو جائے گی، پھر وہ سا کر دیا ہے شوہر۔“

اور ہاشم کے لیے الفاظ تاش کے پتے تھے۔ آگے پیچھے الٹ پلٹ کر کے ان کو ترتیب دیا، مرضی کے سامنے لایا، مرضی کے چھپا گیا، اور مرضی کا مطلب نکال لیا۔ زرتاشہ لب پیچھے مضبوط سے واپس مڑ گئی۔ وہ فوراً اس کے پیچھے آیا۔

”سنو، تمہیں بھی فانس بہ شک ہے؟ بے شک وہ پارٹی میں اس وقت نہیں تھا مگر۔“ وہ دونوں ساتھ ساتھ راہداری میں چل رہے تھے جب ہاشم نے پتے پھر سے سجائے، مگر وہ تیزی سے اس کی طرف کھوئی۔  
”صرف فانس کیوں؟ خاور بھی تو پارٹی میں نہیں تھا۔ پھر پولیس صرف فانس کے پیچھے کیوں آ رہی ہے؟“ اس نے جوسنا تھا اگل دیا۔

مگر ہاشم تیار تھا اور بظاہر حیرت سے سر اثبات میں بلایا۔  
”واقعی عجیب بات ہے میں بھی ابھی می سے یہی کہہ رہا تھا کہ خاور بھی اس وقت نہیں تھا اور بھی کچھ لوگ نہیں تھے مگر۔“

”اور کون؟“ اس نے اسی تیزی سے بات کالی۔  
”میری ہمارے کچھ دوست، مگر میری پارٹی کوئی ایسا بیانہ تو نہیں ہے کہ جو اس میں نہیں ہو گا وہی قاتل ہے لہذا اسی پہ شک کیا جائے۔ یونواٹ، یہ فانس پہ شک، پراسیکوٹر کی اس سے تفتیش، یہ سب جان بوجھ کے کیا جا رہا ہے۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ ابھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ہاشم کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

وہ واپس آیا تو دم ساوھے کھڑی جواہرات تب تک نہیں بولی جب تک اس نے دروازہ بند کر کے لاگ نہ کر دیا۔ پھر گہری سانس لے کر ان دونوں کی طرف گھوما۔

”اس نے کوئی نقصان پہچانے والی بات نہیں سنی۔“

”میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں ہاشم۔“ جواہرات چیخ پڑی۔ ”اس سب کو ختم کرو۔ فانس پہ سب الزام ثابت کر دو، اسے جیل بھجواؤ تاکہ میں سکون کی نیند ہو سکوں۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کتا خلوڑنے کی لپٹ ٹاپ تک آیا، اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”کہاں تک پہنچا کام؟“

”ہو گیا ہے، سرب۔“ وہ تابع داری سے اسکرین پر اسے کچھ دکھانے لگا۔ جواہرات سامنے کھڑی تھی، فکر مند، ابھی ہوئی سی ان کو دیکھنے لگی۔  
”تم لوگ کیا پلان کر رہے ہو؟“

باہر لان میں زرتاشہ بیٹھے باندھ لپٹے، سر جھکائے کسی عجیب کشمکش میں چلتی جا رہی تھی۔ ”فلتنا“ آوازوں پہ وہ رکی۔ گردن کھما کر دیکھا۔

لان کے کنارے مصنوعی آبشار تھی۔ وہ اس وقت بند تھی، اور اس کے لسنٹپ بہ شہرین بیٹھی تھی۔ ٹائٹس کے ساتھ سرخ کشان نما شرٹ پہنے، وہ چوٹم چباتی، سر جھکائے موبائل پہ ٹن دبا رہی تھی۔ زرتاشہ نے لمحے بھر کو سوچا کہ اس کی شرٹ گردن کی مالا کھلائی کا کڑا اور اوہ! یہ لانگ شوٹ۔ یہ کس کس برائڈ کے ہوں گے؟ مگر پھر۔ اس نے سر جھٹکا اور اس طرف آئی۔

”شہرین۔“ شہرین نے چونک کر سر اٹھایا، پھر آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھتے، چہرے پہ سامنے کو آئے سنہری بال پیچھے ہٹائے۔

”ہیلو زرتاشہ۔“ وہ کروفر سے مسکرائی۔  
”کیا تم مجھے سونی کی برتھ ڈے پارٹی کی ویڈیو دے سکتی ہو؟ مجھے اپنی کزنز کو تمہاری ساڑھی دکھانی ہے۔ ایکسٹرا کاپی ہوگی نا تمہارا پیاس؟“

”شیور۔“ خاور نے بہت سی سی ڈیز مجھے دی تھیں، میں میری انجیو کے ہاتھ بھجوانی ہوں۔“ نقا خزانہ شانے اچکائے۔ زرتاشہ نرمی سے تھینکس کر کے

آگے بڑھ گئی۔

جھٹکا۔

”زمر کو آج بھی فانس کی بے گناہی کا یقین ہے، کل بھی ہو گا۔“

”ہم اس کو فانس کی طرف سے کال کریں گے۔“ کہتے ہوئے ہاشم نے خاور کی طرف اشارہ کیا۔ خاور نے لب پلپ اسکرین جواہرات کے سامنے کی۔ وہ مشتبہ نظروں سے اسے دیکھتی قریب آئی۔

”کیا تم دونوں وضاحت کرنا پسند کر رہے؟“ خاور نے سر کو اثبات میں ہلایا اور اسکرین کو دیکھتے ہوئے سوپ انداز میں سمجھانے لگا۔

”میں نے اس سافٹ ویئر میں فانس کی تمام ریکارڈنگز ڈال دی ہیں جو میرے پاس ہیں۔ ہم کچھلے ایک ہفتے سے اس کا ٹون ٹیپ کر رہے تھے۔ اب دیکھئے۔“ وہ چند ٹن دبا کر مزید کچھلے کھولنے لگا۔ جواہرات بدستور مشکوک سی اسے دیکھنے لگی۔

”میں جو بھی ٹاپ کروں گا، وہ فانس کی آواز میں ابھر کر سامنے آئے گا۔ ہم فانس کے فون سے پراسیکوٹر کو کال کریں گے اور ہمارا کہا ہوا اسکرپٹ اس کی آواز میں پڑھا جائے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ یہ فانس ہے اور اس پہ حملہ کرنے سے پہلے اس کے سامنے اعتراف جرم کر کے اپنے خمیر کی آخری چھین نکال رہا ہے اور اس کو ختم کر کے آخری ثبوت بھی مٹانا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ زندہ بچ جائے گی، اس لیے وہ اسی کال کو فانس کے خلاف استعمال کرے گی۔“

”آف کورس، زمر کے پاس یہ ریکارڈنگ نہیں ہو گی۔ لیکن اس کو فانس کے یہ الفاظ ساری زندگی یاد رہیں گے۔ اس بنیاد پر وہ اسے جیل بھی بھجوائے گی اور وہ اس کے خلاف سب سے بڑی گواہ ہوگی۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سب سے بڑے دشمن بن جائیں گے۔“

جواہرات قدرے اچھے سے دونوں کے چہرے دیکھنے لگی، لب دانت سے کاٹے ہوئے وہ کلنی منتظر نظر آ رہی تھی۔

”ہاشم! اگر کچھ غلط ہو گیا۔ اگر زمر ہماری چال میں

چلے ہی کو ہے اک سوم ابھی رقص فرما رہے روح بریادی  
”تم ایک تیر سے کتنے شکار کرنا چاہ رہے ہو ہاشم؟“  
”اگر کچھ غلط ہو گیا تو۔“

”پھر سے سن لیں پلان، کچھ غلط نہیں ہو گا۔ ہم زمر پہ فائرنگ کریں گے، مگر فانس کی استعمال ہوگی، ہونے کے جس کمرے سے گولی چلے گی وہ بھی اسی کے نام پہ ہو گا۔ مگر فانس کے فنگر پر ٹیس بھی ملیں گے۔“

”اور اگر وہ مر گئی تو؟“ جواہرات کو ہول اٹھ رہے تھے۔

”اس کو نہیں مارنا ہم نے می۔ وہ بظاہر فانس سے تفتیش کر رہی ہے، اس پہ شک کر رہی ہے، ایسے میں زمر کو یہ حملہ ایک مجرم کو خود کو چھپانے کا حربہ لگے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ گرفتاری کے خوف سے فانس نے یہ سب کیا ہے۔“

”اور اگر اس نے اسے فانس کے خلاف سازش سمجھا تو؟“

”اوسوں۔“ ہاشم پہلی دفعہ کھل کر مسکرایا اور خاور کو دیکھا۔ وہ بھی مسکرایا۔ جواہرات نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”کیا میں کچھ مس کر رہی ہوں؟“  
”زمر کبھی بھی نہیں سمجھے گی کہ یہ فانس کے خلاف سازش ہے۔ وہ فانس کو ہی قصور وار سمجھے گی کیونکہ یہ بات اسے فانس خود کہے گا۔“

”اوکے، اور فانس اسے یہ بات کیوں کہے گا؟“ جواہرات اب ذرا اکتانے لگی تھی۔

”وہ اس طرح می کہ ہم فانس کی طرف سے زمر کو یہی بات کہلوائیں گے۔“

”ہرگز نہیں ہاشم۔“ جواہرات نے کوفت سے سر



نہ آئی، اگر اس نے اس سب کو ایک سوچا سمجھا پلان سمجھا تو؟

”تو پھر ہماری قسمت کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہو گا مگر میں اپنے خاندان کے لیے اچھی امید رکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ شانے اچکا کر سات سا نظر آنے لگا۔

جواہرات نے بدلتی مسکرا کر سہلایا، ”مگر وہ ابھی بھی خوش نہیں تھی۔ آنکھوں میں شدید اضطراب تھا، پھر بیکام کسی خیال کے تحت اس نے چونک کر ہاشم کو دیکھا۔

”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر فارس نے واقعی وارث کا کل کیا ہے اور وہ زمر کے سامنے اپنی کل میں اعتراف جرم بھی کر لے گا تو ابھی وجہ قتل کیا ہو گی؟ کم از کم اس سارے پلان میں مجھے وجہ قتل نظر نہیں آ رہی۔“

ہاشم کے تاثرات قدرے سخت ہو گئے۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اور ان میں ایک عجیب سا جذبہ ہلکورے لینے لگا۔ اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سے ابھی ابھی زرتاشہ واپس گئی تھی اور پھر دوبارہاں کی طرف رخ پھیرا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں زخمی پن سا تھا۔

”وجہ قتل سامنے ہے اور میں اس کو اس سب میں فٹ کر لوں گا۔ بھروسہ رکھو۔ ہاشم ہر چیز سمجھا سکتا ہے۔“ جواہرات بس اس کو دیکھ کر رہ گئی، اس نے سوچا کہ وہ ہاشم سے پوچھے کہ وہ وجہ قتل کیا بنا رہا ہے؟ لیکن پھر اس سے پوچھا نہیں گیا۔ دل پر پڑے بوجھ بڑھتے جا رہے تھے وہ بے دلی سے اٹھ کر وہاں سے آ گئی۔

باہر آئی تو اور رنگ زیب لاؤں گے میں بیٹھے تھے ان کے سامنے جواہرات نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ دیے ہی سجالی۔ اور بڑی تمکنت سے آ کر بڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھی، بازو صوفے کے ہتھے پر جمایا اور مسکرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

ان کے تھے تاثرات مزید تن گئے۔ قدرے بدافعالہ سی جارحیت سے وہ اس کو دیکھ کر بولے۔

”ہاشم سے کو، جلد از جلد یہ معاملہ ختم کرے۔ میں اس وقت اس طرح کا کوئی اسکینڈل انورڈ نہیں کر سکتا۔“ جواہرات نے مسکرا کر اثبات میں ختم دیا۔ کم از کم اس معاملے میں وہ دونوں متفق تھے۔

رستے دیار دل کے بھی کتنے عجیب تھے سب راہرو تھے، کوئی یہاں پر ہما نہ تھا انیسویں کے باہر شام گہری ہو رہی تھی۔ بالائی منزل کے ہاسٹریڈ روم میں بیڈ کے کنارے بیٹھی زرتاشہ کے چہرے پہ سوچوں کا جال تھا۔ وہ ہتھیلی پہ تھوڑی گرائے انگلی پہ سائے کی لٹ پڑتی، زور کسی غیر مرئی نقول کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ روم سے پالی کرنے کی آواز آرہی تھی۔ کبھی کبھار وہ گردن موڑ کر اس طرف دیکھتی، اور پھر دوبارہ سے خلا میں دیکھنے لگتی۔ اس کا ذہن منقسم تھا۔ ہاشم سے کی گئی باتیں، زمر کا ذکر، فارس کی غیر موجودگی، سب کچھ اسے بہت الجھا رہا تھا۔ اگر خاور کا پارٹی میں موجود نہ ہونا اتنا اہم نہیں تھا تو پھر ہاشم نے بطور خاص اس بات کا ذکر کیوں کیا۔ پھر اس کو آنے دیکھ کر ان کے چہرے اتنے فٹ کیوں ہو گئے تھے؟ زرتاشہ کے پاس بہت سے سوال تھے، جواب ایک کا بھی نہیں تھا۔

دفعتا، فون کی گھنٹی بجی۔ وہ بے زاری سے اٹھی اور گھوم کر سائڈ ٹیبل تک آئی۔ فارس کا موبائل بج رہا تھا، اور لکھا آ رہا تھا ”میڈم زمر“۔ زرتاشہ کے لب بھینچ گئے، آنکھوں میں عجیب سی ناگواری ابھری، چند لمحوں فون کو دیکھتی رہی، پھر جھپٹ کر اٹھایا۔ زور سے مین پرپس کر کے کان سے لگایا۔

”جی فرمائیے؟“

”میں ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر یوسف بات کر رہی ہوں۔“ زمر کہتے ہوئے ذرا جھجکی۔ ”مجھے فارس سے بات کرنی ہے۔“

”میں فارس کی بیوی بول رہی ہوں، آپ کو فارس سے کیا بات کرنی ہے؟“ زرتاشہ کا لہجہ خشک اور سرد

آپ جائیں جدھر  
ٹھہر جائے نظر...



Golden Pearl Cosmetics-Pakistan | www.goldenpearl.com.pk | E-mail: info@goldenpearl.com.pk



تھا۔ زمر نے بھر کے لیے چپ ہو گئی۔

”کیسی ہیں آپ زرتاشہ؟“

”فی الحال تک تو ٹھیک ہوں۔ لیکن جس طرح آپ میرے شوہر کے ساتھ بی بیو کر رہی ہیں مجھے نہیں لگتا کہ اگلی دفعہ ہم اتنی ہی خوشگوار سی بات کر سکیں گے۔“ لائن پر چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی پھر زمر کی آواز ابھری تو اس میں گہرا تجنب تھا۔

”سوری۔ میں آپ کی بات سمجھتی نہیں۔“

”حالا تک آپ کو سمجھنا چاہیے تھا کہ میرا شوہر بے گناہ ہے۔ پھر بھی جس طرح آپ اس کیس کو پرسیو کر رہی ہیں جس طرح آپ میرے شوہر کو بار بار مجرم ثابت کرنے پر تلی ہیں اس سب سے مجھے یہی لگتا ہے کہ آپ اس سے کوئی پرانا بدلہ اتار رہی ہیں۔ آخر میرے شوہر نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟“ وہ بمشکل غصہ ضبط کر کے کہے جارہی تھی۔ اتنے دنوں کا اندر ابلتا دوا کسی نہ کسی طرح پھٹنا ہی تھا۔ دوسری جانب زمر اچھٹے اور حیرت سے فون کو دیکھ کر رہ گئی پھر اس کے تاثرات بھی سخت ہو گئے، ”آواز سپاٹ ہو گئی۔“

”میں بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہی آپ کس طرف اشارہ کر رہی ہیں میں صرف اور صرف فارسی اور سعدی کی مدد کرنا چاہ رہی تھی بہر حال جب فارسی مجھ سے بات کرنے کے لیے فارغ ہو جائیں تو انہیں بتا دیجیے گا کہ انہوں نے کل مجھے اپنی اہلی بانی سے ملوانا ہے۔ اور ہاں ان سے کہہ دیجیے گا کہ اگلی کل وہ ہی مجھے کریں گے، کیونکہ میرے پاس فی الحال کرنے کو اور بہت سے کام بڑے ہیں۔“ کھٹ سے فون بند ہو گیا۔

زرتاشہ طیش سے فون کو دیکھ کر رہ گئی پھر زور سے واپس پھینک۔ ہاتھ روم کا دروازہ کھلا تو وہ چونک کر مڑی، فارسی باہر نکل رہا تھا تو لیے سے گیلے بال رگڑتا اس کی آنکھوں اور چہرے پر شدید اضطراب سا تھا۔ یقیناً اس نے یہ گفتگو نہیں سنی تھی وہ قریب آیا تو زرتاشہ نے بمشکل چہرے کے تاثرات مارل کیے، ہلکا سا مسکرائی۔

”میڈم پراسیکوٹر کا فون آیا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ

آپ انہیں کل ایک کرلیں۔“ فارسی نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھیں سکیر کر اس کے تاثرات پہ غور کیا۔

”اور کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ وہ محوم کریڈ کے دوسری طرف چلی گئی۔ ڈرائنگ روم کے سامنے بیٹھی اور برش اٹھا کر بالوں میں اوپر سے نیچے پھیرنے لگی۔ البتہ چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ فارسی جیسے آوی کو دھوکا دینا کم از کم زرتاشہ کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ سرخ پھیر کر بیٹھی آئینے میں اس کو دیکھتی رہی۔ فارسی اب فون پر نمبر مارا اسے کلن سے لگا رہا تھا۔ پھر پلٹ کر وہ کمرے سے ماحقہ بالکونی میں جا کھڑا ہوا۔ زرتاشہ کی سماعتیں وہیں لگی تھیں۔ بالوں میں ہیر برش پھیرتا ہاتھ رک گیا۔

”جی السلام علیکم! میڈم کیسی ہیں آپ؟ آپ کا فون آیا تھا۔“ اسے فارسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ہیر برش رکھ کے وہ قدموں اٹھی اور جو کھٹ میں جا کھڑی ہوئی، فارسی کی اس کی طرف پشت تھی۔ سامنے لائن نظر آتا تھا اور اس کے پیار ہاتھ کے کمرے کی بالکونی، ہاتھ کا کمرہ ہمیشہ ہی اونچائی پر ہوتا تھا اور ان کا کمرہ تشیب میں یہ فرق زرتاشہ کو گرج پہلے سے زیادہ محسوس ہوا تھا۔

”جی شیور میم! میں کل آپ کو اس سے ملوا دوں گا۔“ ٹائم اور جگہ میں آپ کو ٹیکسٹ کرتا ہوں۔“

”اوکے۔“ فارسی شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر دوسری جانب سے غالباً خشک لہجے میں کی گئی بات کاٹ دی گئی تھی تب ہی وہ خاموش ہو گیا اور پھر فون بند کر دیا جب وہ پلٹا تو زرتاشہ کو وہیں کھڑا پایا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟“ اس نے بظاہر انجان سی بن کر پوچھا، دل البتہ زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ فارسی فون بند کرتا آگے آیا، ذرا سے کندھے اچکائے خود بھی کچھ الجھا ہوا تھا۔

”کل مجھے انہیں اپنی اہلی بانی سے ملوانا ہے۔ اس کا بتا رہا تھا۔“ پھر خاموش ہو گیا جیسے اسے بھی زمر کے

خشک جواب پہ پہلے سے زیادہ حیرت ہوئی تھی یا پھر شاید اسے برا لگا تھا۔ کیا واقعی زمر اس کو مجرم سمجھ رہی تھی؟

”کیا آپ کو یہ لگتا ہے کہ ڈی اے آپ کو مجرم سمجھتی ہے؟“ زرتاشہ ذرا کی ذرا احتیاط سے اس کا چہرہ دیکھتی قریب آئی وہ جو بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا تھا چونک کر سر اٹھا کر اسے دیکھا، چہرے کے تاثرات ذرا نرم پڑے۔ آخر وہ اس کی بیوی تھی اس کی سوچ بڑھ سکتی تھی اس نے مبہم سا اثبات میں سر ہلایا، ”شاید۔“

زرتاشہ کو ذرا تقویت ملی۔ گردن اٹھا کر پہلے سے زیادہ اعتماد سے وہ قریب آئی، اس کے کندھے پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

”زمر جو بھی کہے میں جانتی ہوں آپ نے کچھ نہیں کیا اور میں جانتی ہوں کہ آپ مجرم نہیں ہیں۔ یقیناً کوئی اس میں آپ کو پھنسا رہا ہے۔“ فارسی کے تاثرات کی نرمی بڑھتی گئی اس نے ہلکا سا مسکرا کر سر کو خم دیا ایسی مسکراہٹ جس میں سوگواریت بھی تھی اور نرمی بن بھی۔

”تفتیشک یو زرتاشہ! تمہاری سپورٹ میرے لیے بہت معنی رکھتی ہے۔“ وہ بھی جواباً مسکرا دی، البتہ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب تھی اس کو کیا چیز تنگ کر رہی تھی؟ ہاتھ کا ایک بے معنی بے سبب سا جملہ؟ کیا اس کی زرتاشہ کو تنگ کر رہا تھا؟

اس نے سر جھٹکنا چاہا مگر سوچوں کو جھٹکنا اتنا آسان نہ تھا۔

ڈرائنگ روم کی دروازے میں میز پر انجیل کے ہاتھ بھجوائی گئی ویڈیو سی ڈی رکھی تھی چونکہ شہرین نے بھجوائی تھی اس لیے خاد کو پتا نہیں چل سکا اور نہ ہی ہاتھ کو۔ اس نے سوچا کہ وہ کل اسے دیکھے گی یہاں کل!

\*\*\*

لوگوں سے اب معاملہ کیا ہو  
دل پہ اب کچھ گزر رہا بھی نہیں

جس وقت زمر نے فارسی کا فون بند کیا وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی اس کے چہرے پہ عجیب سی بے زاری اور قدرے ناگواری تھی۔ موبائل پر اس میں رکھتے ہوئے وہ منہ میں کچھ بڑبڑاتی جیسے وہ اس سارے کھڑاگ سے تنگ آ رہی تھی مگر سعدی۔۔۔ صرف سعدی کے لیے اسے یہ سب کچھ عرصہ مزید برداشت کرنا تھا۔ پتا نہیں شادی کے بعد کیا ہو گا؟ آف۔۔۔

مین ڈور کھول کر وہ راہداری میں آئی پھر ڈرائنگ روم کے قریب سے گزرتی وہ ٹھہری، چال دار پردے کے پار مہمانوں کی باتیں اور چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ ذرا اوٹ میں ہو کر اس نے دیکھا، یہاں سے صرف سامنے صوفے پر بیٹھا حماد کھائی دے رہا تھا۔ خوش شکل سالن جوان، جس کی آنکھوں پہ گلاسز تھے مگر اس وقت وہ قدرے غیر مطمئن سی صورت حال میں بیٹھا ہوا تھا۔ باقی اس کی والدہ کا چہرہ تو یہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر ان کی آواز وہ بہر حال سن سکتی تھی۔ وہ بڑے ابا سے کہہ رہی تھیں۔

”ہمیں بخوبی احساس ہے کہ آپ کے خاندان کی بہت قریبی وفات ہوئی ہے، لیکن آپ بھی خیال کیجیے کہ ہمارے کارڈز بٹ جکے ہیں، ہمارے سارے مہمان آجکے ہیں، کتنے ہی لوگوں نے باہر سے آنا تھا وہ چھٹی لے گئے ہیں، وہ اس سے زیادہ گھبر بھی نہیں سکتے ایسے میں ہم بھی مجبور ہیں۔“

”میں بالکل سمجھ سکتا ہوں آپ کی ساری بات میں آپ کو شادی آگے کرنے کا بھی نہیں کہہ رہا شادی اسی دن ہوگی جو کارڈز پر لکھا ہے، میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ ہم اس شادی کو قدرے سادگی سے بھی کر سکتے ہیں۔ بجائے بے حد دھوم دھام کے۔“

”ہمارا ایک ہی ایک بیٹا ہے کیا ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اپنے تمام ارمان اس پہ پورے کر سکیں؟ آپ جانتے ہیں کہ وہ تین بہنوں کا انگوٹھا بھائی ہے اس میں سب کی خوشی شامل ہے۔“

”سب ٹھیک ہے آپ دیکھ پر اپنے تمام ارمان



پورے کر لیجئے گا۔ لیکن صرف اپنی طرف کے فکشنز ہم سادگی سے سزا انجام دینا چاہتے ہیں یہ دیکھنا ہمارے خاندان کے لیے ایک بہت بڑا ہچکاہچی ہے۔ میں نہیں چاہتا ہمارے کسی بھی عمل سے میری بہو اور پوتے اب سیٹ ہوں۔" بڑے ابا بہت متانت اور بارعب لہجے میں ان کو اپنا دعا سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوئی لا حاصل سی بحث تھی جو مزہ کو مزید بے زار کر رہی تھی۔

دفعہ ۱۱۰ بے حد تکلف میں بیٹھے حمار کی نظر اس پر پڑی تو وہ بدقت مسکرایا۔ زمر بھی اتنی ہی وقت سے مسکرائی، سر کو خم دیا اور پلیٹ کر اندر چلی گئی۔ حمار سے بس اس کا اتنا ہی تعلق تھا۔ بظاہر وہ ری پسندیدگی کی بات تو اپنے جیسی بہت سی لڑکیوں کی طرح منگنی 'نکاح' شادی جیسے لائنس کے بعد اس کو پسندیدگی کا اختیار قبول ہی چکا تھا۔ اچھا تھا وہ اس کو پسند بھی تھا اور شادی کے حوالے سے اس میں بھی بہت تھیں۔ لیکن وارث غازی کی۔ یہ ایک واقعہ ہر چیز بدل رہا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے موبائل کھولا، فارسی کی ابھی ابھی اینڈ کی ہوئی کال کاریکار ڈیکھا۔ زمر تاشہ کی باتیں زہن میں دوبارہ سے گونجیں، چہرے پر آئی ہوئی کئی مزید برصہ گئی۔ بے دلی سے اس نے فون پر رے رکھ دیا۔ یہ بھی وہ دوبارہ سے بجا۔ زمر نے کال اٹھالی، یہ آفس سے تھی۔

"اچھا... ہوں... ٹھیک ہے میں سمجھ گئی، مجھے معلوم ہے کہ وارث غازی کا پاس اس طرح اپنی کلاس میٹاؤڈ فائلز نہیں دے گا۔ کل چٹھی کی تیار کرو۔ ہم کورٹ سے آرڈر لیں گے ان کی فائلز کو کھلوانے کے لیے، آخر ہم نے ان کو بھی تو شامل تفتیش رکھنا ہے، اگر فارسی غازی ٹھیک کہہ رہا ہے کہ اس مؤثر کا تعلق اس کیس سے ہے جس کی تفتیش منقول کر رہا تھا تو ہمیں کورٹ سے آرڈر لازمی لینا ہے۔ سمجھ گئے؟ اوکے!" فون بند کر کے زمر نے پہلے سے زیادہ بے دلی سے اسے بیڈ پر پھینکا اور کپڑی دونوں انگلیوں سے مسلتی، سر اٹھوں میں گرا کر وہیں بیٹھی

رہی۔



اور بات کہ بازی اسی کے ہاتھ رہی مگر نہ فرق تو لے دے کے ایک چال کا تھا وہ صبح پہلے سے زیادہ تعفن زدہ تھی۔ جس شخص اور فضا میں چھائی عجیب سی سزاؤں۔ ایسے جیسے دور کہیں زمر زمین کوئی چیز چل رہی ہو، بھن رہی ہو۔ کوئی نابودہ ہے۔

آفس سے نکلتے ہوئے زمر نے کار کی طرف جاتے ہوئے موبائل دیکھا، فارسی نے صبح اسے ہونٹ کا نام ایس ایم ایس کر دیا تھا، ساتھ ہی کال کر کے تاکید بھی کر دی تھی یہ وہ جگہ تھی جہاں اسے فارسی کی ایلی بائی سے ملنا تھا۔ وقت قریب تھا، دوبارہ سے ہونٹ کا نام فون نشیں کرنے کے لیے اس نے میسج کھولا ہی تھا کہ موبائل بجا۔ فارسی کا نمبر آ رہا تھا، اس نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"میں فارسی نکلتے ہی والی۔"

"پچھتچ آف پلان۔" ہونٹ نہیں اس کے سامنے ریسٹورنٹ ہے وہاں آجائے زمر! میں تھیٹات ایس ایم ایس کر رہا ہوں۔" اور فون بند۔ زمر کے ابو تعجب میں بچنے وہ فارسی ہی تھا، مگر اس کا انداز کچھ عجیب سا تھا، مختلف سا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے کبھی اس طرح دو ٹوک بات نہیں کی تھی، مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ زمر کی بات سے بغیر فون کاٹ دیا ہو۔ اسے کچھ ناگوار گزرا۔ شاید کل پاس کے خشک اور مختصر انداز گفتگو کی وجہ سے اس نے اس طرح بات کی ہو۔ خیر، سر جھٹک کر اس نے کار اشارت کی اور مرمر میں اپنا چہرہ دیکھا۔ بھوری آنکھوں میں سنجیدگی تھی اور ناک کی لونگ چمک رہی تھی۔ ٹھنکھیا لے بال جوڑے میں بندھے تھے۔ وہ ہر مدد کی طرح آج بھی تازہ دم نظر آ رہی تھی۔

ہاشم اپنے آفس میں پاؤں چیر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کوٹ کرسی کی پشت پر پھیلا تھا۔ کف موڑ رکھے تھے بالکل ٹھکے ٹھکے، خون سے نچرے چہرے کے

ساتھ وہ میز پر کھلے لیپ ٹاپ کو دیکھ رہا تھا۔ خاور سے رابطہ مسلسل جڑا تھا۔ وہ فارسی اور زمر کی کال سن سکتا تھا۔ آنکھوں میں البتہ ناخوشی تھی، جب کال ختم ہوئی تو وہ آگے کو جھکا اور مائیک میں بولا۔

"یہ فارسی کا لہجہ بالکل نہیں تھا۔ وہ پہچان جائے گی۔"

"سزا یہ قریب ترین ہے اس سے زیادہ مشابہت ممکن نہیں، ہم آواز کلی کر سکتے ہیں، لہجہ نہیں۔ آپ جانتے ہیں ہر آواز کا ایک مختلف وائس پرنٹ ہوتا ہے۔ اسی لیے میں ان بریکارڈنگز کو دو ٹوک رکھ رہا ہوں، تاکہ وہ لہجے پر غور نہ کر سکے۔" وہ اپنے کام کا ہر تھا، مگر ہاشم بے حد چیز چڑا ہوا رہا تھا۔

"اگر کوئی گریڈ ہوئی تو میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے شوٹ کروں گا خاں!" وہ سخت بد مزہ اور مضطرب ہو کر بیٹھی، بھیجتا واپس پیچھا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا کرب تھا، غصہ تھا، گلٹ تھا۔ ہاشم کے پاس اس وقت ہر چیز تھی سوائے سکون کے۔

ہونٹ کے کمرے میں خاور کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پردہ ہٹا تھا۔ گن اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ اس نے باریک دستانے پہن رکھے تھے، جن کی انگلیوں کے پودوں کی جگہ۔ باریک پلاسٹک چپکا تھا۔ اس پلاسٹک پر فارسی کے فکر پر نہیں تھے، وہ جنہں جنہں ہاتھ لگاتا، وہیں فارسی کے نشان لگتے جاتے جو بعد میں پولیس تلاش کر لے گی۔ بہت احتیاط سے وہ گن کو اسٹینڈ سے لکھیں کر رہا تھا۔ اتنی احتیاط سے کہ اس پر موجود فارسی کے اصلی فکر پر نہیں خراب نہ ہوں۔ (یہ گن اس نے فارسی کے گھر کی ہسٹمنٹ سے اٹھالی تھی)۔ گن سیٹ کر کے اس نے ٹل میں سے دیکھا، نشانہ باندھ دیا۔ زمر نیچے بنے ریسٹورنٹ کی سیٹے کی دیوار سامنے تھی۔ وہاں پہ کار پر میں ایک ٹیبل دیکھا، ہر چیز پلان کے مطابق جاری تھی۔ وہ مڑا، لیپ ٹاپ پر چند کیوز دیا میں کل جانے لگی۔

زمر تاشہ انیکسی کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھی اداسی سے سامنے کھڑے بلند وبالا شکل کے عقب کو

دیکھ رہی تھی وہیں ہاشم کی بالکونی تھی اور نیچے شہرین اپنی دو سالہ بیٹی سونیا کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتی، کسی بات پر ہلکا سا ہنسی کھاس پہ چل رہی تھی۔ شہرین نے ٹائٹس پہ ڈھیلی سی ڈیزائنڈ شرٹ پہن رکھی تھی، جس کے ایک کندھے سے آستین نیچے تک لٹکتی تھی۔ گردن میں پتھروں کی لمبی سی ہالا تھی۔ سب براہِ ذوق تھا اور وہ جانتی تھی کہ سب کتنا قیمتی ہوگا۔ فارسی کی تین مہینے کی ننھاہ سے بھی کئی گنا زیادہ قیمتی۔ مگر نہیں، وہ چاہتا تو بہت کچھ انورڈ کر سکتا تھا، اگر وہ بلیک میں خریدی گئی سات آٹھ لاکھ کی گن خرید سکتا ہے تو اس کو پارلی کے لیے دو لاکھ کی ساڑھی بھی دلا سکتا تھا، مگر نہیں۔

زمر تاشہ یاسیت سے دیکھتی رہی، دفعہ ۱۱۰ دور کھڑی شہرین نے اسے دیکھا۔ سورج کی روشنی کے باعث ہاتھ پہ ہاتھ کا چھبنا کر آنکھیں سیکڑ کر دیکھا، پھر ہاتھ ہلایا، مسکرا کر نقارے، تسخر سے۔ زمر تاشہ پھیکا سا مسکرائی، گور ہاتھ ہلایا۔ شہرین آگے بڑھ گئی، سواہ لو نجائی پہ تھی، یہاں سے ڈھلان آجاتی، زمر تاشہ اوپر دیکھتی رہی، وہ اوپر دیکھنے کی عادی تھی۔

پھر وہ بے دلی سے اٹھی، سامنے رکھا لیپ ٹاپ اور ویڈیو سی ڈی اٹھا کر اندر لے آئی۔ ساری ویڈیو وہ دیکھ چکی تھی۔ خاور جو عموماً "ہاشم کے آگے پیچھے" کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا تھا، ادھر درمیان میں ایک لمبے دورانیے کو غائب تھا۔ مگر غائب تو فارسی بھی تھا۔ اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ خاور کو زیادہ دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ جس منظر میں زمر ہوتی، کم از کم اس میں وہ کسی اور کو نہ دیکھتی۔

تب ہی موبائل بجا۔ اس نے دیکھا۔ غیر مشناس نمبر تھا۔ برے دل سے اٹھایا۔

"جی؟"

"میں ایک ریسٹورنٹ کا ایڈریس ایس ایم ایس کر رہا ہوں، جہاں پر اس وقت آپ کے شوہر ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر زمر صاحبہ کے ساتھ سچ کر رہے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو خود آکر دیکھ لیں۔"





غیر شناسا آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔ وہ نہیں جانتی کہ فون کون سی ہاتھ لگا رہا ہے۔ پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ آیا اور پھر سمجھ آئے پر وہ تیزی سے اٹھی۔ چہرے پہ شدید قسم کا عیش غصہ اور الجھن سی بکھر گئی۔ فارس نے اس سے ملنا ہی تھا۔ یہ تو وہ جانتی تھی، لیکن کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر یہ وہ الفاظ اس کو بری طرح کھپ گئے تھے۔ اور وہ ذرا تاشہ تھی، اسے حقیقت جانتی تھی۔ اس کو اپنے دل میں موجود شک کے کیزے کو نکالنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا اور فارس کو کال ملائی۔ ایک کھنٹی بچی پھر دوسری اس نے فون اٹھالیا۔

”ہاں زرتاشہ بولو؟“  
”آپ کدھر ہیں؟“ قدرے ہچکچاہٹ سے اس نے پوچھا۔ ساتھ میں اسے خود پر افسوس ہونے لگا وہ کیسے کسی اجنبی کی کال پہ اعتبار کر سکتی تھی؟  
”میں کام سے آیا ہوں باہر کوئی کام ہے؟“  
”نہیں، بس میں آپ کا پتا کرنا چاہ رہی تھی۔ آج آپ نے پراسیکیوٹر سے ملوانا تھا اس لڑکی کو وہ سب ہو گیا خیر؟“  
”ہاں مگر میڈم ابھی تک نہیں آئیں۔ میں اور خنیں علیشا کے کمرے میں ان کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”ہوٹل میں یعنی کہ۔۔۔؟“ اس کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فارس نے ”ہائے“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ ایک دم کلب کر رہ گئی پھر موبائل رکھ کر ایک نئے ارادے سے اٹھی۔

ہوٹل کے کمرے میں خاور تیار بیٹھا تھا۔ اس کی نظرس گھڑی کی سوئیوں پہ تھی، اپنے ٹارگٹ کے انتظار میں وہ کچھ گن رہا تھا۔ لیپ ٹاپ پہ ہاشم سے رابطہ ملی الحال خاموش تھا۔ یہ نہیں تھا کہ ہاشم دوسری جانب موجود نہیں تھا ہاشم بس چپ تھا بالکل چپ۔ وہ دونوں منتظر تھے کسی کی زندگی کی تحریر لکھنے کے لیے۔

خاور کے ہوٹل کے کمرے سے ملحقہ کمرے میں علیشا قدرے مضطرب سی کرسی پہ بیٹھی تھی۔ وہ

دقت دقت سے سامنے خاموش بیٹھی خنیں اور مقابل مضطرب تھے جیسے فارس کو دیکھتی۔ بس ان کے اپنے چہرے پہ بھی فکر چھایا تھا۔

”میں عدالت نہیں جاؤں گی، میں خود کو کسی ڈھکسے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“ اس نے انگلیاں مروڑتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ فارس نے رکت رکت کر جیسے بہت غصہ سے اسے دیکھا۔  
”کم از کم ابھی کے لیے تمہیں پراسیکیوٹر کے سامنے میری اپنی بانی مضبوط کرنی ہے کیونکہ یہ جج ہے“ میں قتل کے وقت اوہ رہی تھا۔“  
”لیکن میں عدالت نہیں جاؤں گی۔“

”وہ بعد کی بات ہے۔“  
مگر علیشا بے چین ہو رہی تھی۔

”خنیں بھی تو تھی اس رات ہمارے ساتھ۔ کیا صرف خنیں کو اسی نہیں دے سکتی؟“ اسے کوئی چیز بہت زیادہ پریشان کر رہی تھی۔

”میں سولہ سال کی لڑکی ہوں، ان کی رشتہ دار ہوں میں کریڈیبل (قابل اعتماد) گواہ نہیں ہوں۔“ خنیں نے پہلی دفعہ گفتگو میں مداخلت کی ”اور وہ بھی کافی اعتماد سے۔“ فارس اور علیشا دونوں نے اسے دیکھا۔ خنیں نے شانے اچکائے۔

”ایلی مک تیل، دی گڈوائف، بوشن لیگل وغیرہ دیکھ کر اتنا تو پتا چل ہی جاتا ہے۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کہوں گی کیا؟ مجھے سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا ہے، کیس میں تو کسی مسئلے میں نہیں بڑوں گی؟“ علیشا اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ ”کیونکہ اگر میں کسی مسئلے میں پڑی تو میں آپ کو ابھی سے بتا رہی ہوں میں اس سب سے نکل جاؤں گی۔“

”کم از کم آج کے لیے تم اس سب سے کہیں نہیں نکل رہیں۔“ فارس نے کافی سختی سے اس کا چہرہ دیکھ کر کہا۔ جہاں ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔ پھر گہری سانس لی، سامنے صوفے پہ آکر بیٹھا اور سمجھانے والے مکرر دھوکہ انداز میں بولا۔

”یہ ٹیٹ جیو والی کہانی پراسیکیوٹر کو مست سنانا تمہیں بس ایک ٹورسٹ کے طور پر یہاں آئی ہو اپنی دوست سے ملنے، بات ختم۔ سمجھ آئی؟“  
علیشا کے چہرے پر ندامت سی پھیل گئی مگر اس نے سر ہلادیا۔ ”لوگ۔“

فارس بے چینی سے اٹھ کر آگے پیچھے ٹپٹپٹے لگا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ خنیں نے اس کی کیفیت دیکھ کر کہا۔  
”آپ پھوپھو کو کال کر لیں۔“ فارس نے سر ہلا کر فون نکالا قفل ملا کر کان سے لگایا۔ کھنٹی جانے لگی۔  
ملحقہ کمرے میں موجود خاور کے لیپ ٹاپ پہ سگنل آنے لگا۔ فارس کے نمبر سے کال جا رہی تھی۔ اس نے چند کیز دبائیں کال کا رستہ کاٹا اور فارس کو فون بند ہونے کا پیغام ملنے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔

”یقیناً وہ آ رہی ہوں گی۔“ خنیں نے خاموشی سے سر کو خم دیا وہ اس کارروائی میں فارس کا ساتھ ضرور دے رہی تھی، البتہ وہ خوش نہیں تھی۔ اسے زمر کا فارس کے اوپر شک کرنا، علیشا کا اس سارے معاملے میں کھینچے جانا سعدی کی بے چینی، ہر چیز ناخوش کر رہی تھی۔ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر زمر صرف اس کی بات کا اعتبار کر لیتی، مگر اس نے صاف بے رخی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کیس میں کسی کی رشتہ دار نہیں ہے۔ خنیں نے یہ سب یاد کر کے ناگواری سے سر جھٹکا۔ آنکھیں ابھی تک سرخ، متورم تھیں، پہلے وارث ماموں کا غم، اور اس کے بعد شروع ہونے والا یہ عجیب سا پولیس پکچری، کانوں کا چکر۔

مرحلے اور بھی تھے جاں سے گزرنے کے لیے کرپا کس نے پس کرب و بلا بھیجی ہے زمر نے کار ریسٹورنٹ کے باہر روکی، موبائل اور پرس اٹھا کر باہر نکلی۔ اوہرا دھردیکھا۔ دروازے کے قریب میز پر ریڑ روڑ لکھا یہاں سے بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ کا گلاس ڈور کھول کر اندر آئی۔ دھڑ سے

اس میز کے متعلق پوچھا یہ معلوم ہونے پر کہ اسی کے نام ریڑ روڑ ہے۔ وہ وہاں بیٹھ گئی۔ پھر گھڑی دیکھی وہاں ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے کافی آرڈر کی۔ اور پھر انگلیاں آپس میں مسلتے ہوئے انتظار کرنے لگی۔

کیا وہ واقعی ٹھیک کر رہی تھی؟ کیا واقعی اسے فارس کے اپنی بانی سے ملنے یہاں تک آنا چاہیے تھا؟ اصولاً تو فارس کو چاہیے تھا کہ وہ اس لڑکی کو اس سے ملوانے لے کر آتا۔ لیکن کوئی بات نہیں، وہ اپنی جنت تمام کر لے۔ وہ سعدی کو دکھا دے کہ وہ واقعی اس کے ماموں کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ لیکن کیا یہ سب دکھانے کا کوئی فائدہ ہو گا؟ کیا واقعی اس کے اوپر سے خود غرضی کا لیبل اترے گا؟

ان تمام سوچوں سے سر جھٹک کر زمر نے اپنی توجہ دھڑکی طرف مبذول کی، جواب کافی لا کر سامنے رکھ رہا تھا۔ جب تک اس نے کپ اٹھایا، سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ زمر نے چونک کر اوہرا دیکھا۔ وہ ذرا تاشہ تھی سیاہ لباس پہ سر مٹی دھندلے گردن میں لیپٹے وہ خاموش نظروں سے دیکھتی قریب آئی، کرسی کھینچی، سامنے بیٹھی، کینیاں میز پر رکھیں، ہیشیل پہ تھوڑی نکائی کافی کینہ تو نظروں سے زمر کو دیکھنے لگی۔ زمر قدرے غیر مطمئن انداز میں کرسی کے کنارے پہ آگے ہول، سر کے خم سے سلام کیا اور پوچھا۔

”فارس کہاں ہے؟“  
زرتاشہ نے ہلکے سے شانے اچکائے اور زمر کو بدستور بنا لیک جھکے دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کیا آپ نے ابھی ان کے ساتھ بیٹھ نہیں کیا؟“  
”بیٹھ؟ میں تو کافی دیر سے ان کا انتظار کر رہی ہوں، انہوں نے مجھے یہاں بلایا تھا، مجھے کسی سے ملوانا تھا۔“  
”لیکن مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا، آخر کس سے ملوانا تھا ان کو؟“

”اپنی اپنی بانی سے، قتل کے وقت وہ جس کے ساتھ تھے۔“ زمر کو اب کچھ بہت برا لگ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے



محسوسات سمجھ پارہی تھی نہ زرتاشہ کا رویہ جو عجیب نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”آپ کے لیے کچھ آرڈر کروں؟“ زمر نے کہتے ہوئے دیگر کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو زرتاشہ نے اس پر سے نگاہ ہٹائے بغیر محض جوس کا آرڈر دیا۔ سہرا کر چلا گیا۔ زمر نے دوبارہ گھڑی دیکھی اور پھر موبائل کو۔ آخر فارس کہاں رہ گیا؟ اور آخر اس نے اپنی بیوی کو یہاں پہ کیوں بلا لیا؟ اس کے دل میں تو کوئی گھٹ نہیں تھا، وہ تو اس کا رانا اسٹوڈنٹ تھا اور کچھ بھی نہیں۔ اور ہاں وہ سعدی کا ماموں بھی تھا۔ مگر پھر بھی زرتاشہ کا انداز کچھ عجیب سا تھا جیسے وہ کوئی ”دوسری“ عورت ہو۔

دوسری جانب زرتاشہ مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی لاوا سا پک رہا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ فون زمر نے ہی اسے کروا لیا تھا۔ فارس پہ شک اور باقی سب وہ صرف فارس کی توجہ کے لیے اس کا گھر خراب کرنے کے لیے کر رہی تھی۔ اسے سامنے بیٹھی، گھٹکھریالے بالوں والی مٹائی کا کک گھونٹ گھونٹ پیتی لڑکی بہت بری لگی۔  
 ”آپ کی اور فارس کی منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی یہ سچ ہے نا؟“ زرتاشہ نے اچانک سے سوال کیا تھا۔ زمر کو حیرت اور شاک کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ کپ میز پہ آواز کے ساتھ رکھا۔  
 ”زرتاشہ؟“ اندر ایک ابل سا اٹھا حیرت اور پھر غصہ۔ بمشکل وہ ضبط کر پائی۔ ”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوا ہے ایسا کچھ نہیں تھا۔“

”آپ انکار کیوں کر رہی ہیں؟ فارس نے خود اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہ آپ سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔“ ابو اچکا کر رہ بولی۔ اس کے انداز میں جھلبلی تھی ”محسوس کی جھلبلی۔“  
 زمر بالکل سن رہ گئی۔ اندر کوئی جوار ہٹا سا کہنے لگا، اس نے سنا تھا کہ کچھ مرد بیویوں پہ دھاک بٹھانے کو کہتے ہیں کہ خاندان کی نلال اور نلال لڑکی مجھ پہ مرنے

تھی یہ اور وہ۔ مگر فارس سے اس قسم کی بات کی توقع نہ تھی اس کا دل مزید برا ہوا۔  
 ”یہ انتہائی احمقانہ بات ہے۔ ابھی فارس آنے ہی والا ہو گا۔ آپ میرے سامنے یہ بات ان سے پوچھ لیجیے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میری شادی تیار ہے۔ ایسے وقت میں اس قسم کی بات آپ کو کرنا اور مجھے سننا زیب نہیں دیتا۔“  
 وہ شدید برہمی سے بولتی رخ موڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ وہ دو عورتیں غلط وقت اور غلط موقع پہ غلط موضوع چھیڑ بیٹھی تھیں۔ زرتاشہ نے ہلکے سے شانے اچکائے۔  
 ”جو آپ کہیں۔“

وقت گزرتا جا رہا تھا اور فارس کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ زمر نے کوئی دسویں دفعہ گھڑی دیکھی، پھر سرد لہجے میں زرتاشہ کو دیکھنے بلا بولی۔  
 ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ فارس وقت اور وعدے کا اتنا کچا ہے۔ اس وقت اس کو یہاں پر ہونا چاہیے تھا۔“  
 ”میں نہیں جانتی وہ کدھر ہیں۔“ زرتاشہ اب کے زبرد افغانہ انداز میں بولی۔ ”مجھے تو ان فیکٹ پتا بھی نہیں تھا کہ وہ ادھر آ رہے ہیں۔ میں تو یہاں شاپنگ کرنے آئی تھی۔ آپ کو کھانا ادھر آگئی۔“  
 وہ لہجے بھر کر کہی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ اگر فارس ادھر آ گیا اور اسے یہاں دیکھا تو پھر کس طرح وضاحت کر پائے گی؟ کیا پتا زمر نے یہ سب اس کو فارس کی نظروں سے گرنے کے لیے کیا ہو۔ کبھی کو ذرا دھیما کر کے اس نے بات جاری رکھی۔

”کل انہوں نے ذکر کیا تھا کہ انہیں آج آپ سے ملنا ہے اسی لیے میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں آنے والے ہوں گے۔“ زمر نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ وہ اسی طرح نظر انداز کیے وہ دوسری جانب دیکھتی رہی۔ اس کی فضول اور احمقانہ باتوں پہ ابھی تک اسے غصہ آ رہا تھا۔ اگر وہ کوئی مذاق تھا تو بہت برا مذاق تھا۔ اور تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ فارس کا نمبر آ رہا تھا۔

زمر نے کال اٹھائی اور خشک لہجے میں بولی۔  
 ”آپ کدھر ہیں فارس؟ میں آپ کا کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔“ چند لمبے خاموشی چھائی رہی پھر آواز ابھری۔  
 ”زمر آئی ایم سوری۔“

ہاشم نے لب لباب یہ ابھرتے الفاظ سنے اور تھکے تھکے انداز میں سر کر سی کی پشت پہ گرا بیٹھا۔  
 ”جی؟ آپ نہیں آ رہے۔“ زمر نے کہا مگر یوں لگتا تھا وہ نہیں سن رہا۔ وہ کہہ رہا تھا جو اسے کہنا تھا۔ کچھ عجیب تھا اس کے انداز میں ”رک رک کر بولنا“ بے تاثر سا انداز۔ مشینی آواز۔

”میں تمہارے قریب ہی ہوں زمر لیکن میں یہاں پر آ نہیں سکتا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ مجھے تمہیں اپنی اگلی بائی سے ملوانا تھا کیونکہ صرف تم ہی ہو جسے میرے قاتل ہونے پہ شک ہے، مگر میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے۔“ زمر دھک سے رہ گئی اس نے بے اختیار فون کو گھورا اور پھر دوبارہ کان سے لگایا۔

”فارس مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ (اسے کب شک تھا فارس پہ؟ وہ سوال جواب تو گفتیش کا حصہ تھے وہ کیا برامان گیا تھا؟)  
 ہاشم میز کا سہارا لیے کرسی سے اٹھا اور پھر اسی کرسی کے قدموں میں اکڑوں، بے دم سا بیٹھ گیا۔ میز کی اوٹ میں چھپ کر۔ سردنوں ہاتھوں میں گر لیا۔ مگر فارس زمر کی بات سننے کے لیے بھی نہیں رکا۔ وہ کہے جا رہا تھا۔

”اور چونکہ میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وارث غازی کا قاتل میں ہی ہوں اور میں اسے واقعی نہیں مارنا چاہتا تھا، لیکن مجھے ایسا کرنا پڑا کیونکہ وہ میری بیوی کے ساتھ مل کر مجھے دھوکا دے رہا تھا۔“ زمر کا دماغ بھک سے اڑ گیا، اس نے بے یقینی سے سامنے بیٹھی زرتاشہ کو دیکھا جس کا جوس آگیا تھا، اور وہ اسٹرا اس میں گھناتی کچھ مکس کر رہی تھی، مگن سی۔ فارس کی بات پر اس سے ذرا ذرا جلن کا شکار، مگر پھر بھی اس کے چہرے پہ ایک

محسوسیت تھی، ہچکناہ سا انداز۔  
 ”فارس آپ۔ آپ۔ آپ کہاں ہیں؟“ اسے لگا وہ مذاق کر رہا ہے۔  
 ہاشم اسی طرح، بند آنکھوں کو انگلیوں سے مسلاتا، سر گھٹنوں میں دبے بیٹھا رہا۔ کرب سا کرب تھا۔

”آئی ایم سوری زمر! میں یہاں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے۔ مجھے اپنی بیوی اور اسے بھائی دونوں کو ختم کرنا تھا، ایسا کیے بغیر مجھے کبھی بھی سکون نہیں آئے گا اور ہر چیز صحیح جا رہی تھی۔ میں سارا شک وارث کے متعلقہ کیس پہ ڈالنے میں کامیاب ہو رہا تھا مگر مجھے ایسا لگا کہ تمہیں مجھ پہ شک ہے، تو میں نے سوچا کہ میں شک کی تصدیق کر لوں۔ میں تمہیں بتا دوں کہ میرے پاس کوئی ایلی بائی نہیں ہے۔ تم اس کیس کی پراسیکیوٹر ہو، سوائے تمہارے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وارث غازی قاتل کیس میں سب سے زیادہ بھاگ دوڑ میں کر رہا ہوں تو میں بے گناہ ہوں، سوائے تمہارے کوئی بھی مجھ پہ شک نہیں کر رہا۔ اب ایسی صورت میں جبکہ تم وارث غازی کی متعلقہ فائلز لکھوانے کے لیے کورٹ سے آرڈر لینے جا رہی ہو، اگر کوئی تمہیں گولی مار دے تو سب کا شک اس متعلقہ کیس تک جائے گا، جس کی وارث گفتیش کر رہا تھا۔ فارس غازی پہ کبھی کوئی شک نہیں کرے گا اور رہی زرتاشہ تو تم اصل ٹارگٹ سمجھی جاؤ گی، اور وہ صرف کوئلہ ٹرل ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”فارس آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ فارس کیا آپ میری بات سن رہے ہیں؟“ زمر نے گھبرا کر بمشکل کہنا چاہا، اس کے ارد گرد جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔

ہاشم نے آنکھیں کھولیں۔ اسے میز کا اندر دنی خلا نظر آ رہا تھا۔ اندھیرا، گھٹن۔ اس نے پھر سے آنکھیں بند کر دیں، سر مزید اندر کر لیا۔ اوپر رکھے لب لباب سے آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔  
 ”زمر میں تمہیں کال کر کے صرف ایک بار معذرت کرنا چاہتا ہوں، میں بالکل بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا، مگر میں مجبور ہوں مجھے معاف کر دینا، لیکن تمہیں





KEK

سوپر پیک کے ساتھ...



Email: rossmoo@cyber.net.pk

لیے ہیں۔ "خاور نے Barrett M95 کی نال میں سے ایک آنکھ بند کیے جھانکا۔ نشانہ سیٹ کیا۔ "فارس پلینز ایسا مت کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گی میں تمہارا کیس لڑوں گی۔ پلینز میری بات سنو۔" اسے لگاؤ منت کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شاید آنسو آئے تھے۔ زرتاشہ بالکل حق رہی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے ڈی اے؟" اس نے پوچھا مگر زمر کو کچھ ہوش نہیں تھا، وہ اسی طرح کھڑی فون کلن سے لگائے فارس کی منت کر رہی تھی۔

"پلینز فارس! میرے ساتھ اس طرح مت کرو، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایک اچھے انسان ہو، تمہارے اندر اچھائی ہے۔ ہر شخص کے اندر ہوتی ہے، ہمیں صرف اس کو باہر لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں یاد ہے یہ میں نے تم سے کہا تھا۔ پلینز میں تمہاری پیپر رہی ہوں، میری شادی ہونے والی ہے۔" اس نے کبھی زندگی میں کسی کی اتنی منت نہیں کی تھی۔ ایسے کسی کے سامنے نہیں گڑ گڑائی تھی۔ مگر وہ اس کی سن ہی نہیں رہا تھا۔

"آئی ایم سو سو ری زمر! مگر مجھے ایسا کرنا ہے۔ یہ سب بتانے کے بعد میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔ آئی ایم سو سو ری۔" اور وہ اس کے ساتھ بہت کچھ کہہ رہا تھا مگر اب کے زمر اس کو نہیں سن رہی تھی، وہ اسی طرح بھینکتی آنکھوں کے ساتھ مسلسل اسے لے جا رہی تھی۔

"فارس! میں تمہاری پیپر رہی ہوں، میں سعدی کی پیپر ہوں۔ میری شادی ہونے والی ہے، پلینز میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔ اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح مت کرو۔" زرتاشہ ہکا بکا سی اٹھ کھڑی ہوئی، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زمر فارس سے یہ سب کیوں کہہ رہی ہے۔

"فارس! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے، پلینز میری بات سنو، تم یاد کرو میں تمہارا پیپر ہوں، میں نے تمہیں پڑھایا ہے۔ میں سعدی کی پیپر ہوں، تم میرے ساتھ

بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا، صرف ایک گولی دل میں۔ اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

زمر کرنٹ کھا کر کھڑی ہوئی، فون کلن سے لگائے اس نے بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ زرتاشہ بھی سر اٹھا کر اچھٹے سے اسے دیکھنے لگی تھی، ریسنورنٹ تقریباً "ویران تھا۔ اس کے پار اونچی بلڈنگز تھیں، ہوٹلز تھے، یہیں سامنے والے ہوٹل میں تو فارس نے اسے بلایا تھا، پھر اچانک سے چیخ آتے پلان۔۔۔ اچانک سے سب کچھ۔۔۔ وہ بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ اور فارس کے جا رہا تھا۔

"میں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں یہ میری تم سے آخری گفتگو ہے، اور اس آخری گفتگو میں میں تمہیں اپنی حقیقت بتانا چاہتا تھا۔ زرتاشہ اور تمہارے مرنے کے بعد میں جانتا ہوں مجھے سکون نہیں ملے گا۔ لیکن کم از کم میں اس قانونی کارروائی سے بچ جاؤں گا۔ آئی ایم سو ری زمر!"

"فارس تم کدھر ہو؟ پلینز مجھے بتاؤ؟ میں تمہاری مدد کروں گی جس طرح بھی ہوا میں تمہاری مدد کروں گی۔" زمر بے چینی سے جلدی جلدی کے جا رہی تھی۔ حالات کی نزاکت بھانپ کر اسے جو بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا۔ "میں تمہارا کیس لڑوں گی، تم نے جو بھی کیا اس سب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ میں کورٹ میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی، تم جو بھی سمجھو کہہ رہے ہو یہ سب انارٹی کلائٹ پریوج کے تحت محفوظ رہے گا، میں تمہاری انارٹی ہوں فارس! میری بات سنو!

مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔ وہ اسی طرح کی باتیں بکے جا رہا تھا، بالکل کسی رپوٹ کی طرح۔ جیسے اسے زمر کی کسی بات میں دلچسپی نہ ہو۔

"اپنی جگہ سے ہٹنا مت، میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تم بدحواس ہو رہی ہو، مگر بالکل بھی مت ہٹنا، ورنہ تمہیں تکلیف ہوگی۔ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا، دل میں۔ باقی میری بے وفا بیوی کے





ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔ تم میرے پاس آؤ اور میری بات تمہارا دل کھول دے گی۔ تم میری بات سن رہی ہو۔ تم اس بارے میں بات کر سکتے ہو۔ جو بھی بات تمہیں کہنی ہے ہم کریں گے۔ میں تمہارا کیس لڑوں گی میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی۔

فارس! تم صرف میری بات سنو۔ لیکن اب فارس کی طرف سے خاموشی چھا گئی تھی۔ کچھ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ سانس لینے کی آواز تک نہ تھی۔

خاور نے انگلی ٹریگر پر رکھے، کھن سے لگے ہینڈ فری میں کہا ”سر“ آریو شیور آپ اگلے الفاظ سننا چاہتے ہیں؟“

میزنگی لوٹ میں ”نمن“ پیٹھے ہاشم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ایک ایک لفظ۔“ اس کی سخت سے پیٹی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”کیا تم اس کو دیکھ سکتے ہو خاور؟“

”یس سر! ابھی میں سیکنڈ ہیں۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ میں ہیں ڈی اے گھبرا گئی ہے مگر وہ ایک بہادر عورت ہے وہ بھاگے گی نہیں۔ وہ آخری سانس تک فارس کو کنوش کرنے کی کوشش کرے گی۔“

”اس کے چہرے پہ اس وقت کیا ہے خاور؟“ وہ شدت سے کپٹی مسل رہا تھا۔ سر میں عجیب ورد لٹنے لگا تھا۔

”نہ خوف نہ پریشانی۔ صرف شاک اور بے یقینی!“

نیچے ریسٹورنٹ میں زمر کے سامنے کھڑی زر تاشہ کو اب نگر ہونے لگی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے؟ آپ فارس سے کیا کہہ رہی ہیں؟ وہ کدھر ہے؟“ مگر زمر کو اس وقت کچھ ہوش نہیں تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ فوراً ”زر تاشہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے بھاگ جائے مگر دل کو ابھی بھی یقین تھا کہ فارس ایسا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے آخری کوشش کر لی تھی۔

”فارس پلیز تم کچھ ایسا مت کرنا جس پہ تم پھنساؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں تمہارا کیس بھی لڑوں گی

اور میں تمہیں سپورٹ بھی کروں گی۔ پلیز فارس! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ فارس پلیز میری شادی ہونے والی ہے میرے ساتھ اس طرح مت کرو۔ اپنی بیوی کے ساتھ ایسے مت کرو۔ فارس۔ فارس؟“

خاور نے ٹریگر دبا دیا۔ ایک دو تین چار۔ تاک تاک کر۔

اور زمر نے محسوس کیا کہ فون اس کے ہاتھ سے گر گیا ہے وہ فرش پہ جا لگا مگر آواز نہیں آئی۔ زمر کو اس وقت کسی بھی چیز کی آواز نہیں آئی۔

بس یوں لگا کہ کچھ چیر کر نکلا ہے۔ ایک دو تین۔ کوئی برقعہ بھی نہیں۔ آگ لگی تھی کوئی عجیب سا احساس، درد بے پناہ درد۔ اس نے جھک کر میز کے کنارے کو دونوں ہاتھوں سے تھامنا چاہا۔ مگر تو آواز برقرار نہیں رکھ پا رہی تھی۔ زر تاشہ کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ زمر نے دیکھا وہ کھڑی تھی،

زمر کو اب وہ اونچائی پہ لگ رہی تھی کیونکہ وہ خود کرنی ہی جا رہی تھی۔ اس نے لوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اس نے زر تاشہ کو گرتے دیکھا۔ وہ آوندھے منہ زمین پہ جا گری، اسے ماربل کا فرش اپنے گل سے نکرا تا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈا فرش سخت سے سخت

دل جیسا ٹھنڈا۔ اس کے علاوہ زندگی میں ہر احساس ختم ہو چکا تھا۔ ہاں شاید کوئی اس کے آس پاس تھا کچھ سرخ سرخ سا تھا کوئی سرخ سی شے تھی جو اس کی کمر سے نکل کر اس کے ارد گرد بکھری تھی۔ سفید ماربل کے فرش پہ اس کے ہاتھوں پر اس کے چہرے کے قریب وہ بہتی جا رہی تھی۔ وہ پانی نہیں تھا وہ پانی سے گاڑھا تھا۔

ہاشم کے آفس میں اب خاموشی چھائی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں، مشکلی سے اٹھا، تھکا تھکا سا کرسی پہ بیٹھا ٹیپ ٹاپ بند کیا اور ست روی سے انٹرکام اٹھا کر بولا۔

”حلمہ! ایک کپ کافی لاؤ اور پھر جب تک میں باہر نہ نکلوں کسی کو اندر نہ آنے دنا۔ میں کچھ وقت تمہارا منتا چاہتا ہوں۔“ پھر آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کی پشت

پر لیٹ گیا۔

”نہ خوف نہ پریشانی۔ صرف شاک اور بے یقینی!“

”نہ خوف نہ پریشانی۔ صرف شاک اور بے یقینی!“

”نہ خوف نہ پریشانی۔ صرف شاک اور بے یقینی!“

سے نکال دیا۔ سوگ کی ایک نہ پھر زمر کو صحت کے نام پر زنا تاشہ نازی کے نام! ”تمہیں کسی جنت میں رہنے کا شوق تھا زر تاشہ! تمہاری یہ خواہش بھی فارس کی جگہ میں نے پوری کی!“

وقت کے کتنے ہی دھاروں سے گزرنا ہے ابھی زندگی ہے تو کئی رنگ سے مرنا ہے ابھی ہر شے اندھیر تھی، پلوں پہ بہت بوجھ تھا۔ بمشکل اس نے اس ہار کو آنکھوں سے ہٹانا چاہا۔ سفید روشنیوں والی چھت تھی، ارد گرد لوگ تھے اپنے اپنے اور سفید چادر تھی، کیا یہ زندگی کا انتقام تھا یا پھر ایک نئی زندگی کا آغاز تھا؟

بازوؤں میں سویاں تھیں، اور اس سے زیادہ جھپٹنا ہوا احساس دل میں تھا۔ زمر نے دو تین دفعہ پلکیں جھپکیں، کچھ دھندلے دھندلے سے وجود اپنے سرہانے کھڑے نظر آئے۔ ایک ٹھنکھریا لے بالوں والا لڑکا تھا، ایک عورت تھی فریبی مائل، وہ رو رہی تھی اس کو جاتے دیکھ کر رو رہی تھی وہ مسکرائی۔ زمر نے مسکراتا چاہا، کچھ کہنا چاہا۔ مگر لبوں سے بس یہی الفاظ نکلا۔ ”فارس کہاں ہے؟“

ٹھنکھریا لے بالوں والے لڑکے نے سر جھکا دیا، اس کی آنکھیں بھی شاید گلابی تھیں جیسے وہ رویا ہو، ابھی نہیں بہت پہلے رویا ہو۔ اب اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے وہ نرمی سے اس کے اوپر جھکا اس کے ماتھے سے بال ہلکے سے ہٹائے اور آہستہ سے بولا۔

”زمر! کیا آپ مجھے دیکھ سکتی ہیں؟“ اور وہ اس کو دیکھ رہی تھی ہنا پنگ جھپکے۔ اس نے ہلکی سی آواز میں صرف اتنا پوچھا۔ ”فارس کہاں ہے؟“ کسی نے جواب نہیں دیا۔ شاید آگے پیچھے کوئی اور لوگ بھی تھے ہاں اس کی بائیں طرف ایک لڑکی بھی کھڑی تھی، ماتھے پہ کٹے بال اور گلا سڑوا لے لیکن زمر اس کو نہیں دیکھ رہی تھی۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

تھی، ٹھنکھریا لے بالوں والے لڑکے کے ہوتے ہوئے وہ اس لڑکی کو کم ہی دیکھا کرتی تھی۔ وہ دوبارہ اس کے اوپر جھکا۔

”آپ ٹھیک ہو جائیں گی، بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا آپ کو کہیں تکلیف ہو رہی ہے؟ کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟“

اس نے ہلکا سا پوچھا، اتنا ہلکا کہ لڑکے کو سننے کے لیے کان اس کے چہرے کے قریب لے جانا پڑا۔

”فارس کہاں ہے؟“

پھر اندھیرا سا دوبارہ چھلنے لگا، ساری دنیا کا نور چلا گیا۔ سیاہی پہ سیاہی کے پردے تھے۔ اس کا دل غلابی پہ بستے پر کی طرح ہلکا اور کہیں دور اڑتا گیا۔

دوبارہ آنکھ کھولی تو چہرے بدل چکے تھے اب صرف لڑکا کھڑا تھا۔ بائیں طرف شاید کوئی اور بھی تھا، گلابی میں طرف والوں کو وہ کم دیکھا کرتی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ کھڑے لڑکے پہ نگاہیں مرکوز کیے لب ہلائے تو وہ پھر سے جھٹک اب اس کا لباس بدلا ہوا تھا شاید وہ کوئی اور دن تھا۔

”آپ کیسی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

اس کے لب ہلکے سے پھر پھڑپھڑائے ”فارس کہاں ہے؟“ لڑکے کے چہرے پہ کرب سا بکھرا، اس نے سر جھکا کر اٹھایا۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔

”ان کی وائف۔“ وہ رکا۔ زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی، اسے لگا اسے اس سوال کا جواب معلوم ہے۔



اندھیرے بڑھتے گئے عجیب سے اندھیرے تھے وہ نہ کچھ سننے دیتے نہ کچھ بولنے دیتے پلکیں بھی اٹھانے نہیں دیتے وہ دوبارہ اسی کھائی میں ڈنکی چلی گئی۔ پھر آنکھ کھلی تو منظر بدل ہوا تھا۔ اب کہ اس کا چہرہ بائیں طرف تھا۔ گھٹنگھریالے بالوں والا لڑکا نجانے کہاں تھا۔ بائیں جانب لڑکی کھڑی تھی، گھاسڑ والی خاموش، مگر روٹی روٹی آنکھوں والی۔ وہ اس کو پچھانتی تھی، جانتی تھی یا نہیں یہ اس کو ابھی نہیں معلوم تھا اس نے انہی دیران آنکھوں سے اس کو دیکھا اور لبوں پہ صرف ایک ہی سوال تھا۔ ”فارس کہاں ہے؟“

”وہ آئے تھے آپ کو دیکھنے صبح علیشا بھی آئی تھی، ہم اس دن آپ کا انتظار کرتے رہے ہمیں نہیں پتا تھا یہ سب ہو جائے گا۔“ وہ بولی تو اس کی آواز مدھم مدھم تھی اس میں ہمدردی تھی شاید کہیں سار بھی تھا۔ زمر بس اس کو دیکھ رہی تھی۔ لڑکی قریب تھی۔

”پچھو آپ۔“ وہ لڑکی اچھکپائی۔ ”آپ ٹھیک ہیں؟ میں ڈاکٹر کو بلا لاؤں؟“

”فارس کہاں ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔ اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے رہا تھا۔

”ابھی شاید وہ گھر پہنچے ہوں وہ بہت اب سیٹ ہیں بہت زیادہ ٹوٹ گئے ہیں۔“ اور زمر یک ٹک اسے دیکھتی رہی اسے سب یاد تھا اندھیری کھائیوں میں یادداشت کی روشنی ہریشے از سر نو زندہ کر لاتی تھی۔ اسے ایک ایک چیز یاد تھی، دل میں اٹھتا اور پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ اور پھر اس نے ہلکی سی نگاہ ہیکانی اسے اپنے اوپر سفید چادر بڑی دکھائی دے رہی تھی اس نے نگاہ پھر سے حین کے چہرے پہ کی۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ حنین خاموش رہی اس نے نظر اٹھا کر سامنے کسی کو دیکھا جیسے کوئی سکتل مانگا ہو۔ شاید جواب نفی میں تھا، سچھی وہ دوبارہ زمر کو دیکھنے لگی۔

”میرے گردے ضائع ہو گئے ہیں“ ہے نا؟“ شاید اس نے خود ہی کچھ سنا تھا شاید نہ بے ہوشی میں اس نے کچھ سنا تھا۔

”آپ کے گردے۔“ وہ لڑکی ”وہ متاثر ہوئے ہیں۔“

اس سے زیادہ مذہب الفاظ اس کو نہیں ملے تھے۔ زمر کے چہرے پہ حیرت نہیں آئی، لڑکھ بھی نہیں ابھرا۔ شاید وہ اپنی حالت بے ہوشی میں ایسا کچھ سن چکی تھی شاید وہ کئی دفعہ سن چکی تھی ”یقیناً“ وہ جانتی تھی وہ صرف تصدیق چاہ رہی تھی۔ اب کہ اس نے ہلکی سی گردن سیدھی کی، ہاں اتنا اسے یاد تھا کہ دوبارہ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے گردن سیدھی کی تھی اب نہ وہ دائیں تھی نہ بائیں اور میان میں بھی معلق۔

سیاہ تار کول جیسی چادر اب کے سر کی تو وہ پلکیں بہتر طور پہ جھپک رہی تھی۔ فربہ مائل خاتون اس کے سرانے اب کھڑی تھیں اس نے ہلکا سا ہاتھ اٹھا کر اچھا تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا بہت محبت سے اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ کیسی ہے؟ کیا کھانا پسند کرے گی؟ کیا اسے کہیں تکلیف ہے؟ کیا وہ ڈاکٹر کو بلا لیں؟ کیا وہ اسے پانی دیں؟ وہ بس ان کو دیکھنے لگی اور جب بونی تو سرگوشی میں۔

”فارس کہاں ہے؟“ ندرت کی آنکھوں میں اچنبھا سا ابھرا، زمر کا اس سے ایسا کوئی تعلق تھا تو نہیں جو وہ بار بار پوچھتی شاید زمر تاشہ کی وجہ سے۔

بہر حال زمر سستی مسکراتے ہوئے قریب آئیں۔ ”وہ گھر پہ شام کو آئے گا اور ہر گز نہیں دیکھنے۔ وہ بھی بہت پریشان ہے اس سب سے بلکہ پریشان تو ایک بہت چھوٹا لفظ ہے۔“ زمر یک ٹک ان کو دیکھتی رہی۔ ہر بات ہر لفظ اسے یاد تھا اور پھر ایک دم سے وہ چونکی۔ بدقت تمام اس نے گردن اوڑھ کر اٹھ کر کھائی۔ اس نے ان چند دنوں میں یہ پتا نہیں کتنے دن تھے وہ سب کے چہرے دیکھے تھے، گھٹنگھریالے بالوں والا لڑکا عینک والی لڑکی، وہ فربہ مائل خاتون۔ صرف ایک چہرہ نہیں دیکھا تھا بے حد خوف اور وحشت سے اس نے سر ندرت کی طرف پھیرا۔

”ابا کہاں ہے؟“ ندرت کی آنکھوں سے آنسو ابلنے کو بے تاب ہو گئے۔ اسے لگا کہ وہ کوئی اور خبر سننے جا رہی ہے، کوئی ایسی خبر جس کو سننے کے بعد اس کا دل

بھی کلام کرنا چھوڑ دے گا۔ اس نے کہنیوں کے بل اٹھنا چاہا مگر نہیں اٹھ سکی۔ جسم میں درد تھا شدید درد بے حد کرب سے اس نے دوبارہ پوچھا۔

”بتائیے ابا کہاں ہیں؟ جب تک آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گی، میرا دل انکار رہے گا۔“ مگر ندرت خاموش تھیں، آنسوؤں نے سر جھکا لیا پھر چہرہ موڑا شاید آنسو پونچھنے کی کوشش کی۔

”کیا ابا بھی مر گئے؟“ اس کے لبوں سے نکلا ندرت نے تڑپ کے سرخ اس کی طرف پھیرا ”آفسوؤں کو ابلنے دیا مگر نفی میں سر ہلایا۔“

”نہیں“ وہ رکیں ”وہ اب ٹھیک ہیں۔“ پھر چپ ہو گئیں۔

”اب۔۔۔ اب سے کیا مطلب؟“ انہیں کیا ہوا تھا؟ وہ ایک ایک کرپول رہی تھی۔ اٹھنا بھی چاہتی تھی مگر اٹھ نہیں سکتی تھی اس کے چہرے پہ تڑپ تھی۔ ایسا لگتا تھا بس وہ کسی طرح سب کچھ چھوڑ کر اس کمرے سے بھاگ جائے، اس اسپتال کے کمرے سے بھاگ جائے مگر وہ جیسے مخلوق سی ہو کر رہ گئی تھی۔

”کدھر ہیں ابا؟“ الفاظ بمشکل حلق سے نکل رہے تھے۔

”ان کو فالج کا انیک ہوا تھا، مگر اب وہ ٹھیک ہیں۔ وہ گھر پہ ہیں ہم انہیں اسپتال نہیں لاسکتے اب وہ ٹھیک ہیں زمر! تم پریشان مت ہو۔“ ندرت نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو تسلی دی۔ وہ یک ٹک ان کو دیکھے گئی بالکل خاموشی سے جیسے ساری دنیا ختم ہو گئی ہو۔ اوپر اٹھنے کی کوشش ختم کر دی اور سر نڈھال طریقے سے تکیے پہ گر آویا۔

”میرے ابا مفلوج ہو گئے؟ میرے حادثے کی وجہ سے؟“ میرے ابا مفلوج ہو گئے؟“ اس نے ندرت سے سوال نہیں کیا تھا۔ خالی خالی نگاہوں سے چھت کو دیکھتے خود کو بتایا۔

ندرت کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔ زمر کی گردن اب سیدھی تھی، ایک دفعہ پھر وہ نہ دائیں تھی نہ بائیں۔ چند گہری سانس لیں، آنکھیں بند کر کے

کھولیں۔ اب چیزیں بہتر نظر آرہی تھیں۔ ندرت نے آہستہ سے اس کے قریب سر کر کہا۔

”پولیس والے کب سے چکر لگاتے رہے ہیں باہر بھی موجود ہیں۔ انہیں تمہارا بیان لینا ہے۔“ زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تیار تھی۔

”ان کو اندر بھیجیں، ایک بیان ہے جو مجھے دینا ہے۔“ اس کی آواز اب بھی درد سے بھرپور اور ہلکی تھی، مگر اس کی نوعیت مختلف تھی۔ سخت، مستحکم، آگ سے بھرپور۔

\*\*\*

جو تخت و تاج کے مالک ہیں کیا وہ معتبر بھی ہیں شر انگیزی میں ڈبلی حکمرانی کا تماشا گر انفس کارپور بیوں سے جھگڑا تھا۔ علیشا فون کان سے لگائے سبک رفتاری سے چلتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔

”ہاں حنین! تم بالکل بھی فکر مت کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا خدا بہتر کرے گا۔ میں آج ہی آؤں گی تمہاری آٹی سے ملنے۔ اب وہ کیسی ہیں؟“

”کارپور کا موٹر مڑتے ہوئے اس نے فکر مندی سے پوچھا۔ پھر دوسری طرف ملنے والا جواب سن کر سر اثبات میں ہلاتے ہوئے لفٹ کی طرف آئی۔

”تم بالکل پریشان مت ہونا میں ضرور آؤں گی۔ خدا نے چاہا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ کیا ان کی کڈنیز مکمل طور پر ٹھیک ہو چکی ہیں؟“ لفٹ کا بٹن دباتے ہوئے اس کے چہرے پہ سوگواریت اتری۔

”آئی ایم سو سو ری حنین۔ چلو اس کے شام کو ملے ہیں۔“ موبائل بند کیا اور سامنے دیکھا۔ لفٹ کے دروازے کھل چکے تھے۔ وہ اندر آئی مطلوبہ فلور پہ انگلی رکھی اور گہری سانس لے کر گردن اکڑا کر خود کو جیسے کسی معرکے کے لیے تیار کیا۔ دروازے بند ہوئے لفٹ اور کی طرف بڑھنے لگی۔ ہر گزرتی منزل علیشا کا اعتماد گمراہی تھی اسے لگا اس کا چہرہ سفید پڑ رہا ہے۔ اس نے سر پھیر کر لفٹ کی دھالی دیوار میں اپنا

ہے۔

خواتین ڈائجسٹ 189 جنوری 2015

خواتین ڈائجسٹ 188 جنوری 2015



عکس دیکھا پھر سیاہ سلی ہالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سرمی آنکھوں کو سیکڑ کر تنقیدی نظروں سے دیکھا کہ کہیں گھبرائی ہوئی تو نہیں لگ رہی مگر نہیں۔ بظاہر وہ پر اعتماد لگ رہی تھی۔ سرخ شرٹ سفید پینٹس اور لمبی ہیل کی سینڈل میں ملبوس کہنی پر پرس لگائے وہ اندر سے جتنی ڈری سہی تھی اتنی لگ نہیں رہی تھی۔

مطلوبہ فلور ان پینچا تھا۔ دروازے کھلے۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ہوئی راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔ کتنے ہی آفسیڈ کر اس کیے کتنے لوگوں کے سامنے سے گزری بغیر نظر ملائے اسے معلوم تھا کہ اسے آفس میں جانا ہے۔ سب سے بڑا آفس سب سے آخر میں تھا، علیشا اس کے قریب بس لحاظے بغیر کوٹھری باہر موجود سیکرٹری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں آپ کی کیلید کر سکتی ہوں؟“ اس نے پکارا۔ علیشا ذرا سا مسکرائی۔

”اورنگ زیب کاردار نے مجھے بلایا ہے، میری ان سے اپائنٹمنٹ ہے۔“

اس کی بات پر سیکرٹری تدرے اچنبھے سے اپنے نوٹس کھنگالنے لگی۔ علیشا نے گردن پھیر کر بند دروازے کو دیکھا، یہاں سے وہ اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اندر آفس میں کنٹرول چیر اورنگ زیب کاردار اپنی مخصوص نمکنت کے ساتھ بیٹھے تھے ابرو کے ساتھ اس نوجوان کو سن رہے تھے جو سامنے کھڑا ایک پریزنٹیشن دکھا رہا تھا۔ وہ بی کیپ چنے لاپرواہے حلیے والا نوجوان ان کا بیج کنسلٹنٹ بھی تھا اور کیمپین مینر بھی۔ وہ کافی متانت اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری سے بولتا ایک ایک چیز سمجھا رہا تھا۔ جسے میز کے مقابل کرسی پر بیٹھا الپ ناپ یہ کام کرتا ہاشم بہت ہی بے زاری سے سن کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

”سر بظاہر یہ لگتا ہے کہ آپ کے بھانجے اپنے بھائی کے قتل کا آٹے والا الزام آپ کے خلاف جائے گا لیکن۔“ کیمپین مینر نے پین اٹھا کر ڈرامائی انداز

میں وقفہ دیا۔ ہاشم نے نگاہ پھیر کر مزید بے زاری سے اسے دیکھا۔ ہونہ کر کے سر جھٹکا۔ اور دوبارہ سے الپ ناپ یہ ناپ کرنے لگا۔ ایک تو اس کنسلٹنٹ سے اسے چڑھتی وہ لڑکا وہ باتیں جانے کے پیسے لیتا تھا جو وہ اپنے ناپ کو مفت میں بھی پتا سکتا تھا۔

”لیکن سر! ہم اس موقع کو اپنے مفاد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ اورنگ زیب کاردار کے خفا چہرے پر شکینیں ابھریں۔

”اور وہ کیسے؟“

”آپ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ ضمنی انتخابات کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں کچھ کی پلیسز اپنے مطلوبہ امیدواروں کے بجائے آپ کو اٹھتے دیکھ کر آپ کے خلاف استعمال ہونے والا کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے“ اس لیے بجائے اس بات پر مدافعت انداز اختیار کرنے کے ہم اس کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں جیسے۔“ جوش میں کھتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ کو اورنگ زیب صاحب کے پاس آیا اور ان کو کچھ دکھانے لگا۔ ”یہ وہ بیان ہے جو آپ پریس کے سامنے دیں گے۔ جس سے ایسا لگے گا کہ آپ کو کہ اپنے بھانجے کے اس عمل سے خفا ہیں لیکن اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کیے بغیر اس معاملے کو قانون پر چھوڑ رہے ہیں۔ آپ علی الاعلان یہ کہیں گے کہ بے شک ملزم میرا سگا بھانجا ہی کیوں نہ ہو اگر وہ واقعی مجرم ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ اور آپ اپنا کوئی بھی ناجائز اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں آپ کو ایک انصاف پسند شخص کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔“

اورنگ زیب نے بگڑ کر اس کو دیکھا۔ ”یعنی کہ میں فارس کو اس معاملے سے نکالنے کی کوئی کوشش نہ کروں؟“ کیمپین مینر آخر شفیع مسکرایا اور چنگی بجاہی۔

”یہی تو ساری ٹیم ہے سر! آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس اسکینڈل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آپ کے مخالفین کسی بھی صورت آپ کو اس

اسکینڈل کو کور کرنے نہیں دیں گے تو پھر کیا ہی اچھا ہو ہم بھی اسے کور کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ہم انہی کا دوا انہیں پہ کھیل جائیں۔ دیکھیں۔“ وہ اب اپنی اس اسٹوڈیو کی مزید مین میخ سمجھانے لگا۔ اورنگ زیب بظاہر پرے موڑ کے ساتھ لیکن توجہ سے سن رہے تھے۔ ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دوبارہ بے حد بے زاری اور کٹنگی سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کی بورڈ پہ ناپ کرنے لگا۔ اس کو جس خیر کا انتظار تھا زمر کے بیان کا وہ آگے نہیں دے رہی تھی پانچ دن ہو چکے تھے زمر کو کوئی لگے فارس آزاد گھوم رہا تھا بیوی کی موت کا سوگ منا رہا تھا اور فی الحال کوئی بھی نہیں تھا جو یہ کہہ سکے کہ یہ قتل فارس نے کیا ہے۔ گو کہ ہوٹل کے کمرے سے بخبری کے بعد گن برآمد کرنی گئی تھی مگر فارزک رپورٹ کو اس نے ابھی روک رکھا تھا۔

فارزک اور فکر پرنٹ رپورٹ زمر کے بیان کے بعد آئی چاہیے۔ یہ پلان تھا مگر زمر۔ اگر زمر مر گئی۔۔۔

الف۔ اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک لاش کا مزید بوجھ اپنے کندھوں پر نہ۔ نہیں!

وہ سر جھٹک کر اپنی ہی میل کھولنے لگا۔ خار نے وہ روز پلے اس کو فارس کی ایل بی بی لڑکی کی تفصیلات بھیج دی تھیں۔ اس کے دل سے درست تھے۔ وہ علیشا ہی تھی۔ مگر اس نے ہاشم سے رابطے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسی سے ملنے اور ہر آئی تھی ہاشم کو معلوم تھا اسی لیے اس نے بھی علیشا کو نہیں چھیڑا۔ وہ خود چل کر اس کے آفس آئے گی۔ کب؟ وہ فحشر تھا۔ باہر کڑی علیشا نے سیکرٹری کو نئی میں سر ہلاتے دیکھا۔

”آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ ریکارڈ نہیں ہے کیا آپ ہمارے اپائنٹمنٹ لینا چاہیں گی؟“ مگر علیشا نے بغیر مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا اس نے دروازہ کھول لیا۔ سب سے پہلے ہاشم نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل سپاٹ سرد سا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ پہ آخر شفیع کی

”آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ ریکارڈ نہیں ہے کیا آپ ہمارے اپائنٹمنٹ لینا چاہیں گی؟“ مگر علیشا نے بغیر مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا اس نے دروازہ کھول لیا۔ سب سے پہلے ہاشم نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل سپاٹ سرد سا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ پہ آخر شفیع کی

پریزنٹیشن دیکھتے جیسے سر اٹھایا تو وہ بھی ایک دم بالکل کھڑے ہوئے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی اور سیکرٹری پیچھے سے آ کر اسے روکتے ہوئے سخت ستا رہی تھی۔ اورنگ زیب صاحب کے ساتھ جھکے کنسلٹنٹ لڑکے نے باری باری ان دونوں باپ بیٹے کے تاثرات دیکھے اور پھر سیدھا ہوا۔ سیکرٹری کو اشارہ کیا وہ خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ علیشا وہ قدم مزید اندر آئی وہ مسلسل اورنگ زیب کاردار کو دیکھ رہی تھی ہٹا پلک جھکے سپاٹ چہرے کے ساتھ جیسے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہاشم ایک دم مڑا، سختی سے احمر کو دیکھا۔ ”باہر جاؤ فوراً“

کنسلٹنٹ لڑکا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا سمجھانے لگا۔

”سر! اگر تو یہ کوئی اسکینڈل ہے تو میرا خیال ہے میرا یہاں موجود ہونا سب سے ضروری ہے۔ کیونکہ میں ہی آگے پیش آنے والی صورت حال کا تجربہ کر سکتا ہوں اور میں ہی آپ کو بہتر طریقے سے گائیڈ کر سکتا ہوں کہ آپ کو اس پروجیکشن کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے؟ کیونکہ میں نے۔“

ہاشم گھوم کر اس طرف آیا، باپ کے ہاتھ سے ٹیبلٹ لے کر کنسلٹنٹ کو دے مارنے کے انداز میں تھمایا، اسے کہنی سے پکڑا، کھینچ کر دروازے تک لے کے گیا اور ہکا بکا سے احمر کو ہا ہر نکال گویا دفعتاً کر کے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس مڑ کر علیشا کے سامنے آکھڑا ہوا۔ سخت شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔

”کیا چاہیے؟ کس لیے آئی ہو؟“

اورنگ زیب بھی اب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے اور تھکھی خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ علیشا نے نظروں کا سن ہاشم کی طرف پھیرا۔ پھر خود کو بالاعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”میسے جانتیں۔“ ہاشم نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ گھوم کر آگے آیا اور باپ کی کرسی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں ایک سمت تھے اور ان کے مقابل



علیشا میز کے دوسری جانب کھڑی تھی۔ اپنے پرس کے ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑے خود کو مضبوط رکھتے ہوئے۔

”میں بہت پیسے دے چکا ہوں، تم ماں بیٹی کو اب کیا چاہیے؟“ اور رنگ زیب بولے تو انداز میں حقارت تھی۔

”جس پیسے کی بات آپ کر رہے ہیں میں آپ کو یاد دلاتی چلوں، وہ میری ماں کے اس علاج پر خرچ ہوئے تھے۔ جو ان کو آپ کی باربیٹ کی وجہ سے کروٹا پڑا۔“ وہ جذبات کو قابو میں رکھے ضبط سے ایک ایک حرف ادا کر رہی تھی۔ ”آپ کو شاید بھول گیا ہے کہ میری ماں کو چھوڑتے وقت آپ نے اسے بری طرح مارا پٹیا تھا جس کے باعث وہ کئی ہفتے ہسپتال میں رہی تھیں، ان کی بیک ہون متاثر ہوئی تھی۔ اور ان کے میڈیکل بلز بے کرتے کرتے ہم آج بھی ادھیں کھڑے ہیں جہاں چھ سال پہلے تھے۔“

اور رنگ زیب نے استہزاء میں انداز میں ناک سے کھٹی اڑائی۔ ”تم میرے خلاف کہیں پہ کچھ ثابت نہیں کر سکتیں۔“

علیشا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ تو بالکل درست بات ہے۔ کیونکہ جب میں نے آپ پر سو کرنا چاہا تھا تو آپ کے ماہر وکیل بیٹے نے۔“ ایک زخمی نظر ہاشم پہ ڈالی اور پھر اورنگ زیب کو دیکھنے لگی۔ ”عدالت میں جیوری کے سامنے یہ ثابت کر دیا تھا کہ نا صرف میری ماں میڈیسیوں سے اپنی غلطی کی وجہ سے مری تھی، بلکہ وہ دماغی توازن سے محروم عورت ہے۔ شاید اس میں سارا اکمال آپ کے بیٹے کا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ جس لافرم نے میرا ایس Pro Bono لیا تھا اگر وہ میرے وکیل کے طور پہ ایک نا تجربہ کار فرسٹ ایئر ایسوسی ایٹ کو نہ مقرر کرتے تو شاید ہم عدالت میں اتنی بری طرح سے بے عزت نہ ہوتے۔ چاہے یہ ملک ہو یا میرا ملک، قانون وہاں بھی آپ کا تھا یہاں بھی آپ کا ہے۔ اس لیے میں ایسی بات نہیں کروں گی۔“

کہتے ہوئے وہ رکی اندر سے دل بہت زور دھڑک رہا تھا۔ چند گہرے سانس لے کر اس نے خود کو دوبارہ بہادر ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ دونوں باپ تندی سے اس کو گھور رہے تھے۔ وہ قدم آگے آئی کے سامنے بڑی کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھا اور جی کرنا پھرے بولنے لگی۔

”میں ہارورڈ جانا چاہتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ میں سارے نیٹ کلینر کروں گی۔ اگر مجھے صرف اتنی امید ہو کہ میری ٹیوشن فیس بے کردی جائے گی اور چونکہ آپ میرے والد ہیں اور ناجائز ہی سہی مجھ سے آپ کی بیٹی ہوں اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ مجھے سپورٹ کریں، میں آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگیں گی۔ مجھے کوئی جذباتی انجمنٹ ہے آپ سے نہ کہ کوئی امید، صرف پیسے چاہیے، آپ کے پاکستانی ریلوے میں چند ملین کی بات ہے۔ آپ کے لیے تو یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف چند ملین۔“ اس نے رک کر موہوم سی امید سے دونوں باپ بیٹا کو دیکھا، پھر ایک کانٹہ ساٹے رکھا جس پہ اس کی تعلیم پہ اگلے چند سالوں میں خرچ آنے والی رقم کی تفصیل تھی۔

ان کے تاثرات ایک جیسے رہے۔ سخت سرد۔ ”اور تم یہ سب کہنے اس وقت آئی ہو جب ہمارا باپ الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ تمہارا خیال تھا کہ ایک اسکینڈل کے خوف سے ہم تمہیں پیسے دے دیں گے اور تم ہمیں خوشی رہو گی؟“ ہاشم نے یہ کہتے ہوئے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ ”تمہاری جیسی بہت سی لڑکیاں گزری ہیں جنہوں نے آکر عزت دار لوگوں کے الزام لگائے، مگر یوں تو واٹ عیشا، لڑکیاں وہ عورتیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں، آج کسی کو وہ یاد بھی نہیں ہیں۔ لیکن وہ مرد جن پہ انہوں نے الزام لگائے، چاہے چاہے جھوٹے، وہ مرد آج بھی خبروں میں ہیں۔ وہ آج بھی طاقت میں ہیں، آج بھی حکومت کر رہے ہیں۔ تمہارا کوئی مستقبل نہیں ہے عیشا، تم جہاں سے ہو وہاں چلی جاؤ۔ کیونکہ اگر اس سے زیادہ تم مجھ سے شرب کردگی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا پیش

کا اور تم یہ بات جانتی ہو۔“ اس کی مسکراہٹ اب سنگین نشان کی دھمکی میں بدل چکی تھی۔ عیشا کی آنکھوں میں سرخی ہی نہیں ابھرنے لگی، اس کے لب کھپکپاتے۔

”میں آپ کی بہن ہوں۔“

”تم میرے لیے ایک ایسا مسئلہ ہو جس کو میں کبھی حل نہیں کرنا چاہوں گا۔ تم اور تمہاری ماں میرے باپ کے پیسے پہ happily everafter رہنا چاہتے ہو جبکہ ایسا نہیں ہو گا۔“

”میں وہ بات ساری زندگی یاد رکھوں گی“ ہمیشہ کے لیے چیونٹیاں۔“ کیس جیتنے اور مجھے خیرات کی طرح ماں کے علاج کی رقم دینے کے بعد آپ نے یہ مجھے کہا تھا، میں چیونٹی ہی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ چیونٹیاں کیا ہوتی ہیں مگر شاید آپ خود بھی نہیں جانتے ہاشم!۔“

”اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں اس بات سے بے خبر تھا کہ تم یہاں پر ہو تو غلط ہو۔“ یہ کہتے ہوئے ہاشم آگے آیا۔ اپنے لب ٹاپ پہ جھکا چند ٹن دیاے اور اسکرین اس کی طرف کی۔ یہ خادری ای میل تھی جس میں اس نے عیشا کے ٹکٹ کی کاپی اور اس کے ہوٹل میں ٹھہرنے کے دوران دیے گئے تمام کاغذات کی کاپی اور چند ایک دوسری معلومات کے ساتھ دو روز پہلے بھیجی تھی۔ عیشا نے پہلے اسکرین کو دیکھا پھر چونک کر ہاشم کو۔

”میں تمہارے یہاں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ تم یہاں پر کسی نیٹ جیوڈا کو میٹھوڑی کے لیے نہیں آئی تھیں جیسا کہ تم نے میرے کزن اور میری بہن کی کو بتایا تھا۔ میں جانتا تھا تم یہاں پر ہمارے لیے آئی ہو، پیسے مانگنے یا بلیک میل کرنے، یا دھمکی دینے کیونکہ تم خود کو ہمارے خاندان کا حصہ سمجھتی ہو جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے میں تمہارا یہاں انتظار کیوں کر رہا تھا؟“ وہ لب ٹاپ کی اسکرین فولڈ کر کے سیدھا ہوا۔ دوبارہ اس کے سامنے آیا کہ میں

اس سے کافی لمبا تھا، گردن جھکا کر سفید بڑتی عیشا کو تندی سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

”اس لیے نہیں کہ مجھے تمہیں انکار کرنا تھا یا کوئی دھمکی دینی تھی۔ صرف ایک سوال تھا۔ تم نے میرے خاندان کو نارگٹ کیوں کیا؟ میں قلعہ نہیں بن سکتا کہ تم بالکل اتفاق سے میرے کزن کی ایلی بائی ہو۔ تم بالکل اتفاق سے اس کی بھانجی کی دوست ہو۔ میں عیشا، اتفاقات یہ یقین رکھنے والا آدمی بالکل نہیں ہوں۔ اس لیے تم ابھی مجھے بالکل سچ سچ بتاؤ گی کہ تم نے میری بھانجی کو دوست کیسے بنایا؟“ یہ سب عیشا کی توقع سے زیادہ تھا، وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے خشک لبوں پہ زبیں پھیری، ”ایک قدم پیچھے ہٹی۔ مدد طلب نظروں سے پاور سیٹ پہ بیٹھے اور رنگ زیب کاردار کو دیکھا جو حقارت اور برعزت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر قدرے ہراساں نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔ اس کا سارا اعتماد زائل ہو رہا تھا۔ اسے یاد تھا چند برس پہلے جب ہاشم اس کا گھر آیا تھا، چیک منہ مارنے کسی خیرات کی طرح اور تب اس نے اسے کہا تھا۔

”تم Happily Ever After رہنا چاہتی ہو، ایسا نہیں ہو گا، تم Ants Ever After رہو (ہمیشہ چیونٹیاں ہی) تم اور تمہاری ماں ایسے ہی رہو گے۔“ اور اس نے یہ بات لکھ کے رکھ لی تھی، اپنے کمرے میں ڈائریز پہ، الماری کے اندرونی دروازوں پہ، فوٹو البمز میں لگی تصویروں کے پیچھے، اپنے کی چین پہ۔ عیشا نے یہ بات ہر جگہ یہ لکھ کے رکھ لی تھی۔ سوائے اپنے دل کے۔ اور آج یہ الفاظ اس کے سیدھے دل پہ آکے گئے تھے۔

”خمن میری دوست ہے، اس سے زیادہ میں کسی چیز کی وضاحت نہیں دیتا چاہتی۔“ ہاشم چند لمحے کے لیے بالکل خاموش ہو گیا۔

”اگر تم چاہتی ہو کہ میں مستقبل میں کبھی تمہاری کوئی امید پوری کروں، تو ہو سکتا ہے تمہارے سچ جاننے سے میں واقعی تمہاری کوئی امید پوری کر



عکس دیکھا پھر سیاہ سلی ہالوں میں ہاتھ پھیرا۔ سرمئی آنکھوں کو سیکڑ کر تنقیدی نظروں سے دیکھا کہ کہیں وہ گھبرائی ہوئی تو نہیں لگ رہی مگر نہیں۔ بظاہر وہ اعتماد لگ رہی تھی۔ سرخ شرٹ سفید پینٹس اور لمبی ہیل کی سینڈل میں لمبوس کہنی پر پرس لگائے وہ اندر سے جتنی ڈری سہمی تھی اتنی لگ نہیں رہی تھی۔

مطلوبہ فلور ان پینچا تھا۔ دروازے کھلے۔ وہ اسی اعتماد سے چلتی ہوئی راہداری میں آگے بڑھتی گئی۔ کتنے ہی آفسز کو اس کے کتنے لوگوں کے سامنے سے گزری بغیر نظر نہ اٹے اسے معلوم تھا کہ اسے آفس میں جانا ہے۔ سب سے بڑا آفس سب سے آخر میں تھا، علیشا اس کے قریب بس لحاظے بغیر کوٹھری باہر موجود سیکرٹری نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں آپ کی کیلید کر سکتی ہوں؟“ اس نے پکارا۔ علیشا ذرا سا مسکرائی۔

”اورنگ زیب کاردار نے مجھے بلایا ہے، میری ان سے اپائنٹمنٹ ہے۔“

اس کی بات پر سیکرٹری تدرے اچنبھے سے اپنے نوٹس کھنگالنے لگی۔ علیشا نے گردن پھیر کر بند دروازے کو دیکھا، یہاں سے وہ اندر کا منظر نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اندر آفس میں کنٹرول چیر اورنگ زیب کاردار اپنی مخصوص نمکنت کے ساتھ بیٹھے تھے ابرو کے ساتھ اس نوجوان کو سن رہے تھے جو سامنے کھڑا ایک پریزنٹیشن دکھا رہا تھا۔ وہ بی کیپ چنے لاپرواہے حلیے والا نوجوان ان کا بیج کنسلٹنٹ بھی تھا اور کیمپین مینر بھی۔ وہ کافی متانت اور اپنی عمر سے زیادہ سمجھداری سے بولتا ایک ایک چیز سمجھا رہا تھا۔ جسے میز کے مقابل کرسی پر بیٹھا الپ ناپ پہ کام کرتا ہاشم بہت ہی بے زاری سے سن کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔

”سر بظاہر یہ لگتا ہے کہ آپ کے بھانجے پہ اپنے بھائی کے قتل کا آٹنے والا الزام آپ کے خلاف جائے گا لیکن۔“ کیمپین مینر نے پین اٹھا کر ڈرامائی انداز

میں وقفہ دیا۔ ہاشم نے نگاہ پھیر کر مزید بے زاری سے اسے دیکھا۔ ہونہ کر کے سر جھٹکا۔ اور دوبارہ سے الپ ناپ پہ ناپ کرنے لگا۔ ایک تو اس کنسلٹنٹ سے اسے چڑھتی وہ لڑکا وہ باتیں جانے کے پیسے لیتا تھا جو وہ اپنے ناپ کو مفت میں بھی پتا سکتا تھا۔

”لیکن سر! ہم اس موقع کو اپنے مفاد میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔“ اورنگ زیب کاردار کے خفا چہرے پہ شکنیں ابھریں۔

”اور وہ کیسے؟“

”آپ جانتے ہیں کہ اس وقت آپ ضمنی انتخابات کے لیے کھڑے ہو رہے ہیں۔ ایسے میں کچھ کی پلیسز اپنے مطلوبہ امیدواروں کے بجائے آپ کو اٹھتے دیکھ کر آپ کے خلاف استعمال ہونے والا کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے“ اس لیے بجائے اس بات پر مدافعت انداز اختیار کرنے کے ہم اس کو اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں جیسے۔“ جوش میں کھتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ کو اورنگ زیب صاحب کے پاس آیا اور ان کو کچھ دکھانے لگا۔ ”یہ وہ بیان ہے جو آپ پریس کے سامنے دیں گے۔ جس سے ایسا لگے گا کہ آپ کو کہ اپنے بھانجے کے اس قتل سے خفا ہیں لیکن اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کیے بغیر اس معاملے کو قانون پر چھوڑ رہے ہیں۔ آپ علی الاعلان یہ کہیں گے کہ بے شک ملزم میرا سگا بھانجا ہی کیوں نہ ہو اگر وہ واقعی مجرم ہے تو اس کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ اور آپ اپنا کوئی بھی ناجائز اثر و رسوخ استعمال کر کے اس کو وہاں سے نکالنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ایسی صورت میں آپ کو ایک انصاف پسند شخص کی حیثیت سے دیکھا جائے گا۔“

اورنگ زیب نے بگڑ کر اس کو دیکھا۔ ”یعنی کہ میں فارس کو اس معاملے سے نکالنے کی کوئی کوشش نہ کروں؟“ کیمپین مینر آخر شفیع مسکرایا اور چنگی بجاہی۔

”یہی تو ساری ٹیم ہے سر! آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس اسکینڈل پہ پرہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آپ کے مخالفین کسی بھی صورت آپ کو اس

اسکینڈل کو کور کرنے نہیں دیں گے تو پھر کیا ہی اچھا ہو ہم بھی اسے کور کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ہم انہی کا دوا انہیں پہ کھیل جائیں۔ دیکھیں۔“ وہ اب اپنی اس اسٹوڈیو کی مزید مین میخ سمجھانے لگا۔ اورنگ زیب بظاہر پرے موڑ کے ساتھ لیکن توجہ سے سن رہے تھے۔ ہاشم نے نگاہ اٹھا کر دوبارہ بے حد بے زاری اور کٹنگی سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر کی بورڈ پہ ناپ کرنے لگا۔ اس کو جس خیر کا انتظار تھا، زمر کے بیان کا وہ آگے نہیں دے رہی تھی پانچ دن ہو چکے تھے زمر کو کوئی لگے، فارس آزاد گھوم رہا تھا، بیوی کی موت کا سوگ منا رہا تھا، اور فی الحال کوئی بھی نہیں تھا جو یہ کہہ سکے کہ یہ قتل فارس نے کیا ہے۔ گو کہ ہوٹل کے کمرے سے بخبری کے بعد گن برآمد کرنی گئی تھی مگر فارزنگ رپورٹ کو اس نے ابھی روک رکھا تھا۔

فارزنگ اور فکر پر نٹ رپورٹ زمر کے بیان کے بعد آئی چاہیے۔ یہ پلان تھا مگر زمر۔ اگر زمر مر گئی۔۔۔

الف۔ اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ایک لاش کا مزید بوجھ اپنے کندھوں پر نہ۔ نہیں!

وہ سر جھٹک کر اپنی ہی میل کھولنے لگا۔ خار نے وہ روز پلے اس کو فارس کی ایلی بلی لڑکی کی تفصیلات بھیج دی تھیں۔ اس کے واسطے درست تھے۔ وہ علیشا ہی تھی۔ مگر اس نے ہاشم سے رابطے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اسی سے ملنے اور ہر آئی تھی، ہاشم کو معلوم تھا اسی لیے اس نے بھی علیشا کو نہیں چھیڑا۔ وہ خود چل کر اس کے آفس آئے گی۔ کب؟ وہ فحشر تھا۔ باہر کڑی علیشا نے سیکرٹری کو نئی میں سر ہلاتے دیکھا۔

”کہہ رہی تھی۔“

”آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ ریکارڈ نہیں ہے کیا آپ ہمارے اپائنٹمنٹ لینا چاہیں گی؟“ مگر علیشا نے بغیر مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا اس نے دروازہ کھول لیا۔ سب سے پہلے ہاشم نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل سپاٹ، سرد سا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ پہ آخر شفیع کی

”آپ کی کوئی اپائنٹمنٹ ریکارڈ نہیں ہے کیا آپ ہمارے اپائنٹمنٹ لینا چاہیں گی؟“ مگر علیشا نے بغیر مڑی اور تیزی سے دروازے کی طرف آئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اسے روک پاتا اس نے دروازہ کھول لیا۔ سب سے پہلے ہاشم نے چونک کر دیکھا تھا اور پھر وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ بالکل سپاٹ، سرد سا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ میں پکڑے ٹیبلٹ پہ آخر شفیع کی

پریزنٹیشن دیکھتے جیسے سر اٹھایا تو وہ بھی ایک دم بالکل کھڑے ہوئے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی اور سیکرٹری پیچھے سے آ کر اسے روکتے ہوئے سخت ستا رہی تھی۔ اورنگ زیب صاحب کے ساتھ جھکے کنسلٹنٹ لڑکے نے باری باری ان دونوں باپ بیٹے کے تاثرات دیکھے اور پھر سیدھا ہوا۔ سیکرٹری کو اشارہ کیا وہ خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ علیشا وہ قدم مزید اندر آئی وہ مسلسل اورنگ زیب کاردار کو دیکھ رہی تھی، ہٹا پلک جھکے، سپاٹ چہرے کے ساتھ، جیسے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ہاشم ایک دم مڑا، سختی سے احمر کو دیکھا۔ ”باہر جاؤ فوراً!“

کنسلٹنٹ لڑکا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر گویا سمجھانے لگا۔

”سر! اگر تو یہ کوئی اسکینڈل ہے تو میرا خیال ہے میرا یہاں موجود ہونا سب سے ضروری ہے۔ کیونکہ میں ہی آگے پیش آنے والی صورت حال کا تجربہ کر سکتا ہوں اور میں ہی آپ کو بہتر طریقے سے گائیڈ کر سکتا ہوں کہ آپ کو اس پروجیکشن کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے؟ کیونکہ میں نے۔“

ہاشم گھوم کر اس طرف آیا، باپ کے ہاتھ سے ٹیبلٹ لے کر کنسلٹنٹ کو دے مارنے کے انداز میں تھمایا، اسے کہنی سے پکڑا، کھینچ کر دروازے تک لے کے گیا اور ہکا بکا سے احمر کو ہا ہر نکال گویا دفعتاً کر کے دروازہ بند کیا۔ پھر واپس مڑ کر علیشا کے سامنے آکھڑا ہوا۔ سخت شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔

”کیا چاہیے؟ کس لیے آئی ہو؟“

اورنگ زیب بھی اب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تھے اور تھکھی خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ علیشا نے نظروں کا سن ہاشم کی طرف پھیرا۔ پھر خود کو بالاعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”میسے چاہئیں۔“ ہاشم نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ گھوم کر آگے آیا اور باپ کی کرسی کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ اب وہ دونوں ایک سمت تھے اور ان کے مقابل



سکوں۔ وہ اب کہ بولا تو بسے میں ذرا نرمی تھی اور نگ زیب نے ناگواری سے ہاتھ کو دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ہاتھ یہ سب اس سے کچھ کہلوانے کے لیے کہہ رہا ہے۔ علیشا کو حوصلہ ہوا۔

”شاید آپ بھول گئے ہیں کیپوٹریز میں اچھی ہوں“ میں نے آپ کے والد (اسے ”آپ کے“ یہ زور دیا) کا اسی میل اکاؤنٹ ہیک کر رکھا تھا اور میں دیکھتی تھی کہ وہ کس طرح ایک چھوٹی لڑکی کو اسی میلز بھی کرتے تھے اس کی میلز کا جواب بھی دیتے تھے اور اس کو سراہتے بھی تھے۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر اپنے خون کو چھوڑ کر کسی اور کی بیٹی سے اتنا پیار کوئی کیسے رکھ سکتا ہے؟

”اور اب تم اس کسی اور کی بیٹی کو نقصان پہنچانا چاہتی ہو؟ راسٹ؟“

ہاتھ کے چہرے کی سختی لوٹ آئی وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا اور علیشا کو قدم پیچھے ہٹنے پڑے۔ وہ اب خوف زدہ نہ رہ رہی تھی جیسے اسے لگ رہا ہو ہاتھ ابھی اس پر جھپٹ پڑے گا۔

”تم نے اسے کیسے ٹریپ کیا بالکل سچ بتانا ورنہ مجھے سچ نکالوانے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔“

علیشا کی گردن خود بخود نفی میں ہل رہی تھی۔ حلق سوکھ چکا تھا۔

”میں نے اسے ٹریپ نہیں کیا۔ میں وہ گیم کھیلنے لگی جو وہ کھیلتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے کانٹیکٹ کرے گی اور پھر ہم دوست بن سکتے۔“ پھر اس کے چہرے پر بے چینی ابھری۔ ”ہم واقعی دوست ہیں پلیز اس کو کچھ مت کہنا۔ پلیز“

وہ کمزور پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی وہ اس طاقتور اور رعب دار باپ بیٹے سے سامنے کمزور پڑ جائے گی اور بالکل ایسا ہوا تھا۔ ایسا ہی ہونا تھا۔

”میں اس کو بہت پسند کرتی ہوں وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ پلیز میری اور اس کی دوستی کو کسی اور نظر سے مت دیکھو۔“ ہاتھ نے گہری سانس لی۔ اثبات میں سر ہلایا اپنی سابقہ کرسی کھینچی بیٹھا ناٹنگ

پہ ناٹنگ رکھی۔ اور گردن اٹھا کر تمکنت اور رعونت سے علیشا کو دیکھا۔

”اب تمہیں جو کرنا ہے کر لو کیونکہ تمہیں میرے پاس سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ اپنے ملک واپس جاؤ، سخت مزدوری کرو اور پھر جس اسکول میں جانا ہے جاؤ۔ اور نہیں تو کہیں اسکا رشپ کے لیے اپلائی کرو۔ کوئی نہ کوئی تمہیں ترس کھا کے کچھ دے گا۔ لیکن وہ شخص کم از کم میرا باپ نہیں ہو گا۔“

اس کے بعد سختی سے انگلی اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اؤٹ۔“ علیشا کی آنکھوں میں ابھرتی نمی بڑھنے لگی۔ اس نے تڑپ کر اپنے باپ کو دیکھا۔

”خداوند تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

مڑی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ اس کا یہاں آنا اس کا یہاں ٹھہرنا ان کے پاس آ کے منت کرنا سب بے کار لگ رہا تھا۔

اس کے نکلنے ہی ہاتھ کے تاثرات بدلے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور نگ زیب کے چہرے پر ابھی اب قدرے نظر تھا۔

”ہاتھ!“ انہوں نے پکارا مگر اس سے پہلے ہی وہ ان کی طرف ٹھوکا، میز پر ہاتھ رکھے ان کے سامنے جھکا۔ اور ان کی آنکھوں میں دیکھ کر چبا چبا کر بولا۔ ”میں ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی آپ کا پھیلا یا کچرا صاف کر لوں گا، کیونکہ ہاتھ ہے ہی اس کام کے لیے۔ ہاتھ ہر چیز سنبھال سکتا ہے، یہ بھی سنبھال لے گا۔ لیکن میری بات یاد رکھیے گا۔ اگر میری ماں کو اس بارے میں کچھ بھی پتا چلا یا وہ ہرٹ ہو میں تو میں آپ کا ساتھ نہیں دوں گا۔“

پھر سیدھا ہوا۔ اپنا لپ ٹاپ اٹھایا اور انہیں گھور کر دیکھا مڑ کر باہر نکل گیا۔ اور نگ زیب غصے سے منہ میں کچھ بڑبڑا کر سر جھٹک کر رہ گئے۔ ابھی فارس کا مسئلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مسئلہ آن پہنچا تھا۔

برے وقت کی ایک غلطی۔ اف!



شیشہ گروں نے اس کی بصیرت بھی چھین لی۔ آنکھیں چھیں اس کے پاس مگر دیکھتا نہ تھا۔ اسپتال کا وینٹنگ روم میں ٹھنڈا تھا، خنیں گھٹنے ملا کر سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ علیشا ساتھ کھڑی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تسلی دینے والے فکر مند انداز میں کہہ رہی تھی۔

”آئی ایم سو سو ری جو بھی تمہاری آنٹی کے ساتھ ہوا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کے زخم اتنے گہرے ہوں گے۔ مجھے بتاؤ کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“ وہ بے حد بر ملا نظر آ رہی تھی۔

چہرے پر چند گھٹنے پہلے کی ہاتھ کے ساتھ کی مٹی ملاقات کا اثر اور ٹھنڈی ابھی تک برقرار تھی۔ اور وہ خنیں کے لیے فکر مند بھی تھی۔

خنیں نے سوگوارت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے چہرہ اٹھایا، عینک کے پیچھے اس کی آنکھوں میں بے حد دکھ تھا۔

”میرا نہیں خیال ہم پیچھو کے لیے اب کچھ کر سکتے ہیں، میں ان کے لیے پہلے بھی کچھ نہیں کر سکی تھی۔ اب مجھے ہر اس رویے پر شرمندگی ہے جو میں نے ان کے ساتھ رکھا۔“

علیشا اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھی پرس اپنے قدموں کے قریب رکھا۔ اور پھر گھٹانے والے انداز میں کہنے لگی۔

”تم پرانی باتوں کو بھول جاؤ، دلوں کے سارے میل و محو ڈھلو۔ جن رشتوں کی مشترک شے ”خون“ ہوئی ہے وہ ایک دوسرے کی طرف پلٹ کے ضرور آتے ہیں۔“ خنیں بے دلی سے اس کی ساری باتیں سنتی تھیں۔ کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی پریشان نگاہیں بار بار کوریڈر کی طرف اٹھتی تھیں، لیکن کے پار کمرے میں زمر تھی۔ اس نے بیان دینے کے لیے رضا مندی ظاہر کی تھی اور ابھی پولیس آگئی تھی۔ تب سے سعدی اور پولیس آفیسرز باہر نہیں نکلے تھے۔

”تمہاری اہی کدھر ہیں؟ میں ان سے افسوس ہی کر

لیتی۔“ علیشا کی پھر وضاحت دینے والے انداز میں بولی۔

”آئی ایم سو ری میں پچھلے کچھ دن بہت مصروف رہی۔ اپنی ڈاکو مینٹوری کے سلسلے میں۔“ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ قدرے پیکارا، مگر خنیں نے نوٹ نہیں کیا۔ علیشا نے شکر ادا کیا اپنی دوستی کو کسی بھی قیمت پر وہ واؤ پیہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔

”وہ میرے والد کے پاس ہیں۔ ان کو کھر شفٹ کر دیا گیا ہے۔ وہ بہت بیمار ہیں۔“ پیچھو کے حادثے نے ان پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ پیش آنے والے تمام حالات بتاتے گئی۔ علیشا سنتی تھی۔ ان سے ہٹ کر کوریڈر کے اس پار کمرے میں زمر بستر پر لیٹی تھی۔ چادر گردن تک ڈالے سر ہانے کی طرف سے بیڈ اوپر گواٹھا تھا اور وہ تکیوں سے ٹیک لگائے سپاٹ چہرے اور خشک دیران آنکھوں کے ساتھ اپنے سینے پر رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ سعدی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ بالکل ساتھ۔ وہ پولیس والے سامنے موجود تھے، بیان قلم بند کیا جا رہا تھا۔

”پھر فارس غازی نے مجھے کال کر کے جگہ کی تبدیلی کا بتایا اس کے کہنے پر میں اس ریسٹورنٹ گئی جہاں پہ اس نے مجھے بلایا تھا۔“ سعدی نے چونک کر اسے دیکھا اسے حیرت ہوئی یہ بات فارس یا خنیں نے اسے نہیں بتائی تھی۔

”ریسٹورنٹ میں جانے کے بعد کیا ہوا؟“ اے ایس بی سرمد شاہ پوچھ رہا تھا۔ زمر نے جواب دینے کے لیے نگاہیں اٹھائیں پہلے اس کو دیکھا پھر گردن پھیر کے سعدی کو اور ایک ہاتھ سعدی کی طرف پرجھایا، سعدی اس کا ہاتھ پکڑتے قریب ہوا۔ جیسے کوئی موہل سپورٹ تھی جس کی اس کو ضرورت تھی۔ اب کہ اس نے زیادہ اعتبار سے پولیس آفیسر کو دیکھا اور بولی تو آواز ٹھنڈی تھی۔

”فارس نے مجھے کال کی اور اس نے مجھے کہا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور یہ کہ اس کے پاس کوئی ایلی بانی نہیں تھا۔“ سعدی نے کرنٹ کھا کر اپنا ہاتھ



اس کے ہاتھ سے نکالا۔ بے حد بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جو فارس کے تمام الفاظ من و عن دوہرا رہی تھی۔

”زمر؟“ اس نے استعجاب سے پکارا۔ زمر کی اپنے خالی رہ جانے والے ہاتھ کو دیکھا اور پھر سعدی کو۔ یہ اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ آفسر پوچھ رہا تھا کہ پھر کیا ہوا؟ اور زمر سعدی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بالکل گنگ تھا۔ ”آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ماموں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”سعدی میں ادھر تھی فارس نے مجھے کال کیا اس نے یہ سب مجھے کہا۔ یہ سب جو میں نے ابھی لکھوایا ہے۔ اور پھر اس نے کہا کہ وہ مجھے صرف ایک گولی مارے گا۔ وہ بھی دل میں۔ لیکن اس نے مجھے تین گولیاں ماریں۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی قتل کرنا چاہتا ہے اور مجھے بھی۔ اور پھر ایسا ہی ہوا اس نے شوٹ کیا۔ آپ اس کے گھر جائیں اس کی گنز تلاش کریں اس کے پاس گنز کی ایک بہت بڑی کلیکشن ہے۔ مجھے یقین ہے انہی میں سے کوئی گن اس نے ہمارے اوپر استعمال کی ہوگی۔ میں تو یہ سمجھ نہیں پا رہی کہ وہ ابھی تک آزاد کیوں گھوم رہا ہے؟ سعدی تم میری بات سن رہے ہو؟“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کا اعتماد کم ہو رہا تھا۔ سعدی بے حد بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹا۔

”زمر! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔“ پھر تیزی سے وہ آفسر کی طرف مڑا۔ ”آپ پلیز اس کو بند کر دیں۔ مجھے اپنی پیچھو سے بات کرنی ہے۔ یہ بیان اس کے بعد بھی کیا جاسکتا ہے۔“ پلیز آپ ابھی باہر جائیں۔“ وہ ان کو باہر بھیجنا چاہتا تھا۔ زمر کے چہرے کا رنگ بدلا۔ لب بھینچ گئے۔ اس نے قدرے غصے سے سعدی کو دیکھا۔

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ اس نے کہا اس نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے اس نے کہا وہ اپنی بیوی کو اور مجھے قتل کرنے جا رہا ہے۔ اور اس نے ہم پہ گولی چلائی۔ یہ گولی ہم پہ فارس

نے چلائی۔ میں اس بات کی گواہ ہوں۔“ ”زمر! پلیز خاموش ہو جائیں۔ کچھ بھی مت کہیں۔ یہ سب کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہے۔“ پلیز خاموش ہو جائیں۔“ وہ بے حد ڈانڈ سا ہو کر اس کو ہاتھ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح پولیس والوں کو وہاں سے نکالے۔

”سعدی! میری بات سنو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ میرا داغی توازن بھی بالکل برقرار ہے۔ میں کسی بھی Duress میں آکر یہ بیان نہیں دے رہی میں ڈسٹرکٹ پرائیسیوٹر زمر یوسف ہوں۔ میری ایک کریڈیبلٹی ہے۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ سب فارس نے کیا ہے اس نے اپنے بھائی کو مارا اس نے ہمیں بھی مارنا چاہا۔ آپ اس کو بلا لیں۔ آپ اس کو میرے سامنے لا کر یہ سب پوچھ سکتے ہیں۔“

”زمر! پلیز خاموش ہو جائیں۔“ وہ تڑپ کر اس کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن زمر نے دیکھا سعدی کا ہاتھ اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اس نے اپنا خالی ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ چہرے کے تاثرات مزید سرد ہو گئے۔ اے ایس بی سرد آگے بڑھا۔ سعدی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تنبیہی انداز میں اس کو دیکھا۔

”آپ باہر چلے جائیں اور اگر آپ نے کال کر کے فارس غازی کو متنبہ کرنے کی کوشش کی تو میں آپ کو قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں اور مجھے امید ہے آپ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس کا نقصان صرف اور صرف آپ کے ماموں کا ہو گا۔“ دوسرے آفسر نے دروازہ کھولا وہ سعدی کو باہر جانے کو کہہ رہے تھے۔ وہ پھر بھی اس کو دیکھتی رہی بظاہر سپاٹ، سرد نظروں سے، لیکن ان میں جیسے بے چینی تھی۔ امید تھی۔ وہ ابھی آئے گا اور اس کا ہاتھ تھام کر کہے گا، میری پیچھو سچ کہہ رہی ہیں، میری پیچھو جھوٹ نہیں بول، ملتیں، مگر وہ بے یقین حق و باطل کا مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ”یہ سب غلط ہو رہا ہے ایسا نہیں ہے میرے ماموں ایسا نہیں کر سکتے۔“

میں سچ کہہ رہا ہوں میری بات سنیں۔ آپ پلیز یہ بیان دیکھ دیں۔“ مگر آفسر نے اس کی اگلی بات نہیں سنی تھی اس نے بہت عزت اور احترام سے اس کی کہنی کو تھامے اس کو باہر کا رستہ دکھایا اور دروازہ بند کر دیا۔ زمر نے آنکھیں بند کیں، چند گہرے سانس اندر اتارے۔ اور پھر کھولیں تو وہ پہلے سے زیادہ خود کو سمیٹ چکی تھی۔ اس نے کتنا شروع کیا۔ وہی سب جو اس کے نزدیک سچ تھا اور یہ سب کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے اسپتال کے بستر پہ لیٹا اپنا وجود تھا نہ ہی ارد گرد مگی نالیاں تھیں، مشینز اور فضا میں رچی بسی اسپرٹ کی عجیب سی بو۔ ناکارہ گردے۔ ڈائمنڈز والی زندگی۔ کچھ بھی نہ تھا۔ صرف فلیج زور بڑے ہاتھ۔ صرف وہی۔

بے حد مضطرب اور پریشان سا سعدی باہر آیا۔ کوریڈور سے گزرتے ہوئے وہ وینٹنگ روم کے سامنے رکا، پھر تیزی سے اندر آیا۔ حندہ اور علیشا وہاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

”حنین“ اس کے انداز پر حنین بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی، متفکر نگاہوں سے اس کا چہرہ کھوجا۔ ”کیا ہوا بھائی؟“

”جب تم اور ماموں اور۔۔۔“ ایک نگاہ ساتھ کھڑی فارز لڑکی پہ ڈالی، پھر حنین کو دیکھا۔

”اور تمہاری فرینڈ زمر کا انتظار کر رہے تھے ہوٹل میں کیا تب ماموں نے ان کو کوئی کال کی تھی؟“ حنین نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”کیا مطلب کیسی کال؟“

”حنین! جب تم سب لوگ ساتھ تھے تو کیا ماموں نے زمر کو کسی ریسیورنٹ میں بلایا تھا؟ انہوں نے انہیں کوئی کال کی تھی؟ جس میں انہوں نے کہا کہ وہ وہ رنگ۔ یہ الفاظ تو وہ خود بھی ادا نہیں کر پا رہا تھا۔ مشکل بہت جمع کر کے بولا۔

”انہوں نے کہا کہ وہ وہی وارث ماموں کے قاتل ہیں اور وہ زمر کو بھی مارنا چاہتے ہیں اور زمر ماشہ آئی کو۔“ حنین کے چہرے پہ پہلے حیرت ابھری اور پھر

شدید شاک۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ پھر اس نے علیشا کو دیکھا۔ ”علیشا۔۔۔ ہم سب ساتھ تھے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے ایک دو دفعہ کال کی تھی مگر پیچھو کا فون بند جا رہا تھا۔“ علیشا نے بھی اتنی ہی الجھن سے سعدی کا چہرہ دیکھا۔ ”میں مداخلت نہیں کرنا چاہتی لیکن ہم لوگ کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ وہاں پہ رہے۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں اور ہم باتیں کرتے رہے تھے یا زیادہ وقت خاموش رہے تھے۔ پھر فون آیا کہ زمر ماشہ کو گولی لگی ہے جو حنین کے انکل کی بیوی تھی۔ اس پر یہ دونوں اٹھ کھڑے وہاں سے نکل گئے۔“ سعدی اس کی طرف مڑا۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر اس سے پوچھا۔

”کیا جب تم لوگ ساتھ تھے تم تینوں تو کسی ایک لمحے کے لیے بھی فارس ماموں تم لوگوں سے الگ ہوئے تھے؟“ حنین اور علیشا دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا بھائی۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

سعدی نے کرب سے آنکھیں بند کیں، کنبی دونوں ہاتھوں سے مسلی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔

”زمر کہہ رہی ہیں کہ ماموں نے انہیں کال کیا اور ماموں نے انہیں کہا کہ وہ ان کو شوٹ کرنے لگے ہیں اور یہ کہ ماموں نے ان کے سامنے اعتراف جرم کیا۔“ حنین کے چہرے کا شاک ایک دم ناگواری اور غصے میں ڈھلا۔ وہ تیزی سے آگے آئی۔

”کیا مطلب ماموں نے یہ سب کہا؟ پیچھو جھوٹ بول رہی ہیں، ماموں ہمارے ساتھ تھے انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ یہ کیا مذاق ہے؟“ وہ طیش سے پھر رہی تھی۔ زمر اس قسم کی حرکت کیوں کر کر سکتی تھی؟ سعدی نے نفی میں گردن ہلائی اور تمہکا تھکا سا کرسی پہ بیٹھ گیا۔

”مجھے کچھ نہیں پتا کیا ہو رہا ہے؟ مگر زمر کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ماموں پہ الزام لگا رہی ہیں، ماموں تو خود اتنے ٹوٹ گئے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچا بھی



نہیں تھا کہ یہ سب ہو گا۔ ماموں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔  
ہے نا حسین؟ اس نے تائید کے لیے سر اٹھا کر حسین کو  
دیکھا۔ وہ اس کی طرح پریشان نہیں تھی وہ غصے میں  
تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا پچھو ماموں سے کون  
سا بدلہ اتار رہی ہیں؟ یہ ایک دہشت گردی کی  
کارروائی تھی وہ اس میں ماموں کو کیوں گھسیٹ رہی  
ہیں؟ انہیں ایسا کرنا بالکل زیب نہیں دیتا۔ مجھے کبھی  
ان سے اس چیز کی توقع نہیں تھی۔“ وہ غصے سے واپس  
پیٹھی ”اب چہرے پہ کچھ دیر پہلے کی چھائی زمر کے لیے  
ہمدردی ختم ہو چکی تھی وہاں صرف اور صرف ملال  
بھری بے بسی تھی۔ علیشالان دونوں کے سامنے کھڑی  
فکر مندی سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔  
اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس مسئلے میں  
پھنسی جا رہی ہے۔

”بھائی! آپ ماموں کو کال کریں ان سے پوچھیں  
کہ پچھو کیا کہہ رہی ہیں۔“ سعدی نے ٹھکی ٹھکی  
نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”میں ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا جو فارس غازی کو  
مزید مشتبه بنائے۔ اس بیان کے بعد پولیس ان سے  
ضرور پوچھ کچھ کرے گی۔ شاید ان کو گرفتار بھی کر  
لے۔ مجھے واقعی نہیں پتا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“  
”اگر آپ نہیں بتائیں گے تو میں انہیں کال کرنے  
جا رہی ہوں۔ انہیں پتا ہونا چاہیے کہ پچھو ان پہ کیا  
الزام لگا رہی ہیں اور وہ بھی پولیس کے سامنے۔ اوکاڑا  
حسین کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہر چیز کو تیس  
تیس کر ڈالے۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوئی جیسے واقعی  
کال کرنے جا رہی ہو۔ سعدی نے اسے روکا۔

”نہیں اس وقت چیزوں کو خراب کرنے کی نہیں  
ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔“ حسین نے سوالیہ  
نظروں سے بھائی کا چہرہ نگاہ۔

”پھر ہم کیا کریں؟ کس کو بتائیں؟ کس سے مدد  
مانگیں؟“

سعدی نے موبائل نکالا ’فون بک کھولی نمبر ڈائل

کیا اور فون کلن سے لگاتے ہوئے حسین سے بولا۔  
”تھینک گاڈ ہمارے رشتے واروں میں کوئی ایک  
شخص تو ایسا ہے جس کے بارے میں میں کہہ سکتا  
ہوں کہ وہ ہر مسئلہ سنبھال سکتا ہے۔“ دوسری طرف  
گھنٹی جا رہی تھی۔

حسین نے بھنویں سکیر کرا پنچھے سے سوچا اور پھر  
تاثرات ڈھیلے پڑے۔

”اوہ ہاشم بھائی! آپ ہاشم بھائی کو بلا رہے ہیں۔  
اوکے!“ وہ غیر آرام دہ سی ہو کر کرسی کے کنارے بیٹھ  
گئی۔ البتہ وہ ابھی بھی بے چین تھی اور بخوش بھی۔  
سامنے کھڑی علیشا کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا  
اور دوسرا جا رہا تھا۔ اس ساری گفتگو میں ہاشم کا نام  
سب سے واضح تھا۔ ہاشم پھر ہاشم کو دھڑکی ہاشم۔  
اس نے کھنکھار کے ان دونوں کو متوجہ کیا۔

”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ میری مٹی کی کال  
آنے والی ہے۔“ وہ ہوٹل میں بیٹھے اس وقت نہ پا کر  
پریشان ہو جائیں گی۔ میں رات کو پھر آؤں گی تم  
پریشان مت ہو نا۔“ قریب ہو کے حسین کا اندھا جھانک کر  
وہ کہہ رہی تھی۔ سعدی نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس  
فارن لڑکی کو دیکھا جو ان کے لیے بے حد فکر مند لگ  
رہی تھی۔ اور پھر دوسری طرف جاتی گھنٹی سننے لگا۔

”جی ہاشم بھائی!“ رابطہ ملنے ہی وہ بچوں کی سی بے  
ساختگی سے بولا۔

”پلیز آپ ادھر آ جائیں جی ادھر ہی اسپتال میں  
مجھے نہیں پتا یہاں کیا ہو رہا ہے لیکن پچھو کو کوئی غلط  
فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو تفصیل یہاں آنے پہ بتاؤں گا۔“  
لیکن وہ ابھی پولیس کو اپنا بیان دے رہی ہیں۔ اور جو وہ  
بیان دے رہی ہیں وہ ہمارے خاندان کے لیے بہت  
تباہ کن ہو سکتا ہے۔“ اور دوسری طرف کارڈ رائیو  
کرتے ہوئے کانوں میں ہینڈ فری لگائے ہاشم نے  
تھک کر آنکھیں بند کیں۔ اور پھر گہری سانس لے کر  
کھولیں۔ بالآخر وہ بیان آ ہی گیا تھا جس کا وہ انتظار کر رہا  
تھا۔

”میں آ رہا ہوں سعدی! تم بالکل فکر مت کرو میں

سب سنبھال لوں گا۔ ہاشم سب سنبھال سکتا ہے۔“  
ہلکی سی مسکراہٹ سے اس نے ہینڈ فری کانوں سے  
اتارے اور ایک سیلیٹر پہ پاؤں کا باؤ بڑھا دیا۔

\*\*\*

پولیس آفیسرز زمر کے کمرے سے نکل رہے تھے  
جب گوریڈور کی دیوار کے ساتھ لگے مایوس اور فکر مند  
سے کھڑے سعدی نے کوئی آہٹ سی محسوس کر کے  
گردن موڑی۔ دسمیشن کی طرف سے ہاشم چلا ہوا  
آ رہا تھا بلیک سوٹ میں ملبوس نکلتی پہ بندھی کھڑی  
دیکھتا۔ دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے وہ تیز قدم  
اٹھاتا قریب آیا۔ تحکم اور رعونت سے ان آفیسرز کو  
دیکھا وہ فوراً ”سیدھے ہوئے تھے“ اسے ایس لی نے  
موسو بانہ انداز میں سلام کیا۔ ہاشم نے محض سر کے خم  
سے جواب دیا۔ اور ان کو نظر انداز کر کے سعدی کی  
طرف آیا۔

”مجھے مختصراً بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ اور اسے توچیے  
ہاشم بھائی کے آنے سے بہت تقویت مل گئی تھی وہ  
پریشانی سے تیز تیز بولتا اس کو ساری صورت حال  
سمجھانے لگا۔ ہاشم کے لیے کچھ بھی نیا نہیں تھا مگر  
ہر پوری توجہ سے سن کر اس نے سر ہلایا اور اسے  
وہیں رہنے کا کہہ کر کمرے کی طرف بڑھا۔

”مجھے زمر سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“ اندر  
موجود ڈاکٹر کو اس نے بس ایک فقرے سے باہر بھیجا  
دروازہ بند کیا اور بیڈ کے سامنے آیا۔ قدرے ٹھیک لگا  
کے لیٹی زمر نے آگاہ ہاشم کو دیکھا اور بے زاری سے  
منہ پھیر لیا۔

”آپ جس لیے بھی آئے ہیں کتنا ہی اچھا ہو  
والبس چلے جائیں کیونکہ میں اس وقت کم از کم آپ  
سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے فارس کے خلاف بیان  
دیا ہے؟“ وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ زمر نے والبس

منہ اس کی طرف کیا اور بگڑے تاثرات سے بولی۔

”آپ کو میرے بیان پہ جو بھی اعتراض کرتا ہے جو  
بھی واپس کرتا ہے۔ آپ کورٹ میں کر سکتے ہیں۔  
کیونکہ میں اپنی کسی بات سے اک قدم بھی پیچھے نہیں  
ہٹوں گی۔“ ہاشم کے چہرے پہ ملال ابھرا اور بے یقینی  
بھی۔ وہ قریب آیا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے کتنا ناقابل اعتبار  
سمجھتی ہیں شوق سے سمجھے مگر آپ کے بارے میں  
میں ایک بات جانتا ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتیں  
اور بلاوجہ کسی کے بارے میں اتنی بڑی بات نہیں کہہ  
سکتیں۔“ وہ جو بے زاری سے اس کو دیکھ رہی تھی  
قدرے چوکی چہرے کے تاثرات ذرا نرم ہوئے۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“ آواز میں البتہ وہی  
بے اعتنائی اور خشکی تھی جیسے وہ جلد از جلد ہاشم کی  
سپین سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔

”میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کہ کیا واقعی وہی ہوا تھا  
جو آپ نے پولیس سے کہا؟ کیا واقعی آپ نے فارس کو  
اعتراف جرم کرتے سنا؟“ کافی توجہ اور دھیان سے اس  
کو دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ جیسے اس کا کہا گیا ایک ایک لفظ اس  
کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہو۔

زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔  
”میں نے سب سچ کہا ہے۔ ایک ایک حرف۔“  
ہاشم نے بیٹھنے والے انداز میں ”اوکے“ کہتے ہوئے  
کالر سے نایبہ گرد بھاڑی ٹکٹ کاٹن بند کیا اور  
”تو پھر آپ مجھے ہمیشہ اپنی حمایت میں پائیں گی۔“  
کہہ کر مڑ گیا۔

زمر اس کو باہر جاتے دیکھتی رہی۔ اب بھی اس کی  
نگاہوں میں بے زاری تھی مگر اس کی شدت کم تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تو باہر کھڑا سعدی نظر آیا زمر  
کی نگاہوں میں امید سی جاگی۔ اس نے ذرا گردن اٹھا  
کے دیکھا مگر سعدی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ  
فوراً ”ہاشم کی طرف براہید سا بڑھا تھا۔ دروازہ بند ہو  
گیا۔ درمیان کارستہ رگ گیا۔ زمر نے سر پہ دلی سے  
تکیے پہ ڈال دیا۔ آنکھ کے کنارے پر ہلکی سی نمی ابھی



تھی، مگر اس نے جلدی سے انگلی کی نوک سے اسے صاف کر لیا۔ وہ بیٹھ کے رونے والوں میں سے کبھی بھی نہیں تھی۔ تو پھر آج کیوں؟ او نہ۔

”کیا آپ نے زمر سے بات کی؟“ باہر وہ بے قراری سے ہاشم سے پوچھنے لگا۔ ہاشم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا کندھا تھکا۔

”تم فکر نہ کرو ہم پولیس اسٹیشن چلتے ہیں وہ فارس کو اریسٹ کر کے وہیں لائیں گے۔“ سعدی کو جھٹکا لگا تھا۔

”کیا وہ ماموں کو اریسٹ کر لیں گے؟“

”وہ ڈسٹرکٹ پراسیکیوٹر ہے، اور وہ کہہ رہی ہے کہ اس کے اوپر فارس غازی نامی شخص نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ وہ اس کو ضرور اریسٹ کریں گے اس لیے تم فارس کے لیے معاملات بگاڑنے کے بجائے ٹھنڈے طریقے سے چیزوں کو حل کرنے کی کوشش کرو۔ آؤ“ ہاشم باہر کی طرف بڑھا تو متذبذب سا کھڑا سعدی فوراً اس کے پیچھے لڑکا۔ حنین بھی اب گوریڈور کے سرے پہ آکھڑی ہوئی تھی سوہ حنین تک رکا۔

”تم ای کو فون کر لینا“ اور ان سے کہنا، تمہارے پاس آجائیں۔“ حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹڈرے مشتبہ نظروں سے سامنے جاتے ہاشم کو دکھا جواب سعدی کے انتظار میں رک گیا تھا۔ لگا ہی ملیں، ہاشم نے ”کیسے ہو بیٹا؟“ کہہ کر گویا حال احوال کا فرض نبھایا اور جواب کا انتظار کیے بغیر سعدی کو چلنے کا اشارہ کرتا مڑا اور پھر حنین کے سامنے وہ دونوں تیز تیز باہر نکل گئے۔

حنین لب کاٹی وہاں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر زمر کے روم کے دروازے تک آئی، دستک دینے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ نے دروازے کو نہیں چھوا، اس نے ہاتھ گر ادیا۔ کسی بھی چیز کا کوئی بھی ناکدہ نہیں تھا۔ کم از کم اس کی زمر سے اتنی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ ایک بے ناکدہ گفتگو اس کے ساتھ کر سکے، ورنہ برے دل کے ساتھ واپس پلٹ گئی۔

\*\*\*

افکار پہ پیرا ہے قانون یہ شہر ہے جو صاحب عزت سے وہ شہر بدر ہوگا پولیس اسٹیشن کے اس کمرے میں ایک خالی میز پر بھی تھی اور اس کے گرد تین کرسیاں، سعدی سبے چینی سے کرسی کے کنارے ٹکا میز پر کھانا رکھے ہاتھوں میں گرائے بیٹھا تھا۔ اکیس سالہ کم عمر جڑے بے پناہ فکر مند تھی۔ ساتھ والی کرسی پہ ہاشم ٹانگ ٹانگ رکھے بیٹھا موبائل پر ہنسنے دبا سے جارہا تھا۔ وقت سے وہ نظر اٹھا کے سعدی کو بھی دیکھ لیتا۔ کبھی کبھی کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی آمیز انداز میں تھپک دیتا۔

”میں سب سنبھال لوں گا“ بے فکر رہو۔“ سعدی نے بدقت مسکراتے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت کسی بھی چیز کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کئی دہائی سے فارس غازی سے ملاقات کے لیے بیٹھے تھے مگر کوئی اسے لاپبی نہیں رہا تھا۔

باہر پھیلی سہ پہر رات میں ڈھل چکی تھی۔ سعدی اٹھ کر کمرے میں ارد گرد مستطرب بنا چکر کاٹنے لگا۔ یہ خیال کہ فارس ایک ناکرہ جرم کی پاداش میں کسی غلط فہمی کی وجہ سے حوالات میں بند ہے اور اس سے بوجھ کچھ کا سلسلہ جاری ہے اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔ ہاشم ہنوز موبائل پر ہنسنے دبا سے جارہا تھا۔

”وہتنا“ دروازہ کھٹکا، ہاشم نے کالی پرسکون انداز میں اور سعدی نے بے حد بے مالی سے اس طرف دیکھا۔ وہ الٹا فارس غازی کو لیے آ رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ سیاہ جینز پہ راؤنڈ ٹینک والی گرے شرٹ میں ملبوس جس کی آستینیں کلائی تک آتی تھیں، فارس انتہائی غصے بھری بے بسی کی سی کیفیت میں تھا۔ ابرو پیچھے تھے اور ہلکی سنہری آنکھوں میں شدید غمی تھی۔

ہاشم موبائل رکھ کر فوراً ”اٹھا“ ایک کڑی نگاہ لپکا کہ وہ ڈالے۔

”ہتھکڑی کھولو۔“ اس کا انداز اتنا سخت تھا کہ بنا

میں بار سکر زنگ لگ کر ساجو بھاری

20% EXTRA

اب سائے میں بھی۔۔۔!

20ml e Sachet

95ml e Jar

famq

HAIR REMOVAL Lotion



چوں ہزار فارس کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ فارس نے ہاتھ جھٹکے، کرسی کھینچی اور ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھا، اس کے ہاتھ پہ بھی تنگ مل تھے۔

”تم ٹھیک ہو؟“  
ہاشم مصنوعی ہمدردی سے پوچھتے ہوئے کھڑا رہا جب کہ سعدی جلدی سے آکر اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھا۔ فارس نے ایک خیکھی نظر ہاشم پہ ڈالی اور استہزائیہ سر جھٹکا جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی تمہیں ہی ہوئی ہوگی۔ ہاشم اس کی سرد مہری محسوس کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”میں بے ایس بی سے مل کر آتا ہوں، تم بات کر لو۔“ سعدی کو اشارہ کر کے وہ باہر نکل گیا۔ اب کے فارس نے ان ہی تاثرات سے اسے دیکھا۔

”کیا واقعی تمہاری پھپھو نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔ سعدی نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

”میں خود سمجھ نہیں پا رہا یہ کیا ہوا ہے! کیا آپ نے انہیں کال کی تھی؟ کیا جب آپ نے ان کو ریٹورنٹ میں بلایا تھا۔“

”میں نے انہیں کسی ریٹورنٹ میں نہیں بلایا تھا، ہو مل میں بلایا تھا، خنین تھی، اس کی وہ دوست تھی، میں نے انہیں کوئی کال نہیں کی تھی، میں سمجھ نہیں پا رہا، میڈم میرے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں، یہ سب جھوٹ ہے، بگو اس ہے!“ اس نے طیش سے کہتے ہوئے میز پہ مگنارا۔

سعدی پیچھے کو ہوا، لب کاٹتے ہوئے سوچنے لگا، اب کچھ کچھ صورت حال سمجھ میں آرہی تھی۔

”مگر انہوں نے کہا، آپ نے انہیں کال کر کے کہا ہے کہ آپ نے ہی وارنٹ غازی کا قتل کیا ہے اور یہ بھی کہ۔“ سعدی رکا اسے وہ تمام تکلیف دہ الفاظ یاد تھے جو زمر نے اس کے سامنے آفیسر کو بتائے تھے۔

”اور یہ کہ میں تمہیں صرف ایک گولی ماروں گا زمر“ اور اس طرح کی ہمت ساری باتیں۔“

وہ واقعی دہرا نہیں پا رہا تھا، اسے شرمندگی ہو رہی تھی، آخر زمر اس قسم کی بات کیسے کر سکتی تھیں۔

”میں میڈم سے ایسی بات کیوں کروں گا؟ میرے پاس دو گواہ ہیں خنین اور علیشا، ہم سارا وقت ایک ساتھ رہے، میں نے کسی سے ایسی کوئی بات نہیں کی اور میں اس کو کیسے گولی مار سکتا ہوں؟ میرے پاس تو اس وقت کوئی گمن بھی نہیں تھی۔“

”مگر جو گولی پھپھو کو ماری گئی تھی وہ علیشا کے کمرے کے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی سے ماری گئی اور جب پولیس نے وہاں پر چھلکا مارا تو وہاں موجود گمن آپ کی تھی، اس پر آپ کے فنگر پر شس تھے، یہ وہی امریکن گمن تھی جو آپ نے بلک میں پشاور سے خریدی تھی۔ اور آپ کے نشان گنے گلاس اور کٹری بھی وہاں سے قبضے میں لی گئی ہے۔ فنگر پر شس کے رزلٹ آگئے ہیں، وہ کمرو بھی آپ کے نام تک تھا اور ہو مل کے اس فلور کے سی سی ٹی وی کیمرے بھی خراب تھے، سو آپ علیشا کے کمرے میں گئے یا وہ کمرے کے کمرے میں کوئی ثبوت نہیں ہے اور اس پہ مستزاد، زمر کا یہ بیان، میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا، آخر ہو کیا رہا ہے فارس ماموں؟“

وہ ہاشم کی بتائی گئی معلومات جو عین زمر کے بیان کے بعد منظر عام پہ لائی گئی تھیں، دہرا ناگیا۔ آخر میں اس کی بے بسی بھی جیسے پرہی میں بدلنے لگی۔ ہاشم واپس آگیا تھا اور اب خاموشی سے کرسی پہ بیٹھا تھا۔

فارس نے اب کے غور سے اس کا چہرہ دیکھا، ”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں، میں بگو اس کر رہا ہوں، ہاں!“

”میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ نے پھپھو کو کال کی تھی؟“

”میں نے کسی کو کوئی کال نہیں کی۔ میں میڈم سے ایسی بات کیسے کر سکتا ہوں کہ میں انہیں گولی مارنے والا ہوں، اربش! گولی مارنے سے پہلے کون جانتا ہے؟“

اس نے اشتعال سے سر جھٹکا، جیسے بس نہ چل رہا ہو اس میز کو اٹھا کر سعدی کے اوپر دے مارے۔

سعدی اک دم رک کر اسے دیکھنے لگا۔ اجنبی عجیب نظروں سے۔

”میڈم کون؟“

”تمہاری پھپھو اور کون؟“ فارس اکھڑا کھڑا سا بولا۔

”آپ زمر کو میڈم کہتے ہیں رائٹ؟“ اس کے ذہن میں جیسے الارم بج رہا تھا۔ قدرے پر جوش سا ہو کر وہ آگے کو ہوا۔

”لیکن زمر نے جو بیان دیا ہے اس میں انہوں نے بتایا کہ آپ نے انہیں ”زمر“ کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ مگر آپ کبھی پھپھو کا نام نہیں لیتے، مجھے یاد ہے، آپ ہمیشہ ان کو میڈم کہتے تھے۔“

”اوہ ڈیم!“ ہاشم نے کراہ کر گویا آنکھیں بند کیں۔ اسکرپٹ لکھنے میں ذرا سی غلطی کتنی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی؟

فارس نے ہلکے سے شانے اچکائے۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ ابھی تک سعدی کی بات کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

سعدی تیزی سے کھڑا ہوا۔ ”میں جانتا ہوں آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں آپ نے واقعی انہیں کوئی کال نہیں کی۔ آپ فکر مت کریں۔“

اس نے تسلی دینے والے انداز میں فارس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ہاشم بھی اٹھ کھڑا ہوا، ”میں باہر انتظار کر رہا ہوں تمہارا!“ اور باہر نکل گیا۔

”ہاشم بھائی آپ کو بہت جلد یہاں سے نکال لیں گے۔“

”ہاں“ فارس نے استہزائیہ سر جھٹکا، ”ہاشم اور میرے لیے کوشش کرے گا، کبھی بھی نہیں! وہ جو کر رہا ہے وہ بھی صرف دکھاوے کے لیے ہے۔ میں اس کو جانتا ہوں، اپنا مطلب نہ ہو تو وہ کسی کی مدد نہیں کرتا۔“ سعدی نے متعجب سا ہو کر اسے دیکھا۔

”وہ ان پہلے لوگوں میں تھے جنہوں نے آپ کی بے رحمی پہ یقین کیا تھا، کم از کم ان کے بارے میں آپ کو اتنا منفی نہیں ہونا چاہیے۔ آپ تسلی رکھیں، ہاشم

بھائی آپ کو بہت جلد رہا کر دالیں گے۔“

فارس شاکی سا کچھ بیڑا کر چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں پچھلے چند دن سے چھایا ملال اور کرب اب شدید غصے میں ڈھل رہا تھا۔ آخر زمر نے اس پر اتنا برا الزام کیا سوچ کر لگایا ہے، لودا اچھی طرح جانتی تھی کہ فارس قتل نہیں کر سکتا، یا شاید وہ کسی اور کی جگہ اس کا نام لے رہی تھی، شاید وہ کسی اور کو کور کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس نے سر جھٹکا۔ سعدی اب باہر جا رہا تھا اسے جلد از جلد پھپھو سے ملنا تھا۔

جب رات کے پردے سے پھر رات نکل آئے اس وقت کدھر جائے، جو اکل نظر ہو گا ہسپتال کے کمرے میں دیوی دوائیوں کی بو پھیلی تھی، زمر بدستور اسی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی دیران لگا ہیں چھت پر تھیں۔ ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ سعدی جب اندر آیا تو دیکھا، زمر کا چہرہ پہلے سے بہت زیادہ مر جھلایا ہوا، اور رنگت ہلدی کی مانند لگ رہی تھی۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل مزید ٹوٹ گیا، قریب آیا، زمر نے چونک کر اسے دیکھا، وہ مسکرائی، نہیں مگر کوئی امید سی اس کی آنکھوں میں چمکی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے دو لفظی استفسار کیا۔

”پولیس نے ماموں کو گرفتار کر لیا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے زمر کے تاثرات دیکھے۔ زمر کی آنکھوں میں کرب اترا اور ساتھ ہی گردن میں ابھر کر ڈوبتی گلتی سی نظر آئی۔ سعدی مزید قریب آیا، یہاں تک کہ اس کے کندھے کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ زمر اب نگاہیں پوری اٹھا کر اس کو دیکھ رہی تھی۔

”سعدی! اس نے مجھ پر گولی چلائی، میں نے خود سنا۔ تمہیں مجھ پہ یقین ہے نا؟“

چند گھنٹے پہلے پولیس آفیسرز کے سامنے سپاٹ، سنجیدہ اور مضبوط سی پراسیکیوٹر اب بہت کمزور لگ رہی تھی، اس کے انداز میں بے بسی بھی تھی، خوف بھی، مگر ہی کے جالے کا سامان تھا معلوم نہیں کب ٹوٹ



جاتا۔ سعدی نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔  
 "فارس غازی نے آپ سے کیا کہا تھا فون؟"  
 "اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے صرف ایک گولی مارے گا۔"

"نہیں، مجھے ان کے الفاظ بتائیے، ایک ایک لفظ۔"

زمر کی آنکھوں میں چمکتی امید مزید گہری ہوئی،  
 مگر شہزادے کے جانے کا سامان مضبوط ہوا۔ وہ پہلے سے زیادہ  
 پر اعتماد ہو کر رہی۔

"اس نے کہا میں صرف تمہیں ایک گولی ماروں گا  
 زمر! میں لو۔"

"مگر فارس غازی نے آپ کو کبھی آپ کے نام سے  
 نہیں پکارا، وہ ہمیشہ آپ کو میڈم کہتے تھے۔"

وہ ایک دم بالکل رک کر رنجب سے اسے دیکھنے  
 لگی۔

"فارس غازی نے آپ کو کوئی کال نہیں کی تھی،  
 آپ کو فارس نے گولی نہیں ماری تھی، ان کو سیٹ اپ  
 کیا گیا ہے۔ کچھ تو ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔ پلیز مجھے  
 سب کچھ بتائیے، ایک ایک بات۔"

زمر بالکل متحیر سی اس کو دیکھ گئی، ہنا پک چھپکے  
 جیسے سانس تک رک گیا ہو۔

"سعدی! تم کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی  
 ہوں؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔"  
 "صرف اس بنیاد پر کہ وہ مجھے میرے نام سے نہیں  
 پکارتا تھا! اس نے گولی بھی تو مجھ پر پہلی دفعہ ہی چلائی  
 تھی بہت ساری چیزیں پسلی باری ہوئی ہیں۔"

"وہ جھوٹ نہیں بول رہے انہوں نے آپ کو کوئی  
 کال نہیں کی۔ آپ بتائیں، کچھ ہے جو آپ چھپا رہی  
 ہیں۔ آپ وارث ناموں کے ٹارگٹ کیس کی فائلز نگلوا  
 رہی تھیں۔ کیا آپ کسی کو کر رہی ہیں؟ کیا کوئی  
 آپ کو یہ سب کہنے پر مجبور کر رہا ہے؟" یہ خدشہ ہاشم  
 نے راستے میں ظاہر کیا تھا مگر سعدی  
 کے ذہن میں اس نے جڑ پکڑ لی۔

زمر کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا تھا۔ اس کی  
 آنکھوں میں گلابی سی نمی اتری۔ لب بچھڑ گئے۔  
 "تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں جھوٹ بول رہی  
 ہوں۔"

"زمر! آپ مجھے سب کچھ سچ سچ کیوں نہیں بتاتیں؟  
 اس کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے سعدی! وہ کیا تکلیف ہے جو  
 میں نے پچھلے کچھ دنوں میں سہی ہے؟ میرے گردے  
 ضائع ہو گئے ہیں، میرا باپ مفلوج ہو گیا ہے، میری  
 زندگی کی ساری امیدیں ٹوٹ گئی ہیں، میں کبھی مارل  
 نہیں ہو سکوں گی، ایسے وقت میں بھی تمہیں لگ رہا  
 ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں، تمہیں فارس زیادہ  
 قابل اعتبار لگ رہا ہے! کیا تم مجھے نہیں جانتے؟" وہ  
 متحیر بے یقین تھی۔

"میں آپ کو جانتا ہوں، اسی لیے کہہ رہا ہوں آپ  
 کوئی بات مجھے نہیں بتا رہی ہیں، آپ کچھ چھپا رہی ہیں،  
 کہیں نہ کہیں کچھ غلط ہے۔ علیشہ کہہ رہی ہے،  
 جنہیں کہہ رہی ہے، ناموں ان کے ساتھ تھے، انہوں  
 نے کوئی کال نہیں کی، وہ تین لوگ جھوٹ نہیں بول  
 رہے، وہ ناراضی سے اسے دیکھ کر تیزی سے بولا۔

زمر کے ابرو غصے سے اکٹھے ہوئے۔ اس نے  
 کہنیوں کے بل قدرے اٹھنے کی کوشش کی۔

"ہاں ٹھیک ہے، وہ سب سچ بول رہے ہیں، ایک  
 میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تمہیں نہیں کرنا میرا اعتبار  
 مت کرو۔ لیکن میں دنیا کی ہر عدالت میں جا کر اس  
 کے خلاف گواہی دوں گی۔ میں پوری دنیا کو بتاؤں گی کہ  
 کس طرح اس نے میرے اوپر گولی چلائی، اپنی بیوی کو  
 مارا، اپنے بھائی کو مارا، میری زندگی برباد کر دی۔"

سعدی نے غصے سے مٹھیاں بچھڑ لیں۔  
 "آپ کو پتا ہے؟ آپ کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے  
 زمر! جب آپ کے دل کی سوئی ایک بات پہ اٹک  
 جاتی ہے تو پھر وہ وہاں سے نہیں ہٹ سکتی، آپ اس  
 کے آگے پیچھے ہر قسم کی سوچ کا دروازہ خود پھندہ گردی  
 ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے؟ تمہیں میرے سچ بولنے میں شک  
 ہے؟" وہ بے یقینی سے غرائی تھی۔

"لیکن زمر! میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ کوئی  
 تیسری چیز بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کیوں ٹھنڈے دل  
 سے اس بات پہ نہیں سوچتیں۔ ایک دفعہ فارس غازی  
 کو بے گناہ تصور کر کے سوچیں۔ ہو سکتا ہے کسی نے  
 انہیں پھنسا دیا ہو۔ یہ سب ایک سیٹ اپ ہو اور کچھ  
 بھی نہ ہو۔ آپ ایک دفعہ۔ صرف ایک دفعہ اپنے  
 مفروضات کو پیچھے کیوں نہیں کر لیتیں؟ اگر واقعی آپ  
 کسی کے دباؤ میں نہیں ہیں تو۔"

"مفروضات!" وہ چلائی تھی، "میں کتنی دفعہ کہہ  
 چکی ہوں میں نے اس کی آواز سنی ہے، اس کا فون آیا  
 تھا مجھے، اس نے مجھے گولی چلائی، میں فارس کی آواز کو  
 پہچانتی ہوں، میں جانتی ہوں وہ فارس ہی تھا۔ ہر چیز کی  
 مینس بنتی ہے سوائے اس کے کہ تم میری بات سننا  
 نہیں چاہتے، تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ ٹھیک ہے  
 سعدی! امت کرو مجھ پر اعتبار لیکن ایک وقت آئے گا  
 جب عدالت اس کو سزا سنائے گی اور جب وہ مجرم ثابت  
 ہو گا اور وہ خود اعتراف جرم کرے گا۔ تب میں تم سب  
 کے چہرے دیکھنا چاہوں گی۔ تم، جنہیں 'بھالی' کوئی بھی  
 میری بات پہ یقین نہیں کر رہا۔ میں جانتی ہوں، لیکن  
 تم لوگ دیکھو گے، ضرور دیکھو گے!"

تیز تیز بول کر وہ ہانپنے لگی تھی۔ سر تکیہ پہ گرایا۔  
 سعدی خفگی سے پیچھے ہون۔

"ایک ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے آپ کا۔ آپ  
 کسی دوسرے کی کوئی بات سمجھتی نہیں ہیں۔ آپ  
 سمجھنے کے لیے بات نہیں سنتیں، آپ جواب دینے  
 کے لیے بات سنتی ہیں، آپ اپنے خیالات میں اتنی  
 فکسڈ ہو جاتی ہیں کہ آپ کسی نے تصور کے لیے اپنا  
 ذہن کھلا نہیں رکھتیں۔ آپ کو خود بھی پتا ہے کہ آپ  
 غلط کہہ رہی ہیں مگر۔" اور زمر کے لیے یہ بہت تھا۔

"نکل جاؤ میرے کمرے سے! ابھی اور اسی وقت  
 یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے تم سے  
 کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے چلاتے ہوئے بازو اٹھا

کر کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ سعدی بھی غصے  
 سے کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنی ضدی کیوں ہو رہی  
 تھی۔ وہ اس کی بات کیوں نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

"آپ کو صرف اس بات کا غصہ ہے کہ میں نے  
 آپ کو یہ کیس لینے کے لیے کیوں کہا۔ یہ کہ اس کیس  
 کی وجہ سے آپ کی شادی ڈیلے ہو رہی تھی۔ آپ  
 اس کیس کا غصہ فارس ناموں پہ نکال رہی ہیں اور کوئی  
 بات نہیں ہے۔ آپ ایک دفعہ پھر وہی کر رہی ہیں۔  
 ان کی بیوی کا قتل ہوا ہے، کن کے بھائی کا قتل ہوا ہے،  
 ہمارا خاندان تباہ ہو چکا ہے اور آپ اپنی ضد کو لے کر  
 بیٹھی ہوئی ہیں۔ زمر! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟"

"نکل جاؤ میرے کمرے سے اور دوبارہ مت آنا۔  
 میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی اس وقت۔ جاؤ  
 سعدی! وہ زور سے چلائی۔

(بالی آئینہ مار)

خواتین ڈائجسٹ  
 کی طرف سے جنموں کے لیے ایک اور ناول

دیکھ زور محبت

قیمت - 300 روپے

صائمہ کنچہ چوہدری

مکتبہ امداد

32735021

205

204



عفت سحر طاہر

# دین مکی کا

امتیاز احمد اور - فیمنہ کے تین بچے ہیں - نعمین، زار اور امیر۔ صالہ، امتیاز احمد کی بچپن کی بھینس تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالہ دراصل ایک شوخ، الٹری لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور انداز کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالہ ان کی مصلحت پسندی، خرم طبیعت اور اعتدال کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً "صالہ نے امتیاز احمد سے محبت کے بارے میں بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دورے گزرنے مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالہ، امتیاز احمد کے دل میں بسی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالہ کو غلام کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالہ، اچھی بیٹی ابیہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڑے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پارلیمنٹ پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ خواہ پر دو سری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو انتقال سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالہ کو امتیاز احمد کا وزٹنگ کارڈ لے کر دیتی ہے۔ اسے دیکھنے پر اس محفوظ کر لیتی ہے۔ ابیہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور برائے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ابیہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً "آ جاتے ہیں اور ابیہا سے نکاح کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا میٹامعینز احمد باب کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد، ابیہا کو کارٹم میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی



copied From Web





دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔

معبیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معبیز اسے بے عزت کر کے گھٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی مندر باب ابیہا کی کانٹیلو ہے۔ وہ تقریر کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کر کے ان سے پیسے بنور کر لیا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب معبیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایک سبڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معبیز احمد کی گاڑی سے نکلانی تھی کیونکہ معبیز اپنے دوست عین کو آگے کر دیتا ہے۔ ایک سبڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس نہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات اور گریپاٹی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو نوٹوں کی بے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں، ندر زبردستی کر کے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر بخشتی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معبیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار تر کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید سخت پاہوتی ہیں۔ معبیز ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معبیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔

عون معبیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو جلسے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی لڑکی اور با اعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔

میم ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے جہاں معبیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے بکسر مختلف انداز جلسے پر اسے پہچان سیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک اچھے عمر آدمی کو بلا وجہ بے تکلف ہونے پر ٹھیسر مار دیتی ہے۔ جواباً سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار پھپر جڑ دیتا ہے۔ عون اور معبیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معبیز کی گاڑی سے ایک سبڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ پتہ جان کر معبیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتی ہے یا تھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کہ آجانے سے اسے اپنی ادھوری چھوٹی بڑی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معبیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معبیز احمد ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور میم اسے اپنا رانا راز کھولنا پڑتا ہے۔

وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے مگر وہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعمنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معبیز احمد سے طے کر دیتی ہے مگر معبیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوی یاد کر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا ثانیہ کو نوٹوں

کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوی بار بار رچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم حنا کو بیوی بار بار بھیج دیتی ہے مگر ثانیہ ابیہا کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معبیز اسے اپنے گھر انیسویں میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معبیز سمیت زارا اور ابراہیم سنجانے کی کوشش کرتے ہیں۔ معبیز احمد اسے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے کر آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آئی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کر کے شرمندہ کرتی ہے۔ عون ٹاڈم ہو کر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معبیز احمد برلن کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

## پتلہ سہیں قندل

ابیہا تو مڑ کر دیکھنے پر پتھر بنی ہی تھی۔ اندر داخل ہوتی رباب کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ ابیہا مراد اس گھر میں ہو سکتی ہے۔

دلینا "حواس میں لوٹے ہوئے ابیہا جلدی سے نذیراں کے پیچھے لپک کر دروازہ کھلیتی اندر چلی گئی۔

"آئی ڈونٹ بلو دس۔" رباب جو اپنی جگہ ٹھک گئی تھی۔ بڑبڑاتی اور سن گلا سزاوول پہ انکالی تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔

ازھر اندر داخل ہوتے ہی لاؤنچ میں براجمان سفینہ بیگم نے ابیہا کو آگے ہاتھوں لیا تھا۔

"کیا اذھکو سلے بازیاں کر رہی ہو تم۔ ذرا سا کام کیا نہیں اور بسترہ جالیش۔"

وہ اس پر گرجیں۔ ان کا پڑا گرام لمبا ہی تھا مگر زارا اقبال بوخیزاں اپنے کمرے سے باہر آئی۔

"ماما پلیز۔ رباب آئی ہے باہر۔ اس معاملے کوئی الحال رفع دفع کریں۔" زارا اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھ کر آئی تھی۔ اس نے بوجھلت کہتے ہوئے کوریڈور کی طرف قدم بڑھائے۔

"کچن میں جاؤ اور اچھی سی چائے کا اہتمام کر کے لاؤ مہمان کے لیے باقی کا معاملہ میں بعد میں پٹاؤں گی تم دونوں کے ساتھ۔ چھوٹوں کی تو نہیں میں بھی۔"

سفینہ نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نذیراں کو بھی ساتھ گھورتے ہوئے کرفٹلی سے آرڈر دیا تو وہ دونوں جلدی سے منظر سے ہٹ گئیں۔

"لو جی تسال دے تال مینوں خوا مخواہ پیسے جارہے ہیں بیگم صاب۔" نذیراں کا موڈ سخت آف تھا۔ کچن میں آتے ہی اس نے ابیہا پر اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو وہ برا فردختہ ہونے لگی۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

"میں تال تسال دے ساتھ دین دی گناہگار ہاں بس۔" اسے اپنی نوکری جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ بیچ کر ساس

چین جو لمبے پر رکھا اور آگ جلانے لگی۔ بخار سے ابھی ابھی اٹھنے والی ابیہا کا سر چکرانے لگا تو لڑکھڑا کر کرسی کا ہمارا لے لیا۔

نذیراں نے بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ دل کی اچھی تھی اس کی زرد پڑتی رنگت دیکھ کر فوراً آگے بڑھی اور اسے پکڑ کر ڈانٹنگ قبیل کی کرسی پر بٹھا دیا۔

بیگم صاب توں ہن کون سمجھائے۔ پتا نہیں کس گل دا غصہ اے اوں نوں۔" نذیراں بڑبڑاتے ہوئے چائے پلانے لگی۔





# واشنگ مشین کے لئے سویاں صوفی سوپ

اجلی دھلائی کی سچی طاقت



U.A.N. 177-100-786  
www.rspk.com  
info@rspk.com

اس دوران رباب نے زار اکا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔  
”بے وقت تو نہیں آگئی میں۔ کوئی گیسٹ آئے ہوئے ہیں؟“ رباب نے مٹلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں، نہیں گیسٹ تو کوئی بھی نہیں آیا۔“ زار نے چرائی سے کہتے ہوئے اسے بیٹھے کا اشارہ کیا۔  
وہ صوفے پر بڑے انداز سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ایہا کو اندر آتے دیکھا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ نظر انداز کر دیتی۔  
مگر اس نے ایہا مراد کو دیکھا تھا۔ جو کبھی کالج میں اس کی حریف رہی تھی۔  
”نہیں یاد! ابھی میں نے ایہا مراد کو اندر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا۔ کالج میں میرے ساتھ پڑھتی تھی۔“

رباب نے صاف گوئی سے کہا تو سفینہ بیگم جو نکلیں مگر زار اتو دھک سے رہ گئی۔ اس نے بے اختیار ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن نے تیزی سے کام کیا تھا، سفینہ بیگم کی زبان حرکت میں آتی تو جانے کیا کچھ کہہ دالتیں۔ ان سے پہلے زار اکو بات سنبھالنا تھی۔

”ارے وہ۔ وہ تو میں نے تمہیں بتایا تھا نا عون بھائی کی کزن ہے دو پار کی۔ تو۔۔ بے چاری کے والدین نہیں تھے۔ ضرورت مند تھے تو ہماری انیکسی میں۔۔۔ وہ رہی ہے۔“ وہ بوجھت بولی اور ساتھ ہی مسکرائے کی بھی کوشش کی۔

”اود۔۔۔ آئی سی۔“ رباب کے ہونٹوں پر محظوظ سی مسکراہٹ پھیلی۔ سفینہ بیگم نے اپنی تیوری کے بل مشکل سے کنٹرول میں کیے تھے۔  
”مگر وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔۔۔ ابھی میں نے اسے آتے دیکھا تھا؟“ رباب نے دل کے تجسس کو زبان سے دی۔

زار نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر اس سے پہلے ہی سفینہ بیگم بول اٹھیں۔

”وہ میں تمہیں بتاتی ہوں بیٹا۔“  
زار نے ہول کراں کا سنجیدہ چہرہ دکھا کر رباب بھی ان ہی کی طرف متوجہ تھی۔

\*\*\*

غصہ، ٹینشن اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی، ثانیہ کے داغ کی نیس پھٹنے لگیں۔ اچھی بھلی سمجھ دار لڑکی، جذباتیت کا شکار ہو چکی تھی۔

رات ارم دیر سے کمرے میں آئی۔ ثانیہ کسل میں منہ سر لیٹے پڑی رہی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ارم کی شکل بھی دیکھے۔ عون سے اس کے تعلقات یہاں آنے سے پہلے بھی کچھ خاص قابل ذکر نہ تھے مگر یہاں آنے کے بعد تو اور خراب ہوئی تھی۔

”اچھا ہے۔ یہاں سے ثبوت لے کے لوٹوں گی تو سب کو یقین آئے گا کہ ثانیہ سچی تھی۔“ وہ کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی۔

اور اس ذہنی بوجھ نے اگلے دن اسے حرارت میں مبتلا کر دیا۔ وہ کافی دیر تک نہیں اٹھی تو نلیم خود اسے جگانے چلی آئی۔ اس کی آواز پر ثانیہ جاگ تو گئی مگر یونی کسلنڈی سے پڑی رہی۔



”آجائیں نا۔ مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ناؤ آلی کے ساتھ آخری ناشتہ۔“ نلیم خود ہی کہہ کر اُٹھی۔  
 ”لگتا ہے مجھے بخار ہو گیا ہے۔“ ثانیہ نے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اظہارِ دلی تو نلیم نے بے ساختہ اس کے ماتھے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔

”ہاں۔۔۔ واقعی۔ آپ اٹھ کے منہ ہاتھ دھولیں۔ میں آپ کا ناشتہ بیس لے آتی ہوں اور ساتھ میں کوئی ٹیبلٹ بھی۔“ نلیم نے پیار سے کہا تھا۔  
 ”ناشتہ نہیں صرف چائے۔“ ثانیہ نے ٹوکا۔

”اونٹوں سے خالی پیٹ چائے نہیں کی؟ میڈیسن بھی لینی ہے تو چائے کے ساتھ دوسرے لے لیں۔“ نلیم نے قطعیت سے کہا تو ثانیہ نے آنکھیں موند لیں۔ نلیم نے جاچتی نظروں سے ثانیہ کو دیکھا۔  
 ”جب آپ آئی تھیں تو بڑی فریٹش اور زندہ دل تھیں۔ اب تو بڑی ڈل سی ہو گئی ہیں۔“

ثانیہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ نلیم کے چہرے پر محکمی تھی ارم جیسی مطلب پرستی اور خود پسندی کا نشان تسمہ تھا۔

”اگر آپ ماسٹرنہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟“ نلیم نے ہتھکنٹے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ پوچھو۔“ ثانیہ ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

”آپ کی عون بھائی سے رات کے فنکشن میں لڑائی ہوئی ہے؟“ نلیم نے جو پوچھا وہ ثانیہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس کی مسکراہٹ سنی۔

”ارم نے تفصیل بتادی تھی مجھے۔“

نلیم کو پتا تھا کہ وہ کھل کے بات نہیں کرے گی اس نے محتاط لفظوں میں کہا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ ارم نے رات سب کے درمیان بیٹھ کر کس طرح مذاق اڑاتے ہوئے ثانیہ کی عون سے بدتمیزی کا واقعہ سنایا تھا اور مائی جان نے ثانیہ کے لیے کتنے ہنگ آمیز الفاظ استعمال کیے تھے جن سے ارم کو اور شہرہ ملی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو عون بھائی سے مسئلہ کیا ہے۔ آئی میں وہ اتنے کیڑنگ ہیں۔“ نلیم سنجیدہ تھی۔

ثانیہ نے تولتی نظروں سے اسے دیکھا۔ جس انداز میں نلیم نے بات شروع کی تھی اس کے بعد ثانیہ اسے پتہ چلی کہ کربات ٹال نہیں سکتی تھی۔

”وہ اس رشتے پر راضی نہیں تھا نلیم۔“ ثانیہ نے تپتے ہوئے تاثرات کے ساتھ کہا۔

”مگر پھر وہ راضی ہو گئے تھے آپ۔“ نلیم بے ساختہ بولی۔

”ہاں ہو گیا تھا راضی۔ میری عزت نفس کو روکنے کے بعد۔“ ثانیہ نے استغناء سے کہا۔

”وہ آپ کے شوہر ہیں، مگتیر نہیں ہیں آپ! کہ جن کی ذرا سی بات کو دل پہ لے کر آپ رشتہ توڑنے کا سوچنے لگیں۔“

”اس نے مجھ سے شادی توڑ کر ارم سے شادی کرنے کا کہا تھا یہ بات تمہیں پتا نہیں ہے شاید۔“ ثانیہ نے تلخی سے اسے باور کرایا۔

”وہ واقعہ تو سب ہی نے سنا ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جلد بازی میں عون بھائی سے غلطی ہو گئی مگر پھر انہیں فوراً ہی اپنی اس جلد بازی میں کی گئی غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ اور میرے خیال میں انہوں نے آپ سے سوری کہہ دیا ہو گا۔“ نلیم نے ہلکے پھلکے انداز میں گویا بات ہی ختم کر دی۔ ثانیہ تو زب ہی اٹھی۔

”ہر غلطی کا دوا سوری کہنے سے نہیں ہو جاتا۔“  
 ”مگر میری سوچ کچھ اور کہتی ہے آلی۔ غلطی کر کے ڈھٹائی سے اس پہ جسے مناسب سے بڑی غلطی ہے۔ مگر غلطی کا احساس ہوتے ہی جو جھک کر غلطی کا اعتراف کر لے تو میرے خیال میں اسے معاف کرنے میں تو ایک منٹ بھی نہیں لگانا چاہیے۔“

”اس نے میری انا میری عزت نفس کو نہیں پہنچائی ہے نلیم۔“

”اور وہ جانتے عرصے سے اپنی انا اور عزت نفس کے سر پہ پاؤں رکھے آپ کا دل صاف کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اس کا کیا؟ آپ کو ان کے انداز سے لگتا ہے کہ ان کا ارم سے الٹو رہا ہو گا؟“

نلیم نے سنجیدگی سے سوال کیا تو وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں اسے دیکھنے لگی۔

”مرد اسی عورت کے پیچھے بار بار اور لگا تار جاتا ہے جو اس کے دل میں اتر جاتی ہے آلی سے اور ایک بار ”دل میں“ اترنے کے بعد مرد کے ”دل سے“ اتر جاتا ہے اس سے برا تو دنیا میں اور کوئی نقصان ہی نہیں۔“

نلیم یقیناً ”دل سے اس کے ساتھ مخلص تھی۔ ورنہ اس وقت جب کہ ثانیہ بھد شوق اپنی نیا آپ ڈوبنے کی کوشش میں تھی وہ بھی دوسروں کے ساتھ جا کھڑی ہوتی۔ مگر واقعی ثانیہ کو تباہی سے بچانا چاہتی تھی۔ نلیم اٹھ

کھڑی ہوئی۔

”عون بھائی آپ کے ہیں اور آپ ہی کے رہیں گے مگر آپ اپنی آنکھوں پر سے بدگمانی کی پٹی اتار دیں گی تو“

نلیم اسی سنجیدگی سے کہتے ہوئے رکی۔  
 ”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلہ ہو یا جذباتی۔ اس ”درمیان“ کو شیطان بڑے جلوں اور دوسو سوں سے پر کرتا ہے۔“

ثانیہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ نلیم نے ہلکی سی سانس اندر کھینچی پھر نرمی سے بولی۔  
 ”آپ فریٹش ہو جائیں۔ میں آپ کے لیے ناشتہ اور میڈیسن لاتی ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد بھی کتنی ہی دیر ثانیہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔ ذہن میں چلتے چھٹکتے اس کی سوچ کو کسی ایک بھی نقطے پر مرکب نہ ہونے نہیں دے رہے تھے۔

مگر یہ تو طے تھا کہ نلیم نے راکھ کریدی تو اندر سے راکھ کا سینہ ابھی بھی سلگتا ہوا تھا۔

\*\*\*

نذیراں چائے کی ٹالی دھکیلتی ہوئی چلی آئی تو بات ہی میں رہ گئی۔  
 ”ایسا کہاں ہے۔ اسے کہا تھا میں نے چائے لائے کو۔“

سفینہ بیگم نے ٹکمانہ انداز میں کہا۔  
 ”اوس دی تے طبیعت خراب اے بیگم صاب۔“ نذیراں نے ادب سے عرض کیا۔

”تم دونوں کی طبیعت تو میں ٹھیک کروں گی بعد میں۔ بلاؤ اسے۔“ سفینہ بیگم نے دانت کچکچا کر کہا۔  
 انہیں تو رات سے ایسا پر غصہ تھا۔ نذیراں بھاگ کر گئی اور ایسا کو بلا لائی۔

”کیا بات ہے۔ تمہارے بڑے خیرے ہو گئے ہیں۔ اول روز سے تمہاری ڈوبی سمجھادی تھی تمہیں۔ کامیوے کے ویسے پڑے ہیں اور محترمہ سیرس کرتی پھر رہی ہیں گاڑیوں میں۔“ سفینہ بیگم گرجیں۔



ایہا سے نظر نہیں اٹھائی گئی۔ وہ بنا دیکھے بھی بتا سکتی تھی کہ رباب اس وقت مسکرا رہی ہوگی۔  
 ”کیا مطلب آئی۔ کیا ڈیوٹی ہے اس کی؟“ رباب کی حیرت زدہ آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ زارا نے  
 تنبیہی نظروں سے اس کو دیکھا۔ اسے رباب کے سامنے ایہا کی کوٹھالی پسند نہیں آ رہی تھی۔  
 ”کام کرتی ہے ہمارے گھر کا۔ نذراں کے ساتھ مل کر۔“ سفینہ بیگم نے اطمینان سے رباب کو اس کا  
 ”ریٹک“ بتایا۔ تو وہ بے اختیار سیدھی ہو بیٹھی۔ ایہا کو دیکھا جس کی رنگت میں زردی سی گھل گئی تھی اس کے  
 دونوں ہاتھوں نے صوفے کی پشت کو دو بوج رکھا تھا۔  
 وہ شرمسار تھی۔ یا شرم سے مر جانے کو۔  
 ”یوٹن۔ نوکرائی ہے آپ کی؟“

رباب نے سراسر حیرانی کی ایکٹنگ کی۔ سفینہ بیگم سے کنفرم کیا تو انہوں نے تقاضا نہ کیا۔ ثبات میں سر ہلایا۔  
 ”چہ۔ چہ اور اس“ جب اس کے لیے تم کالج میں میرے مقابلے پر آئی تھیں۔ یہ تھا ایک پوزیشن ہولڈر کا  
 مستقبل۔ اس نے استیغنا سے نظروں سے ایہا کو دیکھتے ہوئے ”بھائے“ چھوٹے شروع کیے۔  
 وہ زمین میں گر رہی تھی۔ مگر گڑنا نہیں چاہتی تھی۔ تب ہی آنسو پیتے ہوئے بڑی اہمیت کے ساتھ پھیکے لہجے میں  
 بولی۔

”بد نصیبی ڈگریاں دیکھ کر نہیں آیا کرتی رباب! اور نہ ہی ہر خوش نصیبی پوزیشن ہولڈرز کا مستقبل بنتی ہے۔  
 یہ تو نصیب بلکہ بڑے ہی نصیب کی بات ہوتی ہے۔“  
 ”اچھا اچھا۔ اب یہ فلسفہ لپیٹو اور رباب کے لیے چائے بناؤ۔“ سفینہ بیگم اسے اچھی طرح ذلیل کرنا چاہتی  
 تھیں۔

وہ چائے پیالیوں میں نکال رہی تھی جب معیذ احمد اندر داخل ہوا اور اس نے اونچی آواز میں سلام کیا۔ ایہا کا  
 ہاتھ لرزا اور چائے برچ میں گری۔  
 ایہا نے چائے کی پیالی رباب کی طرف بڑھائی۔ معیذ اس کی پشت کی طرف کھڑا تھا۔ ایہا کو پہچان نہیں  
 پایا۔ بڑے فریض انداز میں رباب سے بولا۔

”میں نے کہا تھا میں راستے سے پک کر لوں گا شہیں دس منٹ پیش تو کرتیں۔“  
 ”آئی نو۔ یو آر سو کیئرنگ معیذ۔ لیکن میں بہت نزدیک آئی ہوئی تھی اور پھر گاڑی بھی تھی میرے پاس۔“  
 بڑی خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔  
 ”اوکے ٹیکسٹ ٹائم۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ایہا کو اس کی آواز سے اندازہ ہوا۔ اسے اپنے ہاتھ پاؤں لرزے  
 محسوس ہونے لگے۔

”بھئی مجھے آپ کی کاموائی بہت پسند آئی ہے معیذ۔“ رباب کی اگلی بات نے جہاں ایہا کا حلق خشک کیا وہیں  
 معیذ بھی چونکا۔

”تو تیری بڑھی لکھی بلکہ پوزیشن ہولڈر کاموائی کہاں ملتی ہے آج کل۔“ وہ محظوظ ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
 سفینہ بیگم کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ تر بھی لگا ہوں سے معیذ کے تاثرات بھی دیکھ  
 رہی تھیں۔ ایہا نے خاموش بیٹھی زارا کو چائے تھمالی اور پلٹی تب معیذ نے اسے دیکھا اور لمحہ بھر کو سُن ہو گیا۔  
 ”کیا پے کرتی ہیں مبینے کا آئی؟“ رباب لطف لے رہی تھی۔ یہ وہ کینگی بھر لطف تھا جو پڑھائی کے مقابلے  
 میں وہ کبھی حاصل نہیں کر سکی تھی۔

”ارے نہیں رباب! انکچوٹکی ایہا بلا زمین کو سپرد آ کر کرتی ہیں۔ تمہیں بتایا تھا نا۔ عوان بھائی کی کزن ہیں  
 یہ۔“ زارا سے مزید برداشت نہیں ہوا تو بول اٹھی۔  
 سفینہ بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ اور حتمی ہوئے کہا۔  
 ”کاموائی تو کرتی ہوئی ہے زارا۔ ہیڈ ہو چاہے اسٹنٹ۔“  
 بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آئی! رباب نے لقمہ دیا تھا۔ معیذ تو گویا کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ وہ  
 تجزیہ کی پہلی منزل پہ تھا اسے یہ کھنٹ اچھے لگ رہے ہیں یا بُرے؟  
 جواب حیرت انگیز۔

اسے یہ سب تماشا اچھا نہیں لگ رہا تھا یعنی برا لگ رہا تھا ہوتا حاصل جمع کیا رہا؟  
 وہ خود شنائی کے دقیق سوالوں میں الجھا ہوا تھا محسوس میں لونا تو ایہا کو تیزی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کے  
 جاتے دیکھا۔

”اے لڑکی۔“ سفینہ بیگم کی کرخت آواز۔ مگر وہ پلٹ کر نہ دی تھی۔  
 ”اوہو۔ برا خراج ہے اس کا۔ کالج میں بھی ایسی ہی تھی بظاہر معصوم اور خاموش مگر اندر سے پوری تھی۔“ رباب  
 نے غصے سے کہا۔

معیذ عجیب سی کیفیت کا شکار اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیکھ رہے ہو تم اس لڑکی کی اکثر معیذ۔ نکال باہر کروں گی میں اسے پھر مت کہنا مجھے سمجھ سے یہ بدتمیز ہی ذرا  
 بھی برداشت نہیں ہوتی۔“ سفینہ بیگم نے سرد لہجے میں اسے سنایا۔  
 ”میں فریض ہو کے آتا ہوں۔“

معیذ اس فضا سے لگتا چاہتا تھا۔ معذرت خواہانہ کہتانی الفور اوپری بیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دل کی  
 عجیب کیفیت پہا نہیں کیا تھی گھبراہٹ یا پھر غصہ۔ یا سچ کی کوئی کیفیت۔ دل کو دوران اور اس کو دینے والی۔  
 اس نے خواہش کی کہ اس کا دل کھول کر منہ پرانی کے چھینٹے مارے۔ تو جلتی آنکھوں کو قرار سا آگیا۔  
 توتلیہ سے منہ پوچھتے چند گہری سانسیں لے کر اس نے اندر کی کشافت کو کم کرنے کی کوشش کی اور پھر خود کو تھوڑا  
 بہتر محسوس کیا۔

”کام ڈاؤن معیذ احمد۔ اس لڑکی کے ساتھ تمہارا صرف مجبوری کا رشتہ ہے۔ اسے سر پہ سوار مت کرو۔“ اس  
 نے اندر کے بیدار ہوتے اچھے معیذ کو سلاسنے کی خاطر تھپکتا شروع کیا۔

”یہ وہ لڑکی ہے جس کی وجہ سے میں اپنی ماں کی نگاہوں میں گر گیا۔ بھائی بہن کے سامنے شرمندہ ہوا۔ میں اپنی  
 زندگی کا فیصلہ آزادانہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا دم چھٹا میرے ساتھ ہے۔“ اس نے تلخی سے سوچنا چاہا۔  
 مگر اسے حیرت ہوئی۔ یہ جان کر کہ اسے اس سارے قصے سے تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ خود کو بھپک  
 تھپک کر بھی سکون محسوس نہیں کر رہا تھا۔

”فاریٹ اٹ۔ میں نے تو اسے آزادی دے رکھی ہے وہ اپنی زندگی کا اچھا سا فیصلہ کر لے اور جائے یہاں سے  
 میں تو آئندہ زندگی میں صرف رباب کو ہم سفر دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید۔“

وہ ذہن سے ایہا مراد کو جھٹکنے کی خاطر مستقبل کا نقشہ کھینچنے بیٹھا تو وہ بھی نامکمل ٹکڑا۔ دل میں رہنے والے تو کئی  
 ہوتے ہیں مگر جس کے حوالے یہ دل کیا جاتا ہے وہ بہت خاص ہوا کرتا ہے۔  
 تو کیا رباب احسن اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی تھی؟ معیذ خود بھی الجھن کا شکار تھا۔



رباب چائے کے بعد خوش کہیاں لگانے کے بعد رخصت ہوئی تو معیذ اسے گیٹ تک چھوڑ کے آیا۔

”رہنم کہیں گئے تھے اس حراقہ کو لے کر؟“

لاؤنج میں آتے ہی سفینہ بیگم نے اونچی آواز میں پوچھا تو وہ ٹھٹک گیا۔

”ماما! زار نے احتجاجاً! نہیں آہستہ سے پکارا۔“

”ماما کا گلا گھونٹ دو تم لوگ تاکہ تم لوگوں تک میری آواز نہ پہنچ سکے۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”ماما! اسے بخار تھا۔ ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ حالت بہت خراب تھی اس کی۔“ وہ چور سا ہو گیا۔

”مر تو نہیں رہی تھی نا وہ۔ دیکھ لو دندنا! پھر رہی ہے میرے سینے پر۔“

”ماما پلیز اب جب تک وہ یہاں ہے لاؤ اور ٹوں کی طرح تو نہیں پھینک سکتے نا۔“ زار اکا دل ہاں جیسا سخت نہیں

تھا۔ بلکہ اسے تو خاموش طبع سی ہو لڑکی بے ضروری لگی تھی۔

”ہاں تو کھو اپنے بھائی سے باپ کی طرح یہ بھی اس کا پکا والی وارث بن جائے۔“ وہ تڑخیں۔

”نار گاڑ سیک ماما۔ انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ معیذ نے عاجز آکر کہا۔

”مجھے مت پرہاؤ۔“ وہ حقارت سے بولیں۔

”طبیعت نہیں اس لڑکی کی نیت خراب ہے۔ جب تک اس کے منہ پہ طلاق کے تین لفظ نہیں مارو گے وہ

کبھی یہاں سے ہلے گی بھی نہیں۔ ارے تمہارے باپ کو کیا کہوں ہیں۔ پچاس لاکھ ڈلو لگیا اس کے اکاؤنٹ میں۔

مالو سیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ لاکھوں کی آسانی ہو تم اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑے گی وہ بھی۔“ معیذ کی

کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

”بے فکر رہیں آپ اتنی قابل نہیں ہے وہ۔ کہ ایسی بڑی بڑی ہانگنڈ کر سکے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے بھی کرنے دو جو میں کر رہی ہوں۔ خبردار جو کوئی بیچ میں بولا ہو تو۔“ انہوں نے غرا کر کہا

تھا۔

معیذ کا تو سر پھٹنے لگا۔

”آپ جوتی میں آئے کریں۔ میں کچھ نہیں کہوں گا آپ کو۔“ وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ گیا تھا۔

”ماما! اگر اس سارے معاملے کی اصلیت کا رباب کو علم ہو گیا تو قیامت آجائے گی۔“

”اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ یہ منحوس لڑکی اس گھر سے دفع ہو جائے۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ایک طرف تو

یہ لڑکا رباب کے ساتھ بیٹھیں بڑھا رہا ہے اور دوسری طرف اس لڑکی کو بھی طلاق نہیں دے رہا۔ جانے اس کے

دل میں کیا ہے۔“ سفینہ بیگم نے سر تھام لیا۔

”میں ویسے ہی اس چکر میں پڑی۔ اگر مجھے پہلے پتا ہو تاکہ بھائی نکاح کر چکے ہیں تو میں انہیں رباب کی طرف

بڑھنے نہ دیتی۔“

زار اکو اپنی فکر تھی۔ رباب اس کی تک چڑھی بلکہ ”سرچڑھی“ مند تھی اور اس کی ضد اور ہٹیلے پن کے قصے وہ

سفیر کی زبانی سنتی رہتی تھی۔

معیذ کمرے میں آکر بھی بے چین ہی رہا۔

زندگی کے اس موڑ نے تو اس کے سارے کس مل نکال دیے تھے۔ ہر مل زندگی کا مزہ چکھنے والے کو زندگی مزہ

چکھانے پہ مل گئی تھی۔

کتنی ہی دیر وہ آئندہ زندگی کا لمحہ عمل طے کرتا رہا۔ مگر ہر منصوبے کے آخر میں اسے احساس ہوتا کہ امتیاز احمد

کی ہوسیت اس کے پیروں کو ذہنی بیڑیوں کی مانند جکڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک قدم اٹھانے لائق بھی نہیں رہا تھا۔

دو دنوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

\*\*\*

آج بہت دنوں کے بعد اس نے ٹانیہ کو کال کی تھی۔

”کیسی ہو۔“ ٹانیہ نے پوچھا تو وہ یاسیت سے بولی۔

”میں تو ٹھیک ہوں مگر آپ تو وہاں پہ جا کے مجھے بھول ہی گئی ہیں۔ شادی کیسی جا رہی ہے؟“

”ہولہ! یہاں آ کے تو میں اپنے آپ کو بھی بھول گئی ہوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”جی۔۔۔؟“ لہجہ اسے حیرانی سے کہا تھا۔

”اور سناؤ۔۔۔ سب ٹھیک چل رہا ہے نا؟“

جواباً ”بھرا ہوا دل لیے لے لیا ہے اسے سارا قصہ کہہ سنایا تو وہ دنگ رہ گئی۔

”اوه گاڈ۔۔۔ یار! ایسے سنگ دل لوگ بھی بستے ہیں اس دنیا میں۔ تمہاری ساس نہ سہی مگر معیذ بھائی کو تو ضرور

احساس کرنا چاہیے تھا۔“

”ان کے احساس اور احسان کی بدولت ہی تو سر چھپانے کا ٹھکانا ملا ہوا ہے مجھے۔“ وہ ان حالات میں بھی معیذ

کی ممنون تھی۔ مگر ٹانیہ چلا ہی تو اٹھی۔

”احسان۔۔۔؟ کون سا احسان بے وقوف لڑکی۔۔۔؟ اپنے حصے کی جگہ پہ بیٹھیں ہو تم۔ اور۔۔۔ اب تمہیں میں کیا

کہاؤں لہجہ۔ اتنا زہر یہ ہے تمہارے اکاؤنٹ میں اور تم ان لوگوں کی چاکری کر رہی ہو۔“

”تو میں اور کیا کروں۔۔۔ آئی مجھے نکال دیں تو میں کہاں جاؤں گی۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”اللہ پہ توکل کرو۔ آئی یہ نہیں۔“ ٹانیہ نے اسے ٹوک دیا۔ ”اللہ کی مدد سے اس کی مہربانی سے تم یہاں موجود

ہو اور نہ اس گھر کے لوگ تو تمہیں گیٹ سے پاؤں بھی اندر رکھنے نہ دیتے۔ باوجود اس کے کہ تم معیذ احمد کی منکوحہ

ہو۔“ ٹانیہ نے اسے آئینہ دکھایا تھا۔

”اب میں کیا کروں ٹانیہ۔ میری عزت نفس مر رہی ہے۔ لمحہ یہ لمحہ میں مٹی ہو رہی ہوں۔ آج رباب کے

سامنے آئی نے جو کہا۔۔۔ ”رندھے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آواز کھو گئی۔“

”سب سے پہلے تو تم صبح سے ان کے گھر جانا بند کرو۔ کوئی کام نہیں کرو گی تم وہاں کا۔“

ٹانیہ نے سختی سے کہا تو وہ رونا بھول کر پریشان ہونے لگی۔

”آئی ناراض ہو جائیں گی ٹانیہ۔“

”پہلے کون سا راضی ہیں۔ تھوڑی سی اور ناراض ہو جائیں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ ٹانیہ نے لا پرواہی

سے کہا۔ پھر بولی۔

”تم ان سے صاف لفظوں میں کہہ دینا کہ تم کام نہیں کرنا چاہتیں اور نہ ہی تمہیں تنخواہ کی ضرورت ہے اور یہ

بھی کہ اب تم کلج جا کر اپنا گریجویشن مکمل کرنے والی ہو۔“

”واقعی۔۔۔؟“ لہجہ اس کا دل کھل اٹھا۔ مگر ساتھ ہی اپنی پوزیشن کا خیال آ گیا۔

”میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں ٹانیہ۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“

”تم صرف کام سے انکار کرو۔ کل شام کی فلائٹ سے میں واپس آ رہی ہوں باقی سارا میرا درد سر ہے۔ میں خود



تمہارا ایڈیشن کراؤں گی۔" ثانیہ نے کہا۔ تو ایہہا کے دل کو اس کی واپسی کا سن کر یک گونہ سکون ملا۔  
 "اگر معین نے اعتراض کیا تو؟" وہ جھجک کر بولی۔

"اعتراض اس شخص کے مانے جاتے ہیں جو خود رائیڈ ہے۔ جن کے اپنے قول و فعل میں تضاد ہو وہ کیا کسی پہ اعتراض کریں گے۔"

ثانیہ نے کوئی خاص اثر نہیں لیا تھا۔ اسے سمجھاتی رہی اور آخر میں جو اس نے کہا وہ ساری بات حیرت پر بھاری تھا۔

"پڑھو لکھو اور اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو کر سب کو بتا دو ایہہا کہ ہر شخص اپنا نصیب لے کر پیدا ہوتا ہے۔ کسی کے والدین اچھے نہ ہوں تو ضروری نہیں کہ اولاد بھی بُری ہی ہوگی۔ اور معین احمد کو بھی تو بتا چکے کہ اسے جس "سہارے" پر بست گھمنڈ ہے تم اس کے بغیر بھی اس معاشرے میں سروائیو کر سکتی ہو۔"

"میں نہیں کر سکتی ثانیہ۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ اس کا دل تو ثانیہ کی باتیں سن سن کر ہی گہری کھائی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ جب عمل کا وقت آتا تو وہ کیا خاک کھاتی۔

"تم کرو گی بیا۔ ورنہ یہ لوگ تمہاری عزت نفس کو تار تار کر دیں گے۔ اگر سرائی کے نہیں جیو گی تو یہ لوگ ہمیشہ تمہارے ماں باپ کو گالی دیں گے۔ اپنے آپ کو اپنے ماں باپ کو نکالی مت بننے دو ایہہا۔"

ثانیہ نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا تو ایہہا کی رگوں میں دوڑتا خون یک نخت تپنے لگا۔  
 "میں نہیں بننے دوں گی ثانیہ۔"

"تم بہت مضبوط ہو ایہہا۔ تمہارے پاس محنت ہے، خوب صورتی ہے اور اب پیسہ بھی ہے۔ تم کیوں ڈرو کسی سے۔" ثانیہ نے اسے شاباش دی تھی۔

"اور اگر معین نے مجھے چھوڑ دیا تو؟" وہ دھیمی بڑبڑائی۔

"اس شخص نے تمہیں اپنا بیا ہی کب ہے ایہہا۔ محض ایک کاغذی کارروائی کی تھی اور اب اس سے بھی جان چھڑانا چاہ رہا ہے۔ تو ٹھیک ہے۔ اللہ نے تمہیں رہنے کا ٹھکانا اور پیسہ دے دیا ہے تمہاری زندگی کی راہیں متعین ہو گئی ہیں۔ اپنی حکمت عملی بنانا۔ زندگی میں جو بننے کا خواب رکھا تھا اسے مکمل کرو۔ زندگی معین احمد ہی کا نام نہیں ہے ایہہا۔"

ثانیہ نے اس پہ اپنا اچھا خاصا دامغ خرچ کیا تھا اور ہر بات اس کی سمجھ میں بھی آئی تھی اور ہر بات دل پہ بھی لگی تھی۔ سو اسے آخری بات کے۔

"وہ میری زندگی میں آیا تو میری زندگی کو ایک نیا رخ ایک نیا موڑ ملا۔ تم کیسے کہتی ہو کہ وہ زندگی نہیں ہے؟" رات بستر پہ لیٹے ثانیہ کی باتوں کو سنجیدگی سے قابل عمل گردانتے ہوئے ایہہا نے اس آخری نصیحت کو ناقابل عمل قرار دے کر لبث سے نکال دیا تھا۔

\*\*\*

"نذرانہ وہ لڑکی ابھی تک نہیں آئی۔ میں نے کہا بھی تھا کہ لوبجے تک اسے یہاں ہونا چاہیے۔"

سفینہ لکلی صبح زیادہ قارم میں تھیں۔  
 "چائیں۔ ہو سکدا اے اوس دی طبیعت خراب ہووے۔" نذیراں نے ڈسٹنگ سے ہاتھ روک کر کہا۔  
 "جاؤ اور کھیت کے لے کے آؤ اسے یہاں۔" سفینہ بیگم نے دانت پیسے۔

وہ جب جب معین کی گاڑی میں ایہہا کے بیٹھے کا سین یاد کرتی انہیں غصے کا دور پڑنے لگتا تھا۔  
 ان کے بیٹے کے پیچھے ایک "بلا" لگ گئی تھی۔ اور وہ ہر صورت تجویز دے دلا جاتی تھیں۔ ہر صورت۔

\*\*\*

"میں نہیں آؤں گی۔" اپنے بستر کی چادر تمہ کرتے ہوئے ایہہا نے کہا تو نذیراں جیسی سیدھی سادی عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"تساں لوں بیگم صاب داپا اے ناں۔" وہ خوف سے بولی۔ وہ چادر تمہ کر کے رکھنے کے بعد تکیے ٹھیک کر کے سیدھی ہوئی اور نذیراں کو دیکھا۔

"تم ان سے کہہ دو کہ نہ مجھے اس نوکری کی ضرورت ہے اور نہ تنخواہ کی۔" نذیراں نے منہ کھولے چند ثانیہ جیسے اس کی بات سمجھنے میں لگائے اور پھر اثبات میں سر ہلا کے پلٹ گئی۔

ایہہا اس کے پیچھے بیرونی دروازے تک آئی و سمیر کی ٹھنڈی ہوائ نے اس کے رخساروں کو چھوا تو لحظہ بھر کو وہ کپکپاتی گئی اس نے تیز قدموں سے کوٹھی کی طرف جاتی نذیراں کو دیکھا اور لرزے ہاتھوں کو سینے پہ بازو پیٹتے ہوئے بغلوں میں ڈھالیا۔

مگر بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ یہاں تھیں کی یہ لرزش سردی کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ دروازہ بند کر کے جلدی سے اندر آگئی۔ اتنی اہم دکھا تو دی تھی ثانیہ کے سمجھانے پر لیکن اب آگے کیا ہو گا اور اس کا کیسے سامنا کرنا تھا یہ اللہ ہی جانتا تھا۔

وہ ناشتہ بنانے کا سوچ رہی تھی جب نذیراں آگئی، لیکن اب اس کی بھوک اڑ گئی تھی۔  
 ذرا سی اہم کے بعد پھر سے خوف اور ہشت۔

ان ہی لوگوں کے حصے میں سے وہ مضبوط مالی حیثیت، اور ایک چھت کی مالکن بنی تھی اور اب انہی کو تیار دکھا رہی تھی؟ اس کے ذہن میں منفی سوچیں چکرانے لگیں۔ ابھی وہ اٹھ کر کوٹھی جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دھاڑ کی آواز کے ساتھ بیرونی دروازہ کھلا۔

وہ خوف زدہ سی اچھل کر کھڑی ہوئی۔ غصے سے بے حال ہوتی سفینہ بیگم اور ان کے پیچھے افتاں و خیراں نذیراں۔ ایہہا کا دل لرزے لگا۔

"تم۔۔۔ دو ٹکے کی لڑکی ساں بھگوڑی اور باپ شرابی۔ یہی اصلیت ہے نا تمہاری مورچی اوقات۔۔۔ تو پھر اتنی اکثر کس بات کی بکھار رہی ہو؟"

سفینہ بیگم گرجیں تو ان کے انداز سے زیادہ ان کے انداز گفتگو نے ایہہا کا خون خشک کر دیا۔  
 "میں نے۔۔۔ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے انکار کر دیا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" سفینہ بیگم کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ایہہا کے چوتھوڑے اڑا دینے کے موڈ میں ہیں۔

ایہہا کو لگا زبان کے بجائے منہ میں چمڑے کا ٹکڑا رکھ دیا گیا ہو، بمشکل لڑکھڑاتے ہوئے بولی۔  
 "میں پڑھنا چاہتی ہوں آگے۔"

"بکواس بند کرو۔ تمہارا باپ کون سی جائیداد چھوڑے گا؟ تمہارے لیے آوارہ ماں کی آوارہ بیٹی ساں نے بھی ایسے ہی کسی آلو کو پھنسا دیا تھا اور تم نے بھی وہی کام کیا۔"

سفینہ بیگم کے لب و لہجے میں حقارت تھی۔ نفرت تھی۔ ایسی نفرت جو اس کے وجود کو نیلا کیے دیتی تھی۔



”آئی پلیز۔۔۔ برف ہو تو ان جوتاں کے نام سے نکلنے والی حرارت نے پگھلا دیا۔ بے اختیار ہی وہ چیخی تھی۔“  
”میری ہاں کو کچھ مت کہیں۔“

اور اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سفینہ بیگم کا غصہ نکالنے کا بہانہ بنے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ایک زور دار تھپڑ ایسہا کے منہ پر مارا تو وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گری۔ اس کا سر سینٹر نیبل سے ٹکرایا تھا۔  
ورد کی ایک تیز لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

نذیراں جو ابھی تک خوف سے دم سادھے اس پیاری سی لڑکی کی درگت مٹتے دیکھ رہی تھی بے اختیار اسے سنبھالنے کو آگے بڑھی اور اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ تو اس کی پیشانی خون سے تر ہو کر دیکھ کر حق دق رہ گئی۔  
”چھوڑو اسے نذیراں۔“ سفینہ بیگم گرجیں۔ تو اس نے گہرا کر کہا۔

”خون نکل رہا ہے ایسے دایکیم صاب۔“  
”پتا نہیں حلال ہے یا حرام۔ اپنے ہاتھ ناپاک مت کرو۔ اور چلو اٹھو تم چل کے کام کرو اپنا۔“  
وہ حقارت سے بولیں اور انداز میں اس قدر تحکم کیا کہ نذیراں کو سسکتی ایسہا کو چھوڑ کر اٹھنا ہی پڑا۔  
ایسہا نے اپنا دہنا پیشانی پر دبا کے رکھا، زور دار تھپڑ سے اس کا ہونٹ اندر سے پھٹ گیا تھا۔ اس نے لہو کا ذائقہ منہ میں گھلتا ہوا محسوس کیا تھا۔

نذیراں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے چلی گئی۔  
”اب تو تمہیں اپنی اوقات اچھی طرح پتا چل گئی ہوگی۔“ سفینہ بیگم کی سفاکی پر اس کی تباہ کن حالت نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ مسخّر سے بولیں۔

اور پھر وہ اس کے بارے میں انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ زور سے چیخی۔  
”ہاں۔ جانتی ہوں میں اپنی اوقات۔“ اس نے دوپٹا پیشانی پر سے ہٹایا تو وہ خون میں بھیگا ہوا تھا۔ شیشے کی سینٹر نیبل کے کنارے نے اس کی پیشانی کو بری طرح زخمی کیا تھا۔ مگر اسے اب اس زخم کی پروا نہ تھی۔ سیدہ زخم تو جسمانی تھے قابل برداشت۔

اصل زخم تو وہ تھے جو سفینہ بیگم کی زبان اس کی روح پر لگا رہی تھی۔  
جسم کے زخم تو کچھ دیر سے ہی سہی مگر بھری جاتے ہیں، لیکن روح کے زخموں کا مداوا کیا؟  
وہ ان کے سامنے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے ایسہا کے انداز میں اتر آنے والے باغی پن کو بہ سرعت محسوس کیا تھا۔

”اچھا۔۔۔“ وہ استنہار سے مسکرائیں۔  
”میں بھی تو سنوں۔ کیا ہے تمہاری اوقات۔ دو کوڑی کی لڑکی۔“  
”میری اوقات پہلے جو بھی رہی ہو مسز اتقیا زاحد۔ مگر اب اس دو کوڑی کی لڑکی کی اوقات یہ ہے کہ یہ آپ کی بہو اور معیز احمد کی منکوحہ ہے۔“

وہ زور سے چیخی۔ سفینہ بیگم نے اس سے ان الفاظ کی کبھی توقع نہیں کی تھی۔ ان کا خون رگوں میں اگلنے لگا۔  
”الو کی چٹکی۔ حرام۔“  
وہ مغالطات بکیتی اس پر ٹوٹ پڑنے کو تھیں، جب نذیراں کی ناگہانی اطلاع پر بھاگ کر آتا معیز ماں اور ایسہا کے درمیان آگیا۔ ان کا ہاتھ معیز کے سینے پر پڑا تھا۔  
”ماما۔۔۔“ معیز نے بے یقینی بھرے آسف سے ماں کو دیکھا۔

”چھوڑو مجھے معیز۔ آج میں اس رزیل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس کی ہمت میرے منہ کو آرہی ہے۔“  
میرے ٹکڑوں پہ پلٹنے والی میری برابری کے دعوے پر اتر آئی ہے۔“  
معیز نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھے تھے۔  
”اس کی کیا مجال ماما جو یہ آپ کے مقابلے پر آئے۔ آپ چلیں یہاں سے۔“ وہ انہیں ٹھنڈا کرتے ہوئے بولا۔  
تو وہ چلیں۔

”تم نے سنا نہیں معیز اب کیا ہو اس کر رہی تھی۔ تم پوچھتے کیوں نہیں اس سے۔“  
معیز نے اس کی طرف دیکھا ارادہ کیا تھا کہ سفینہ کو خوش کرنے کی خاطر اسے ذرا سا ڈانٹ دے گا مگر اس کی خون سے تر پیشانی اور کچلے لب سے چھلکتی سرخی دیکھ کر اس کا دل گہرائی میں ڈوب کر ابھرا۔  
”پوچھو نا۔ پوچھتے کیوں نہیں اس سے۔“ سفینہ بیگم تیز لہجے میں بولیں۔ وہ معیز کا ٹھٹھکا محسوس کر چکی تھیں۔

”ہاں پوچھیے۔۔۔ آپ بھی پوچھیے میرا حسب و نسب۔ کیا آپ بھی اپنی ماں کی طرح میرے خون کے حلال یا حرام ہونے کی تصدیق چاہتے ہیں؟“  
وہ مرعوب یا مار ڈالو والی کیفیت میں تھی۔ اس صورت حال نے اس کے تمام ڈر اور خوف کو دور کہیں سلا دیا تھا۔  
”میں کہتی ہوں معیز! ابھی طلاق اس کے منہ پہ مارو۔ اسی برتنے پہ یہ اتنا کر رہی ہے نا۔ نکالو اسے اس گھر سے۔“

”یہ مجھے طلاق دے بھی دیں تو بھی مجھے اس گھر سے نکال نہیں سکتے۔“ ایسہا نے اسی بے خوفی سے کہا۔  
”دیکھا تم نے ہمدردی کا انجام۔ آج ہمیں دھمکا رہی ہے یہ۔ اس روز بٹنے دیتے اس کو تو پتا چلتا اسے اپنی اوقات کا۔“ سفینہ بیگم کا لہجہ زہر آلود تھا۔  
معیز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ایسہا اونچی آواز میں بولی۔

”وہاں بٹنے کے بعد بھی یہی ہوتا۔ جو یہاں ”بٹنے“ کے بعد ہو رہا ہے۔“  
”ایسہا۔۔۔! معیز دلعتاً“ غصے سے اونچی آواز میں بولا تو لہجہ بھر کو وہ چپ سی ہو گئی۔ مگر بھر پور حوصلے سے پوچھنے لگی۔

”تو کیا غلط کہا ہے میں نے؟ آپ کی مہربانی آپ بھی توقیت ادا کر کے ہی لائے تھے۔ مجھے۔“ اس کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ آنسو پینا کے گتے ہیں یہ ایسہا مراد نے اس وقت سیکھا۔  
”شٹ اپ۔“ معیز ناگواری سے بولا پھر سفینہ بیگم سے کہنے لگا۔  
”آپ چلیں ماما۔ گھر چل کے آرام کریں۔“

ایسہا نے اندر بیڈ روم میں جا کر دروازہ لاک کر لیا تھا۔ معیز نے ایک نظر بند دروازے کو دیکھا اور سفینہ بیگم کو لے کر باہر نکل گیا۔  
”اس لڑکی کا کچھ کرو معیز اب مجھے اپنے گھر میں ایک بل بھی برداشت نہیں ہے۔“  
وہ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے تند لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ مگر معیز کا سارا دھیان ضبط سے گلابی پڑتی ان شکوہ کنناں آنکھوں اور لہو سے تر ہجرے کی طرف تھا۔  
سفینہ بیگم کو زارا کے پاس چھوڑ کر وہ گھر سے نکلنے لگا تو انہوں نے بے قراری سے اسے پکارا۔  
”کہاں جا رہے ہو؟“  
”آرام ہوں ماما! جا کے اسے دیکھوں بہت خون بہہ رہا تھا اس کا۔“ وہ سنجیدہ تھا۔



سفینہ بیگم کا منہ مارے حیرت کے کھلا۔ پھر ان کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔  
 ”کون۔۔۔ کس کا خون نکل رہا ہے؟“ زارا گھبرائی۔ معینہ خاموش رہا مگر سفینہ بیگم جھلکا اٹھیں۔

”یارغ ٹھیک ہے تمہارا۔ مرنے والا ہے۔“ خس کم جھانپا۔  
 ”وہ ہمارے گھر میں رہ رہی ہے اسے کچھ ہوا تو جوابدہ ہم ہی ہوں گے۔“ معینہ نے انہیں احساس دلایا۔  
 ”ہم کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہیں۔“

”اللہ کے سامنے تو ہیں ناں۔“  
 وہ ہار نکل گیا تھا۔ سفینہ بیگم سر ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گئیں۔

”کیا ہوا ماما۔۔۔“  
 زارا تشویش سے انہیں پوچھ رہی تھی۔

\*\*\*

وہ فرسٹ ایڈ باکس لے کر وہاں پہنچا تو دل و دماغ مسلسل ایک جنگ کی زد میں تھے۔ دل وہاں جانا نہیں چاہتا تھا مگر دماغ مصر تھا کہ اسے ایک بے گناہ لڑکی کو یوں بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہیے۔

معینہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سفینہ بیگم ایسا کے ساتھ اس قدر زبردستی سلوک کر سکی۔ وہ روئین کے مطابق آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اندر اس گھبرائی ہوئی اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی۔  
 ”اوتھی۔۔۔ جلدی کرو۔ بیگم صاب نے اوس بی بی نول زخمی کر دیا ہے۔“ وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ معینہ پورے کا پورا اس کی طرف گھوم گیا۔

”کون۔۔۔ کس نے کس کو زخمی کیا ہے؟“

”او بیگم صاب نے اوس کرائے دار بی بی نول۔ نو نماں دا خون نکل رہیا ہے۔“ نذیراں اسے اپنا مافی النصیر سمجھانے میں کامیاب رہی تھی وہ چونکا۔  
 ”اوشش۔۔۔ یہ ماما بھی نا۔“

وہ بھاگ کر انیکسی میں پہنچا تھا۔ اور پھر ایسا کا خطرہ بھرا انداز دیکھا اور سنا۔

”اس لڑکی کی یہ اوقات ہے کہ یہ آپ کی بہو اور معینہ احمد کی منگولہ ہے۔“

اس کے دل کی حالت کچھ عجیب سی ہوئی مگر صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ مزید کچھ سوچ نہیں سکا۔ درحقیقت اس وقت ایسا کی حالت دیکھ کر معینہ کو افسوس ہوا تھا۔ اور اب وہ میڈیکل باکس لے کر وہاں پہنچا تو بیرونی دروازہ کھلا اور بیڈروم کا دروازہ ہنوز بند تھا۔ باکس سینٹر ٹیبل پر رکھ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا تا ب گھما کر دیکھا تو وہ لاک نہیں تھا۔ کلک کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ معینہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو وہ اپنا دوش پیٹنی پہ دبا کے رکھے بیڈ پر سر نکالے نیچے کارپٹ پر بیٹھی تھی۔ معینہ تیزی سے آگے بڑھا اور بچوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔  
 ”ایسا۔۔۔! اس نے کیا کیا۔“

قیامت بھی آجانی تو وہ اتنی حیران نہ ہوتی کہ وہ تو برحق ہے۔ مگر معینہ کا یوں دباؤ اس آنا اور نری سے پکارنا۔

اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کے اسے دیکھا تھا۔

”اٹھو۔ مجھے تمہارا زخم دیکھنا ہے۔“

معینہ نے کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ لاؤنج میں چلی آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھی۔ معینہ میڈیکل باکس میں سے پائیوڈین اور کائن نکال رہا تھا۔ اور وہ مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔

وہ اب ہاتھوں پر میڈیکل گلووز چڑھا رہا تھا پھر اس نے جبک کراختیاد کے ساتھ اس کے زخم پر چپکے بالوں کو پیچھے ہٹایا ایسا نے آنکھیں موند لیں۔

اس کے بلوس سے اٹھتی خوشبو نے ایسا کی پور پور کو مہکا دیا۔ وہ کائن پہ دوا لگا کر اس کے زخم کو صاف کر رہا تھا۔ شکر خدا اناکوں کی نوبت نہ آئی تھی۔

اس کے ہاتھوں کا لمس ایسا کو اپنے ماتھے پہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی دھیمی سی آواز اور تپش۔ وہاں خاموشی تھی۔ بولتی خاموشی۔

یہ لمس۔۔۔ یہ لمس جو سکون آور تھا۔ اس کے غموں کی اخیر تھا۔

معینہ نے اس کی پلکوں کی لرزش دیکھی اور خود سے اعتراف کیا وہ بہت معصوم اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اور اس سوچ کے ذہن میں لہراتے ہی معینہ کو ڈنک سالگ۔ وہ فی الفور پیچھے ہٹا اور پلٹ کر گلوڑا تارنے لگا۔ ایسا نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ میڈیکل باکس میں چیزیں سیٹ کر رہا تھا۔

اسے لگاتار کرنے کا یہی صحیح موقع ہے۔ اب جبکہ یہ پینڈو رہا کس کھل ہی چکا تھا تو وہ یہ موقع نہوانا نہیں چاہتی تھی۔  
 ”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“

وہ بے ساختہ بولی تو معینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایسا نے وضاحت کی۔

”میں اپنی انجکشن کمپلیٹ کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی تو اس کے پٹی زہ ماتھے کو دیکھ کر معینہ شرم سار سا ہو گیا۔

”ہوں۔۔۔ اچھی بات ہے۔“ وہ مختصر ”بول۔“ مگر جانے سے پہلے اسے یاد دہانی کرانا نہیں بھولا۔

”لیکن حالات تمہارے سامنے ہی ہیں۔ اس گھر میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ جتنی جلدی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرو گی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بات نے دل کو کتنا دکھی کیا ہے سو پیشانی کے زخم کو چھو کر سک رہی۔

”یہ پین کھر رہی ہیں میں نے۔ دودھ کے ساتھ ایک لے لینا اور دوسرا افاق ہوگا۔“ معینہ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

”گوریل کے درد کا کیا معینہ احمد۔۔۔؟“

اس کے دل نے پیچھے سے دہائی دی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

\*\*\*

”میں تو کہتی ہوں کہ ابھی مزید کچھ دن رکھو تم یہاں۔“

تائی جان نے اپنے سارے لاؤعون پر ہی لٹا دیے تھے۔ ثانیہ ابھی اپنا بیگ پیک کر کے اٹھی تھی۔ لاؤنج میں سے پہلے اسے تائی جان کی آواز آئی۔ تو اس نے سر جھٹکا پھر وہ کوریڈور ہی میں رک گئی۔ وہ عون کا جواب سننا چاہتی تھی۔ کل وہ لیمہ کھا کر وہ لوگ خاموش ہو چکے تھے اور اصولاً ”آج رات انہیں یہاں سے نکل جانا تھا۔“

”پھر سہی تائی جان سنی الحال تو اتنی ہی چھٹی پر آئے تھے۔“ وہ بولا تو ثانیہ کی جان میں جان آئی۔

وہ اس کجنگ ماحول میں مزید ایک بھی دن ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تو یہاں سے جاتے ہی گاؤں امی اور امی کے پاس جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔



اسے لک رہا تھا وہ اپنوں سے جانے کتنا دور چلی آئی ہے۔  
 ”عون پلینز یہ ہفتے میں دن ہی کتنے ہوتے ہیں۔ مائی کو بھیج دو واپس۔ تم تو کبھی کبھار آتے ہو۔ ابھی تو اتنی جگہوں کی سیر کرنی تھی تمہارے ساتھ۔“

یہ ارم تھی۔ ثانیہ کا دل ہی نہ چاہا لاؤنچ میں جانے کو۔  
 عینک کی دون پہلے کی گفتگو نے اسے کھڑے میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے غیر جانب داری سے اپنے اور عون کے معاملے کا جائزہ لیا تو خود کو سراسر جذباتیت کی انتہا اور غلطی پر پایا۔

مگر اب یہ ارم پھر سے۔۔۔ اس نے لب کھلا۔  
 ”مائی کو بھیج دو۔۔۔ اب کس کمپوزی۔“ عون کی آواز ابھری تو اس میں ناگواری بھری ہوئی تھی۔ ثانیہ چونکی۔  
 ”ہاں بیٹا۔ وہ ویسے بھی یہاں کچھ خاص کھلی ملی نہیں کسی کے ساتھ۔ جہاز پر ہی تو جانا ہے اس نے۔ کون سا بس پکڑنی ہے اکیلے پھر خوب سیر کرنا۔“

مائی جان نے شہد آگس کہجے میں عون کو نئی راہ دکھائی ثانیہ کا دل جیسے مٹھی میں جکڑا گیا۔  
 کسی بھی لڑکے کے لیے یہ بے حد پرکشش آفر ہوتی خاص طور پر ایسے لڑکے کے لیے جس کی اپنی منکوحہ اسے گھاس بھی نہ ڈالتی تھی۔

وہ بے ترتیبی سے دھڑکتا دل لیے عون کے جواب کی منتظر تھی۔  
 ”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ مائی جان۔ وہ بیوی ہے میری۔ میں اسے ایسے تنہا کیسے بھیج سکتا ہوں؟ اور جہاں تک بات ہے سیر و تفریح کی تو انشاء اللہ شادی کے بعد ہم دونوں جب یہاں آئیں گے تو ثانیہ میں یہ جھجک نہیں ہو گی۔ تب خوب سیر کرے ارم گے ساتھ۔“ وہ فریٹش لہجے میں بولتا ثانیہ کی دھڑکنوں کو قرار دے گیا۔

”عون پلینز کیا مستقبل ہے تمہارا؟ کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ختم کرو بچپن کے اس کھیل کو۔ کیوں ہاں باپ کی زبان نبھانے کی خاطر اپنی زندگی خراب کر رہے ہو۔“

ارم کا بس نہیں چلتا تھا وہ عون کا ساتھ پانے کے لیے اس کے آگے گڑگڑانا شروع کر دیتی۔  
 ”ہاں بیٹا۔ بیویاں وہی اچھی لگتی ہیں جو شوہر کو عزت دیں۔ وہ تو تمہیں کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“ مائی جان مکمل طور پر بیٹی کی سپورٹ میں تھیں۔

”جب واقعی میں بیوی بنے گی تو کسی ہی عزت بھی دے گی مائی جان! لڑکیوں میں تمہوڑا بہت خزا تو ہوتا ہی ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے اس کا بیٹی بیوڈ۔“

عون کا انداز پر سکون تھا۔ ثانیہ جو مائی جان کی بات سن کر سن سی ہو گئی تھی عون کی بات سن کر تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔  
 یہ وہ شخص تھا مندی کی رات بھرے پنڈال میں جس کی عزت کا اس نے خیال نہیں کیا۔ اور وہ ثانیہ کی غیر موجودگی میں بھی اسی کا دفاع کر رہا تھا۔

ارم نے مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر عون اٹھ کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا۔  
 ”اب تو میں اور مائی ارم کی شادی پہ آئیں گے اور وہ جو بھگڑا نازی موٹی کی شادی پہ ادھار رہ گیا ہے وہ ہم دونوں مل کے ڈالیں گے ارم کی شادی پر۔“

”عون۔! تم اپنے آپ کو مجبور مت سمجھو۔ ابویات کر لیں گے چچا جان سے۔ زبردستی کا یہ رشتہ خاموشی سے ختم ہو جائے گا۔“ ارم بے قراری سے بولی۔  
 ”ہاں اور تمہارا نام بھی نہیں آئے گا۔ اس بات کی فکر مت کرو تم۔“ مائی جان نے اسے برہا دیا۔

مائی نے بے ساختہ چلرا کر دیوار کو تھاما۔ یہ بھی تو رشتوں ہی کے چرے تھے۔  
 لوگ نہیں بدلتے۔ یہ حالات ہیں جو ان کے چہروں سے نقاب اتار کر ان کی اصلیت سامنے لے آتے ہیں۔  
 ”ہاں۔ میں مجبور ہوں۔“ عون سنجیدگی سے بولا پھر ارم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”مگر اپنے دل کے ہاتھوں۔ میری کپٹی پہ کوئی بندوق نہیں رکھی ہوئی ارم۔ ثانیہ سے میں اپنی زندگی میں تو کبھی یہ رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ میں اس رشتے کو اپنے دل و دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ پسند کرتا ہوں اور نبھانا چاہتا ہوں۔ تم جانے کن ملکہ تمہیں کا شکار ہو۔“

آخر میں اس کا لہجہ بے رخی لیے ہوئے تھا۔  
 ”میں چلتا ہوں۔ ابھی میں کچھ اپنا سامان پیک کرنا ہے۔“  
 وہ سیڑھیوں کی طرف برہا اور تیزی سے اوپر چلا گیا۔ ارم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مائی جان بوکھلا کر اسے تسلیاں دینے لگیں۔

بو جھل سا دل لیے ثانیہ واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ شام کو وہ سب سے مل کر ایر پورٹ کے لیے نکلے تو ارم انہیں خدا حافظ کہنے موجود نہیں تھی۔  
 ثانیہ جب سلیم سے ملی تو اسے خود سے بھیج لیا۔ اسے خوب رونا آیا۔

عقل عمر کی میراث نہیں ہوا کرتی۔  
 وہ خود کو بہت عقل مند سمجھتی تھی مگر ایک سترہ سالہ لڑکی نے اسے بتایا کہ عقل عمر سے نہیں۔ حالات کا کھلی انگھڑ سے مشاہدہ کرنے سے آتی ہے۔ اپنے معاملات کو غیر جانب داری سے پرکھنے سے آتی ہے۔

”تھینکس۔“  
 ”فار واٹ؟“ وہ مسکرائی۔  
 ”فار ایوری تھینکس۔“ ثانیہ بھیگی پلکوں سنگ مسکرا دی۔

”میں اپنی شادی پہ آپ دونوں کا انتظار کروں گی۔“ وہ شرارت سے بولی تو ثانیہ ہنس دی۔  
 انہیں ایر پورٹ تک چھوڑنے شایان جا رہا تھا۔ فاران بھی ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ عون سب سے مل کر فریٹ

سٹ پر آ بیٹھا۔ ثانیہ پچھلی نشست پر تھی۔ سارے راستے وہ شایان سے محو گفتگو رہا مگر بھول کر بھی ثانیہ کو مخاطب نہیں کیا۔  
 میں اسی قابل ہوں۔ وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

اسلام آباد سے کراچی تک کے سفر کے دوران بھی وہ سنجیدہ اور پر تکلف سا رہا۔  
 اور ثانیہ کو وہ رہ کر یاد آتا رہا کہ اس نے نازیہ آئی کی ہالوں والی رات عون کی کس طرح انسلٹ کی تھی۔ ایر پورٹ پر خالو جان گاڑی لے کر موجود تھے گرم خوشی سے ملے۔

”کھڑ چلونا۔ اپنی پیچھو سے نہیں ملو گے؟“ عون نے پہلے اسے ڈراپ کرنے کا کہا تو خالو جان مسکرائے۔  
 ”کل آؤں گا۔ ابھی گاڑی پاس نہیں ہے ابھی یہ پھر مسئلہ بنے گا۔“  
 عون نے وضاحت دی۔ اور وہ راستے ہی میں اتر گیا۔

”اوکے۔ اللہ حافظ۔“  
 ڈکی میں سے اپنا بیگ نکال کر وہ خالو جان سے الوداعی ملاقات کر رہا تھا۔  
 اور ثانیہ اس کی ایک نگاہ کی منتظر ہی رہی۔ اس کا دل دیے کی لوپ رکھا قطرہ قطرہ پھیل رہا تھا۔ مگر شاید چاہنے کی نگاہ ہی بدل گئی تھی۔



وہ کیٹ کی طرف پلٹ گیا۔ ثانیہ نے تھکی ہوئی آنکھیں موند کر سیٹ سے سر نکال دیا۔

\*\*\*

اگلے روز ناشتہ کر کے فارغ ہوتے ہی وعدے کے مطابق ثانیہ اس کے پاس موجود تھی۔ ایسا ہوتا رہے خوشی کے اس سے لپٹ کر رہ رہی رہی۔

”ایسا... واٹ ایسٹ...؟ یہ ماتھے کیسا زخم ہے۔ گری ہو گیا؟“

ثانیہ تو تنگ ہی رہ گئی اسے خود سے الگ کر کے سامنے کیا۔ ماتھے کی چوٹ تو چلو بینڈیج میں چسپ مٹی، مگر سوجا ہوا ہونٹ اور بخار میں تھتا اس کا وجود؟

”ہوں ہاں۔ کل یہاں پاؤں سلپ ہو گیا تو ٹیبل کے شیشے سے زخمی ہو گئی۔“ ایسا کی زبان لڑکھرائی۔

”اتنی سخت چوٹ... بخار بھی ہو رہا ہے تمہیں۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں۔ اس سنگدل شخص نے تو پلٹ کے دیکھا بھی نہیں ہو گا تمہیں۔“

ثانیہ کے پر تشویش کبھے میں غصہ در آیا۔

”نہیں، نہیں... ایسی بات نہیں ہے۔ نذیراں نے جا کر انہیں بتایا ہو گا وہ آئے تھے کل۔ یہ بینڈیج انہوں نے ہی کی ہے اور میڈیسن بھی دی تھی۔“

وہ بے اختیار بولی تو ثانیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔ پچھلے دنوں طبیعت خراب تھی تو ڈاکٹر کے پاس بھی لے گئے تھے۔“

ایسا نے اس کے معیز کے خلاف ہونے یا کچھ بولنے سے پہلے ہی ”بند“ باندھنا شروع کر دیے۔

”یقین تو نہیں آ رہا مجھے مگر اب تم اتنا زور دے کر کہہ رہی ہو تو میں مان لیتی ہوں۔“ ثانیہ کے ماننے کا انداز بھی نہ مانے جیسا تھا۔ ایسا نے اسی پر ہنسا دیا کہ وہ بحث پر نہ اتری تھی۔

”اچھا چلو آرام سے بیٹھو۔ بلکہ تم صوفے پہ لیٹ جاؤ اور میں یہاں بیٹھ جاتی ہوں۔“ ثانیہ نے زبردستی اسے صوفے پہ لٹا دیا۔

”مجھے چائے تو پنانے دیں۔“ ایسا نے بے چارگی سے کہا۔

”تم مجھے یہاں مہمان مت سمجھا کرو۔ بس یہ سوچا کرو تمہاری بڑی کیا آئی ہے تمہارے گھر اور تمہیں اس کے رعب کے آگے ایک لفظ بھی نہیں بولنا۔“ ثانیہ نے حکم سے کہا تو ایسا کو ہنسی آ گئی۔

”اتنی بھی بڑی نہیں ہیں مجھ سے۔ میں تو ادب و احترام کی وجہ سے آپ جناب کرتی ہوں۔“

”اب تم مجھ سے بہانے میری عمر جاننے کی کوشش مت کرو میں چائے بنا کے لاتی ہوں پھر مزید گفتگو کریں گے۔“ وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

ثانیہ کی بات سن کر مسکراتے ہوئے ایسا نے آنکھیں موند لیں۔ درحقیقت ثانیہ کے آنے سے اس کا دل بہت آسودہ ہو گیا تھا۔

یہ نہیں کہ اب وہ ایک سپرد من بن جانے والی تھی ہاں مگر اسے غلوں دل سے مشورے دینے والا مل گیا تھا۔ ”میں نے آئی سے کہہ دیا ہے کہ اب میں ان کے گھر کے کام نہیں کر سکتی اور یہ بھی کہ میں اپنی ایجوکیشن مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“

چائے پینے کے دوران ایسا نے بتایا تو ثانیہ کا چہرہ حیرت و خوشی کے امتزاج سے جگمگا اٹھا۔

”واقعی ہے وہ تو بہت ناراض ہوئی ہوں گی؟“ ثانیہ نے تشویش سے پوچھا تو آئی کی ”ناراضی“ یاد کر کے ایسا

کی پیشانی میں ہمیس اٹھنے لگی۔

”نہیں۔ ایسا کچھ خاص نہیں۔ بس خود ہی بول بول کے تھک گئیں۔ پھر میں نے معیز سے بھی یہی سب کہہ دیا۔“ وہ پلکیں جھپک کر آنسو روک رہی تھی۔

ثانیہ نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا تو باوجود ضبط کے اس کے آنسو پلکوں تک آن پہنچے۔

”میں بے وقوف نہیں بن رہی بیٹا۔“ وہ سنجیدہ تھی۔

ایسا نے بے بسی سے چور ہونے لگی۔

”وہ میرے ماں باپ کو گالی دیتی ہیں۔ مجھے حلال نہیں سمجھتیں۔ میری ماں... دنیا کے لیے وہ کچھ بھی ہوں۔ مگر میرے لیے تو بس ماں تھی۔ مٹی اور مٹی ہاں۔“ وہ رو رہی۔

ثانیہ نے لب بلبھی۔ اس کی اپنی زندگی میں پچھلے دنوں جو آثار چھاؤ آئے تھے خود اس کا کبیل میں منہ چھپائے ہوئے دنیا سے چھپ گئے لیکن رستے کا جی چاہ رہا تھا۔ مگر صرف اور صرف اس بے بس اور مجبور لڑکی کے خیال سے وہ سچ سچ اس کے پاس بھاگی چلی آئی تھی۔

”اب مجھے تمہاری چوٹ اور اس بینڈیج والی اصرہانی“ کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی ہے۔“

ثانیہ نے تلخی سے کہا تو ایسا نے لٹی میں سر ہلایا مگر گلے میں آنسوؤں کا پھندا اس قدر شدید تھا کہ اس سے صفائی میں کوئی لفظ نہیں بولا گیا۔

”خود کو مشکل میں مبتلا نہ کرو ایسا۔ ایک طرفہ محبت کرنے والے امتحانوں میں پڑے رہتے ہیں۔“

ثانیہ کر لائی۔ اسے عون یاد آیا۔ اور اپنا رویہ۔

ایسا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”تم بس پوری توجہ سے اپنی پڑھائی مکمل کرو معیز نے جو فیصلہ کرنا ہے اسے اپنی دلی رضامندی سے کرنے دو۔ اس کے پاؤں کی زنجیریں کے فیصلہ کرواؤ گی تو کبھی بھی خوش نہیں رہ سکو گی۔ اور یہ تو طے ہے کہ فیصلہ وہ اپنی

من مرضی ہی کا کرے گا تمہاری نہیں تو پھر خود کو پکان کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟“

ثانیہ نے لبے لیکھر کے بعد پوچھا تو اس نے آنسو پیتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

\*\*\*

”تم اس لڑکی کو طلاق کب دے رہے ہو معیز...؟“ وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا جب سفینہ بیگم نے پوچھا تو وہ جو کرسی کھڑک کر اٹھنے کی پوزیشن میں تھا۔ ہلکے سے مسکراتے ہوئے وہ بارہ بیٹھ گیا۔

”کبھی نہیں۔“

سفینہ بیگم کو جیسے پچھو نے ڈنکا مارا۔

”کیا بکواس کر رہے ہو معیز...؟“

”ہاں ماما میں اس رشتے کو نبھانا چاہتا ہوں۔“

معیز نے اطمینان سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو سفینہ بیگم کو اس کا ایک ایک لفظ داغ پر ہتھوڑے کی طرح رستا محسوس ہوا۔ وہ بے یقینی کی اتنی شدید لپیٹ میں تھیں کہ ایک لفظ بھی نہیں بول پاتیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





ستارہ ریاض

عکاس

مکمل ناول

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موزن ہے۔ پیے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمر ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زن العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جا رہا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کر پا رہا۔

عمر شہروز کا کزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آ جاتا ہے۔ وہ کافی متہ بچٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست اماں اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی ملاقات ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی سنگینی بروں کے فیملے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا سختی ہے۔ سر شعیب اسے بچہ پر غم بخشتے ہیں مگر اس کے باپ کے





اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکا رشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر پیچڑ اور فیلوڈ میں سے بیشتر واقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر فصالی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں زور جاتا ہے۔

73 کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

بلی انڈیا میں اپنے گریڈ پیرس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گریڈ پیرس کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گریڈ نے یہاں کو جنگ سینٹر کھول لیا تھا۔ جتنا اس کے ہاں بڑھتے آتی تھی۔ اس نے گما تھا۔ اس میں بھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گریڈ پیرس کو بتایا اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امامہ کے کسی دوسرے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زار اشروز کو بتاتی ہے۔ شروز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور ذہن دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر بدھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر اسی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والدین سن گیتے ہیں وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے اپنا مل کتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کراہندہ کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ وہ بیٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف بدھائی کرے گا۔

اس کے والد شمر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر بدھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امامہ کی والدہ شروز کو فون کرتی ہیں۔ شروز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آ جاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے جس کے بعد عمر کے والد امامہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امامہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امامہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امامہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امامہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آ جاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امامہ عمر سے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کرتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے۔ لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ حضور الہی نے بھیجا ہے۔

230 جنوری 2015

231 جنوری 2015

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گریڈ پیرس کا انتقال ہو جاتا ہے اور گریڈ پیرس کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ بلی سے کہتی ہیں کہ وہ اپنی مٹی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی مٹی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوائیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کر دیتی ہیں۔

میری کان میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہو جاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امامہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امامہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کر پاری۔ عمر کی دوست مار تھا کے شوہر نے امامہ کو گلے لگا کر مبارکباد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری۔ گھر جا کر دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔

گریڈ کے انتقال کے بعد بلی کو ہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو بلی بھی گریڈ سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ گریڈ نے انہیں بلی کا ٹکراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کر لیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کر لی۔

نور محمد احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار، عمدہ خوشبو، مہینے مہینے مٹا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے قلم مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو ابلیس نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صانورین کلن کی زہن طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ جیسے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوٹ مار بیٹ تک آگئی۔

امامہ اور عمریں دوستی ہو گئی لیکن دونوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عربی بعد اس کی ملاقات جتنا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کمراتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت املا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ قاصد کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھروالوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے باپ کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں آنے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصور وار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لا تعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئر مین حمید کا دانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی حبیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مار لی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آئی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی چیمبروس لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کو کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آ کر وہ انہی کو آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ نور محمد احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا دیتا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بو جھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

231 جنوری 2015

copied From Web





بلی ٹیا کو بے حد چاہتا ہے، لیکن وہ انتہائی خود غرض، مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فریڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فونوگرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ٹیا کو ملواتا ہے۔ ٹیا عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کمرے سے رقص کرتی ٹیا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ٹیا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویر کی مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی ٹیا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ٹیا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ نیا جیسی ہٹالائی خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو عوف سے تعلقات ہیں، زارا کے والدین زارا اور شہروز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں، جبکہ شہروز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا جینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہروز زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گریں، شغل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال سخت ازیت کا باعث بن رہی ہے۔

## کیا وہیں قسط ہے

جانے کے لیے اپنی کہنی سے سی اے ڈی طلب کرنے کا مجاز تھا۔

سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہ کام پارٹ ٹائم جاب تھا یعنی وہ اپنے جینل کا ملازم رہتے ہوئے بھی عوف بن سلمان کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ شہروز کی آنکھیں یہ سب شغف پڑھتے ہوئے حیرت سے پھٹتی جاتی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جب تنخواہ روپے سے ریالوں کا سفر کرتی ہے تو وارہ، نیارے ہو جاتے ہیں لیکن اتنے سارے دوسرے حیران کن مراعات اس نے بھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے آفر کی جاسکتی ہیں۔

اس کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس کے لیے ان سب چیزوں سے بھی زیادہ پرکشش چیز وہ سیکھنے کا جذبہ اور شہرت کا نشہ تھا جسے سوچ کر اسے جوائن کرنے سے پہلے ہی مرنا آنے لگا تھا۔ وہ دل و جان سے عوف بن سلمان کے ساتھ کام کرنے کے لیے راضی تھا۔ اسے کتنا اچھا لگا تھا کہ وہ اگر تمام شرائط کے ساتھ متفق ہے تو اسے اپنے شناختی کارڈ کے ساتھ ایک راضی نامہ تیار کروا کر باقاعدہ سعودی کہنی کے نام بھجوانا تھا تاکہ باقی تمام

## ”عوف بن سلمان“

شہروز نے کوکل کرنے کے لیے لپ لپ پڑا تھا اور پھر اپنے سامنے بڑے کاغذات کو سامنے کیا تھا۔ اسے دو دن پہلے ایک تفصیلی لیٹر اور ای میل مل گئی تھی۔ عوف بن سلمان ابھی کراچی میں ہی تھے اور واپس جانے سے پہلے انہوں نے اسے باقاعدہ اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی اور ایک تحریری اپائنٹمنٹ لیٹر بھجوا دیا تھا۔

اس کو تو صرف ایک بہت اچھے معلومے کی پیشکش کی گئی تھی بلکہ دوسرے بھی بہت سے فائدے تھے۔ میڈیکل انشورنس کے علاوہ بچے ہونے کی صورت میں ان کی تعلیم کے اخراجات اس کی آفر لیٹر کا حصہ تھے۔ اسے عوف بن سلمان کی این جی او کی طرف سے ملتی بل ویرا آفر کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سعودی عرب کے علاوہ گلف کی باقی ریاستوں میں آزادانہ آجاسکتا تھا۔ سال میں دو بونس کے ساتھ وہ فیملی ٹریپ جس میں وہ اپنی فیملی کے کسی بھی چار افراد کو لے جاسکتا تھا جس کا پورا معاوضہ کہنی کے ذمہ ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ دنیا بھر میں کسی بھی دوسرے ملک میں

مراحل طے کیے جاسکتے۔ اس کے سامنے اس کاٹریکٹ کی کاپی موجود تھی جو اسے بھجولی گئی تھی۔ اس کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ جاب اسے اتنے منظم طریقے سے آفر کی جائے گی کہ اپنی نکست پڑھت کی ضرورت پڑھے گی۔

عوف بن سلمان ابھی پاکستان میں تھے اور ان سے فون پر بات نہیں ہو پائی تھی لیکن انہوں نے ای ایمیل کے ذریعے اسے باقاعدہ میٹنگ کے لیے بلوایا تھا۔ اسی لیے شہروز لیب ٹاپ لے کر بیٹھا تھا تاکہ ان کے متعلق کچھ معلومات اکٹھی کر سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جب وہ اپنے بھائیوں اور اپنے ڈیڈی سے اس چیز کا تذکرہ کرے تو وہ عوف بن سلمان کے کوائف کے متعلق سوال کر کے کسی وہم کا شکار ہوں۔

وہ عوف بن سلمان کے متعلق انٹرنیٹ سے مواد جمع کر رہا تھا اور وہاں جو بھی مل سکا تھا اس سے شہروز کو یہی اندازہ ہو سکا کہ وہ سعودی عرب کے کامیاب اور مشہور کاروباری شخص تھے۔ ان کے لاتعداد کاروباری برامس تھے۔ وہ شاہی خاندان کے ذاتی دستوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی اپنی آئل ریفائنری تھیں۔ وہ ایک میں سعودی عرب کی جانب سے نمائندگی بھی کرتے تھے اور بیس کے قریب چھوٹی بڑی سعودی کمپنیوں کے سی ای او اور چیئرمین کے طور پر کام کر رہے تھے لیکن اس سب سے بڑھ کر وہ شوقیہ فوٹو گرافر تھے اور وہ نیشنل جیو گرافک عربیہ کے ساتھ منسلک تھے۔ انہوں نے گزشتہ کچھ سالوں میں بہت اچھی ڈاکیومنٹریز بنائی تھیں جو ایوارڈ یافتہ تھیں۔ ان کی تمام کامیابیوں کی تفصیل بھی نیٹ پر موجود تھی۔

شہروز نے کچھ ڈاکیومنٹریز کے لنکس بھی آنکھ کے تھے تاکہ فراغت میں ان کے کام اور اس کی نوعیت کا جائزہ لے سکے۔ یہ سب چیزیں سرچ کرتے ہوئے ایک عجیب سا جوش اس کے پورے وجود پر چھایا رہا تھا۔ وہ کامیاب تھا اور مزید کامیاب ہونے جا رہا تھا۔ وہ

خوش قسمت تھا اور مزید خوش قسمتی اس کی منتظر تھی۔ اس نے لینکو کے طور پر ایک چینل میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس نے نیوز کاسٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ وہ مائیکرونگ انٹر بھی رہا تھا۔ اس نے ایک بڑے نامی گرامی سیاسی پروگرام میں ایک نامی گرامی لینکو پرسن کی معاونت کی تھی۔ وہ کچھ عرصے میں اپنا ایک الگ پروگرام ہوسٹ کرنے والا تھا۔ اور اب بیٹھے بٹھائے اسے ایک بین الاقوامی لوارے کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس نے تیرہ کر لیا تھا۔ اسے تمام قانونی کارروائی پوری کرنی تھی۔



”میں ویک اینڈ پر لاہور آؤں گا۔“ شہروز نے زارا کو بتایا تھا۔

وہ بہت فرصت سے آج اسے فون کرنے بیٹھا تھا۔ اس لیے سب ضروری کام نبھا کر فراغت سے واپس پر بات کر رہا تھا۔ اس کو کل کرنے سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی تھی اور اب اس سے بات کر رہا تھا۔ بہت دن کے بعد اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ امی سے اور زارا سے بات کرے۔ اس نے عوف بن سلمان کے روجیکٹ سے متعلق تمام کاغذات تیار کر والیے تھے لیکن ابھی اس نے انہیں واپس نہیں بھجوا دیا تھا۔ کاغذات بھجوا دینے کے بعد اس کی عوف بن سلمان کے ساتھ ایک باقاعدہ میٹنگ طے ہوئی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ رکو گے؟“ زارا نے عام سے انداز میں پوچھا۔

”تم روکو گی تو رک جاؤں گا۔“ اس نے خاص الخاص انداز میں کہا تھا۔ وہ بہت مطمئن تھا اور دل چاہتا تھا سب اس کی خوشی میں خوش ہوں۔ زارا کا انداز بھلا بھلا تھا جو اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”میں چاہتی ہوں تم اپنی جاب کی طرف دھیان دو۔“ یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“ زارا کی آواز میں ابھی بھی کوئی گرم جوشی نہیں تھی۔





”ظفر کر رہی ہوں۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زارا نے بات کاٹ دی۔

”مشرق سے جو رنگ سنہری لگتا ہے وہی رنگ مغرب میں سرمئی نظر آتا ہے شہروز۔ یہ حقیقت ہے۔ لوگ اسے گرامر کی غلطی سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے صرف حقیقت بیان کی ہے۔ تم غلط مت سمجھو۔“

”میری غیر موجودگی تمہیں کیا کیا سکھار رہی ہے زارا۔“

”جو حیرت ہوں یہ دنیا کیا سے کیا ہو رہی ہے۔ لوگ جدائی میں عاشق بن جاتے ہیں۔ تم عالم بن رہی ہو۔ عالم بھی وہ کہ جس کی بات پہلی بار میں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔“ وہ خوشگوار سے انداز میں بولا جواب میں زارا کی دھیمی سی ہنسی سنائی دی۔

”تم سب لوگ بھی تو یہی ہی چاہتے تھے ناکہ زارا عقل کی چار باتیں سیکھ لے۔“

”لو سیکھ لیں زارا نے عقل کی چار باتیں۔ اب مزید کیا حکم ہے بادشاہ سلامت!“ وہ ساری گفتگو میں پہلی بار خوش مزاجی سے بولی تھی۔

”بادشاہ سلامت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں کینر کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دیکھا اینڈ پراجیسا تیار ہو کر ہر نگر سے ہر غم سے آزاد ہو کر ہمارے محل میں تشریف لائے اور وہ پیر کا طعام ہمارے ساتھ تناول فرمائے۔“ وہ اسی کے انداز میں بولا۔ زارا پھر ہنسی۔

”بادشاہ سلامت! کینر کی اردو ذرا کمزور ہے۔ آسمان زبان میں حکم دیا جائے۔“ شہروز کو اچھا لگا کہ وہ اب پر سکون ہو کر بات کر رہی تھی۔

”بادشاہ سلامت آپ کو حکم نہیں۔“ ”حکم کا اکا“

”دیں گے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بات بھی آپ کے لیے نہیں بڑی ہوگی۔“

”اس میں کینر کی کیا خطا ہے بادشاہ سلامت۔“

”آپ کو کینر کی کم فہمی کا بخوبی علم ہے۔ آپ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکم دیتے۔“ شہروز نے پہلے تقہر لگایا پھر اس نے اپنی پشت پر پڑا سرمانہ اٹھا کر دائیں جانب رکھ کر اس پر کھنٹی نکالی تھی۔ وہ اب بیٹ

کے تل لٹ گیا تھا۔

”حکم نہیں درخواست ہے ملکہ عالیہ! کہ دیکھ اینڈ پراجیسا کو گھر تشریف لائیے گا۔“

”کیوں بھی۔ کس خوشی میں دعوت دی جا رہی؟“

”ظہانیت بھرے لمحے میں پوچھ رہی تھی۔“

”آج نہیں تھک گئی ہیں۔ ان کو آرام کی ضرورت ہے۔ یہ سکون چاہتی ہیں۔ یہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔“

”زارا۔“ اس نے اتنا کہا پھر لمحہ بھر کا توقف کر کے لمحے کی ٹون یکسر تبدیل کرتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ سب نہیں کہنے والا تم سے۔“

”اوہ۔“ زارا نے اس کی بات کاٹ کر مصنوعی ناراضی سے ہنکارا پھر پھرناک چڑھا کر بولی۔

”مجھ سے زیادہ بے تکلف ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کام کی بات کرو۔ کس خوشی میں لچ کی دعوت دے رہے ہو؟“

”دو مہینے بعد گھر آؤں گا۔ دل چاہتا ہے وہ چہرے سب سے پہلے نظر آئے جو دل کو بے حد مرغوب ہے۔ اب بولو کوئی اعتراض؟“ وہ کہہ رہا تھا۔

”2 اعتراض تو نہیں ہے لیکن سوچ رہی ہوں کہ کوئی اچھی بات ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔ جو تم مجھے بتا نہیں رہے۔ کالی کالی والی کی خوشبو آ رہی ہے۔“ وہ عام سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”زارا! میں بہت خوش ہوں۔ مجھے ایک انٹرنیشنل ادارے کی جانب سے بہت اچھی آفر آئی ہے۔ حیران کن آفر زارا! میں وہ سب کچھ حاصل کرنے والا ہوں جس کا میں خواہش مند رہا ہوں۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے سارے خواب سارے عزائم اتنی جلدی پورے ہونے لگیں گے۔ میری محنت رنگ لارہی ہے۔ میں منزل کی جانب جا نہیں رہا ہوں۔ پرواز کر رہا ہوں۔ ہر قدم مجھے میری منزل کی جانب دھکیل رہا ہے۔ ثابت ہوا زارا! اللہ پاک محنت کو ضائع نہیں نہیں ہونے دیتے۔“ اس کی خوشی اس کی آواز

سے چھلک رہی تھی۔ زارا کی آواز لمحہ بھر کے لیے سناٹی ہی نہیں دی۔

”کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”میں تمہاری خوشی میں بہت خوش ہوں شہروز۔“ اس نے لمحہ بھر کا توقف کر کے اتنا کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کاٹ دی۔

”ایسے خوش ہوتے ہیں کیلئے خوش ہو تو مجھے محسوس بھی ہونا چاہیے یا۔“

”کیا میں تم لوگوں کو جانتا نہیں ہوں۔“

”میں نے بھی میری بات سن کر اسی طرح اپنی خوشی کا اظہار کیا ہے۔“

”بھی ہوئی خوشی۔“

”بے وقوف سمجھتے ہو تم لوگ؟“ شہروز زہم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسے اچھا بھی نہیں لگا تھا۔

”شہروز! تم اپنی منزل کی جانب جا رہے ہو۔ تم آگے بڑھ رہے ہو۔ بہت آگے۔ ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہمیں پیچھے مت چھوڑو شہروز۔“ وہ یقیناً رو رہی تھی۔

”شہروز کو مزید برا لگا۔“

”تم لوگ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے ہو۔ تم لوگوں کو لگتا ہے کہ شہرت مجھے نکل جائے گی۔ کیا میں اتنا کم ظرف ہوں کہ اپنے پیازوں کو بخول جاؤں گا۔“ وہ چڑ کر بولا تھا۔

”یہ بات نہیں ہے شہروز! مجھے خود نہیں پتا کہ میں اتنی بے سکون کیوں ہوں۔ کوشش کے باوجود دل مطمئن نہیں ہوتا۔ شاید میں تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔“

”وہ تو میں بھی تمہیں کرتا ہوں زارا۔ تم سب لوگوں کو کرتا ہوں۔“ وہ اس سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلا رہا تھا۔ اسے شرمندگی تھی کہ وہ زارا کی جذباتی کیفیت جانتے ہوئے بھی اسے زیادہ فون نہیں کیا تھا۔

”تم ناراض مت ہو شہروز۔ میں نہیں اپنے دل کا حال بتا رہی ہوں۔ میں بعض اوقات بہت ڈر جاتی ہوں۔ میری خود بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ لیکن شہروز! میں کم عقل نہیں ہوں۔ پتی۔ لیکن میں کیا کروں۔ محبت کے فارمولے میں

# ماہنامہ دکن

جنوری 2015 کا شمارہ شائع ہوگا

”بیاد ابن انسان“

سالانہ کے موقع پر مختلف ادکاروں سے دلچسپ سروے

ادکار ”سمیرا حسن“ سے شاہین رشیدی ملاقات

ادکار ”سمیع خان“ کہتے ہیں ”میری بہن سنیہ“

اس ”پاراس نساہ“ کے ”مقابلہ میں آئینہ“

”اک مسافر ہے اند گئی“ فیروز سید کا سلسلہ وار ناول

”دوائے وھا“ فریسن الفکر کا سلسلے وار ناول

”درجہ محبت“ فلیش انک کا مکمل ناول

”فصل دل“ مصباح علی کا مکمل ناول

”خالہ، سانا اور اوپو والا“ فاخر علی کی دلچسپ مزاحیہ ناول

”محبت نیچے گرنے لگے“ سلیٹی انیمیشن کا ڈراما

”جو دل چاہے“ نازیہ نال کا ناول

”اپنا ہی ہوتا ہے“ راشدہ رفعت کا ناول

نوبت نہیں بنیاد۔ لڑکی جیم، نورین اور نرمانی کے

انسانے اور مستقل سلسلے

ایک انشائیہ مسابقہ کا نصاب

دعوتِ اعلیٰ

ان کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات

ماہنامہ دکن 2015 جنوری

ماہنامہ دکن 2015 جنوری

copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



عقل صفر کا کام کرتی ہے۔ یعنی کوئی کام نہیں کرتی۔ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ ناکارہ ہو جاتی ہے۔ میں بالکل ناکارہ ہو چکی ہوں۔ مجھ سے کوئی کام نہیں ٹھیک ہوتا۔ میری وجہ سے ایک عورت کی جان چلی گئی۔ میں اتنے دن سے اسپتال نہیں جا سکی۔ میرا دل بھی نہیں چاہتا جانے کو اب مجھے اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا میں نے سوچا ہے میں یہ سب چھوڑ دوں گی۔

اس کے لیے میں اتنی بے چارگی تھی کہ شہروز چپ کا چپ رہ گیا۔ وہ ذہنی طور پر بہت تھک ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ شہروز کو اپنے دہیے پر انوس ہوا۔ وہ اسے بہت چاہتی تھی۔ یہ بات اس نے بھی چھپائی نہیں تھی اور یہ شہروز کی زندگی کا سب سے طاقتور احساس بھی تھا لیکن وہ اتنی بے یقین رہتی تھی تو شہروز کو برا لگتا تھا۔ گزشتہ کچھ مہینوں میں ان کے درمیان نہ جاتے ہوئے بھی کچھ فاصلے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن شہروز خود کو تصور دار سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”زارا پلیز اس فیئر سے نکلنے کی کوشش کریں۔ بہادری سے اپنی غلطی تسلیم کرو اور دوبارہ سے ڈیوٹی پر جانا شروع کرو۔“ شہروز نے اتنا ہی کہا تھا کہ زارا نے اس کی بات کٹ دی۔

”خواب کی بات مت کرو۔ اسے چھوڑو۔ میری کیا غلطی ہے۔ میں تو محبت کے ہاتھوں خوار ہو رہی ہوں۔“ وہ بے حد اکتا کر بولی تھی۔ شہروز کو بہت برا لگا۔

”تم اس بات کے لیے بھی مجھے ذمہ دار سمجھتی ہو زارا۔ کم آن یا ر! اب اتنی زیادتی بھی مت کرو یہ میری وجہ سے نہیں ہوا اس کی وجہ تمہاری اپنی غیر ذمہ داری ہے۔ تم اپنی لالچالی فطرت کو بدلو۔ ایک ڈاکٹر کے لیے غیر ذمہ داری اچھی چیز نہیں ہوتی۔“ چھپو نے تم میں ذمہ داری پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ اس میں بھی میرا تصور ہے کیا؟ عجیب بات کرنی ہو تم۔ اب کیا سولہ سال کی چھوٹی سی لڑکی ہونے کو کہ یہ باتیں بھی ارد گرد کے لوگ سمجھائیں گے۔ اب بڑی ہو جاؤ پلیز۔ تم المائے کی جانب نہ بھو۔ وہ بھی تو اپنے پیرئش کی اگلوٹی

بٹی ہے، لیکن کتنی ذمہ داری ہے اس کی طبیعت میں۔ عمر جیسے بندے کو بدل کر رکھ دیا ہے اس نے۔ وہ بہت برداشت کرتے ہوئے اسے محبت سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تم المائے کے ساتھ میرا موازنہ مت کرو۔ عمر اس کو میرے جیسے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔“ زارا نے چڑ کر اتنا ہی کہا تھا کہ شہروز نے اس کی بات کٹ دی۔

”اب تم اپنے عظیم الشان مسائل کا رونا روٹنے لگ جانا۔ تم نے بلا وجہ کے مسئلے پال رکھے ہیں۔ تمہارے ہال اچھے نہیں ہیں۔ تمہیں بھوک نہیں لگتی۔ تم کمزور ہو گئی ہو۔ تمہاری سینسز تم سے خار کھاتی ہیں۔ بڑی ہو جاؤ زارا! خدا برا بڑی ہو جاؤ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔“ شہروز اسے چڑا رہا تھا لیکن زارا کو بے حد برا لگا۔ شہروز کو اس کا اندازہ تب ہوا جب اسے دوسری جانب سے کافی دیر تک کوئی جواب سننے کو نہیں ملا تھا۔ زارا نے کل کٹ دی تھی۔ شہروز نے چڑ کر فون بستر پر دوڑ پھینک دیا تھا۔

”مجھے خوشی ہے کہ آپ کو اپنا آفریڈر پسند آیا ہے۔“ عوف بن سلمان نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ پریل کائی ٹینٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ملاقات کے وقت سے پانچ منٹ پہلے سینچنے والا شہروز انہیں ڈائمنڈ ہال میں بیٹھا دیکھ کر شرمندہ ہو گیا تھا لیکن ان کا رویہ بہت اچھا تھا۔ جس سے اس کی شرمندگی زائل ہو گئی تھی۔ وہ اتنا کامیاب اور امیر ترین بزنس مین شخص تھا، لیکن بہت ہی عاجز اور ہنسار بھی۔

”میں چند باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ انہیں ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ اگر آپ میرے ساتھ کام کرنے کے لیے رضامند ہیں تو میں مزید کچھ چیزیں ابتدائی ہی واضح کرنا چاہتا ہوں۔ رازداری ہماری پہلی شرط ہے۔ ہم بہت جیساں

موضوعات پر کام کرتے ہیں اور جب تک ہمارا کام مکمل نہ ہو جائے ہم اس کے متعلق کسی سے بات کرنا سخت ناپسند کرتے ہیں۔ آپ ایک مشہور چینل کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ آپ کو کافی رائٹس کے بارے میں بتانا آپ کے سامنے اس لیلڈ میں ہونے والی دھاندلی کا ذکر کرنا محض وقت کا ضیاع ہو گا۔ ہم بہت منظم طریقے سے کام کرتے ہیں اور بہت سے وہ سربراہ کاسٹنگ آرگنائزیشنز کے ساتھ روابط بھی ہیں لیکن ہم اپنے پروجیکٹس کے بارے میں کبھی کسی سے بات نہیں کرتے۔ میرے ساتھ میرے ان پروجیکٹس پر مختلف انتھنکس کے لوگ کام کرتے ہیں لیکن رازداری کا خیال رکھنا ہم سب پر لازم ہے۔ میں اس کی خلاف ورزی ذاتی طور پر بھی پسند نہیں کرتا اور یہ ہمارے کام کی ضرورت بھی ہے۔ میرے ساتھ کام کرنے والا ہر شخص اس بات کا پابند ہے اور میرے ساتھ کام کرنے والے بہت سے لوگ مختلف آرگنائزیشن سے مختلف براڈ کارپوریشن سے تعلق رکھتے ہیں یعنی صرف آپ ہی نہیں ہی بہت سے لوگ ہیں جو چیلنج قبول کرتے ہیں اور ہر نئی چیز سیکھنا چاہتے ہیں۔ جن کی زندگی کا ہر لمحہ انسانیت کی خدمت ہے۔ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ رازداری رکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارا کام جدت پسند ہوتا ہے۔ ہمارا اپنا ایک طریقہ ہے۔ میں اسے پیش کرنے سے پہلے کسی قسم کی پروجیکشن پسند نہیں کرتا۔ مجھے یہ پسند ہے۔ آپ یوں سمجھ لیجئے مجھے اس میں مزہ نہیں آتا۔“

انہوں نے اپنے دونوں بالوں میز کی چکنی سطح پر رکھے تھے۔ شہروز اس دوسری ملاقات میں ان سے پہلے سے بھی زیادہ مرعوب ہوا تھا۔ وہ لگ بھگ پچاس سے زیادہ کے لگتے تھے لیکن ان کی پشت بالکل سیدھی تھی۔ ان کا انداز نشست بھی ایسا تھا کہ مجال ہے ذرا بھی خم آیا ہو۔ براؤڈ بھورے رنگ کے سوٹ میں خوشبو میں اڑتا خود سلیٹھ سے جھے ہال اور چہرے پر ہلکی داڑھی سب جیسے سلیٹھ اور شائستگی کی اپنی مثال تھے۔ شہروز کو

بہت سے سیاست دانوں سے کاروباری افراد سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن ایسا مرعوب وہ کسی سے نہیں ہوا تھا۔ عوف بن سلمان مردانہ وجاہت اور شائستگی کی اعلیٰ مثال تھے۔ انہیں بھی شور مچانے سے زیادہ اپنا کام کرنے پر یقین تھا ہوں سب۔ یہ میری نوکری سے زیادہ میری طبیعت کا معاملہ ہے۔ میں اپنا کام ہمیشہ سے اپنے بھروسے پر مکمل کرنے کا عادی رہا ہوں۔ یعنی میں ایسے پروجیکٹس کرنا ہی نہیں ہوں جس میں بہت زیادہ لوگ شامل ہوں۔ ایسی صورت حال میں رازداری کی شرط اہم نہیں رہ جاتی۔“ شہروز نے اپنی دلی کیفیت چھپا کر اعتراف کیا تھا۔ اس میں ایک خلی تھی۔ وہ اپنی عزت نفس کو ہمیشہ اہمیت دیتا تھا۔ یہ اس کی ٹریننگ کا حصہ تھا۔ عوف بن سلمان نے سر ہلایا جیسے سراہ رہے ہوں۔

”شباب! (نوجوان کو مخاطب کرنے کا مخصوص انداز) میں ایک چیز کا قائل ہوں۔ نئے تعلقات بناتے ہوئے حقیقت اور وصیت کھل کر بتانی چاہیے۔ اس سے ناکامی کا ریسک کم ہو جاتا ہے۔“ وہ مزید کہہ رہے تھے۔

”میں جانتا ہوں آپ ایک اچھے صحافی ہیں اور آپ میں نئی چیزیں سیکھنے کا آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ میں پہلی نظر میں آپ کی شخصیت میں چھپے ایسارک کو پہچان گیا تھا۔“

شہروز کا خون سیروں بڑھ گیا تھا۔ اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ وہ اس کے بارے میں ایک فلاسٹ میں اتنا کچھ کیسے جان گئے تھے لیکن تعریف کے نشے نے اس کی حیات کو جیسے لپٹ کر ایک سائڈ پر رکھ دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے خود ہی فرض کر لیا تھا۔ وہ اتنا قائل ہے کہ ایک نئی چینل پر کام کرنے سے مشہور و معروف ہو چکا ہے اور دنیا بھر کے لوگ اسے جانتے ہیں اور یہ شان دار نوکری اسے اس کی قابلیت کی وجہ سے آفر کی گئی ہے۔

”میں ایک صحافی ہوں سب۔ مجھ سے زیادہ سچائی کی



اہمیت کون جان سکتا ہے۔ اس نے ابھی بھی اسی انداز میں بات کی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ میرے دل کو اچھی چیزیں بھاتی ہیں۔ میرا اصول ہے کہ آنکھیں ہانک ہانک منہ بے شک بند رکھیں، لیکن اپنے دل کو قفل مت لگائیں۔ دل انسان کے جسم کا قطب نما ہوتا ہے۔ یہ منزل کی جانب جانے والے راستے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کی رہنمائی کو ہمیشہ ترجیح دیں۔ آپ اگر میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ یہاں بھول بھلیاں بہت ہیں۔ ہر قدم آپ کو جو کناہ کراٹھانا پڑے گا۔“

وہ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ شہروز کو ان کی اس بے وجہ کی سنسنی پھیلاتے انداز سے الجھن ہوئی۔ وہ وضاحت طلب انداز میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

”آپ کو جس پروجیکٹ کی آفر کی گئی ہے اس کا بنیادی موضوع دہشت گردی ہے۔ آج کی دنیا کا سب سے ترسناک موضوع ہے دہشت گردی۔ مذہب اسلام کے ماتھے پر اس سے بڑا کلنگ آج تک نہیں لگا ہو گا۔ آپ اس کلنگ کو منانے لگیں گے تو آپ جہاد کے راستے پر ہوں گے۔ یہ راستہ آسان نہیں ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کو جس طرح ان چیزوں میں ملوث کیا جا رہا ہے اور اس کی کیا وجوہات ہیں ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے آپ کو ہر چپاکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چاہے وہ آپ کو پسند آئے یا نہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرا حالیہ پروجیکٹ دنیا کے سامنے اسلام کا مثبت چہرہ پیش کرنے سے متعلق ہے۔ میں اس کام کو جہاد سمجھ کر کر رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی اہرام کا شکار ہوں۔ آپ کو ذہنی تلامذہ کے ساتھ یہ جانتے ہوئے اپنا کنٹریکٹ سائن کرنا چاہیے کہ یہ راستہ آسان نہیں ہے۔ آپ کو بہت سے مقام پر اپنے ہی لوگ غلط سرگرمیوں میں ملوث ملیں گے جنہیں آپ کو بے نقاب کرنا پڑے گا۔ میں پھر کہوں گا آپ کو ایسی ہر چیز ذہن میں رکھ کر اس جانب کو قبول کرنا پڑے گا۔“

آپ کو یہ سب منظور ہے تو بسم اللہ ورنہ واپسی کے دروازے ابھی کھلے ہیں۔“

انہوں نے لفظ ”ابھی“ پر زور دیتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔ وہ گفتگو کے دوران اس کا بغور جائزہ لیتے رہے تھے۔ شہروز نے سر ہلایا۔ یہ ساری باتیں اس کے لیے اتنی غریبی نہیں تھیں۔ رازداری تو اس نے ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھی تھی اور اچھے برے کا فرق بھی وہ اب جان چکا تھا۔ اتنے چھپلور کی لڑ میں اپنے کام کو منفرہ اور مختلف رکھنے کے لیے یہ سارے حربے سب ہی آزماتے تھے سو اس میں نیا کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ کسی پروجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لیے اتنی محنت تو کمل پڑتی ہے۔

”میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جس سے مجھے کچھ سیکھنے کو ملے۔ مجھے روپے پیسے کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنا تجربہ بڑھانا ہے، اپنا علم بڑھانا ہے۔ یہ ہی میرا شوق ہے۔ یہ ہی میرا جنون ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ایک مشکل پروجیکٹ کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ آپ کے انداز سے لگ رہا ہے کہ یہ بہت زبردست پروجیکٹ ہو گا۔ میں اس کے لیے آپ سے زیادہ پرجوش ہوں۔“ وہ میز پر پڑے گلدان میں موجود پھولوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا عزم اس کے چہرے سے چھلکتا تھا۔ اس کی استقامت اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

یہ تھیں وہ خصوصیات جو عرف بن سلمان جیسے جوہری نے بجانب لی تھیں۔ یہ ہی تھے وہ جذبے جو انہوں نے دنیا بھر میں گھوم کر سمیٹے تھے اور ایسے ہی تھے وہ لوگ جو ان کے ساتھ کام کرتے تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے راضی نامے پر دستخط کیے تھے اور پھر کاغذات اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔ شہروز نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

”میں اس عزت افزائی پر ممنون ہوں سر اور پوری توانائی آپ کے اس پروجیکٹ کو دینے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کیا کر رہی ہو؟“ زارا راکنگ چیر پر بیٹھی بلا وجہ اُدھر اُدھر جھول رہی تھی۔ جب عقب سے مٹی کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ کم ہی اس طرح اس کے کمرے میں آتی تھیں۔ انہوں نے کچھ سے کچھ پرے پن رکھے تھے اور ان کے شولڈر کسٹیل بکھرے بکھرے تھے۔

اس نے شاید تین دن پہلے کو دیکھا تھا، تین دن پہلے بھی وہ کچھ ست سی تھیں۔ جب زارا نے انہیں رات کے کھانے پر دیکھا تھا۔ وہ ان سے کترانے لگی تھی اور کوشش کرتی تھی کہ اس کامی سے سامنا کم سے کم ہو۔ وہ ابھی تک اسپتال نہیں جا رہی تھی۔ مٹی کی تاکید کے باوجود اس نے ایک دن بھی اپنی ڈیوٹی نہیں دی تھی۔ ایک مہینہ ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک روٹین کے مطابق اسپتال جانا شروع نہیں ہوئی تھی۔

اب احساس جرم سے زیادہ اس کی اذلی کالی اس کی بڑی وجہ تھی۔ اس کی طبیعت کسی چیز کی طرف مائل نہیں ہوتی تھی۔ شہروز نے اسے بتایا تھا وہ لندن جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ لاہور آیا تھا تو ایک ہفتہ رہا تھا۔ زارا ایک بار مٹی کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی اور زندگی میں پہلی بار اسے شہروز اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ است بدلتا جا رہا تھا اور اس بات کا شکوہ سب کو تھا جبکہ وہ اسے سب کا وہم اور اپنی مصروفیت قرار دیتا رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ سب سے لاپرواہ ہونا جا رہا تھا۔ اسے کسی کا احساس نہیں رہا تھا۔

وہ اپنی کامیابیوں کا ذکر کرتا رہتا تھا اور وہ اس معاملے میں کسی قدر مغرور ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائیوں اور اپنے ڈیڈی کے سامنے بھی اپنا موقف اس طرح بیان کرنے لگا تھا جیسے صحافی ہونے کے بعد صرف وہی واحد شخص ہے جو حق اور سچ بیان کر سکتا ہے۔

وہ لندن جا رہا تھا۔ اس لیے امانتہ اور عمر وغیرہ کے لیے شاپنگ کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ زارا نے انکار کر دیا تھا۔ زارا کو اس کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ اپنی کامیابیوں کو اپنی محنت اور زارا کی ناکامیوں کو اس کی غیر ذمہ داری اور

لا پرواہی قرار دیتا تھا۔ شہروز کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ شہرت کا نشہ اس کے منہ کو لگ چکا تھا اور شہرت انسان کو زندہ کھا جاتی ہے۔

زارا کی کمزور شخصیت کو اس کے رویے سے مزید دکھ ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ صرف اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئی تھی اور اپنی مٹی کو بھی نظر انداز کرنے لگی تھی۔ اس لیے انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر اس نے مثبت رسالے نہیں دیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اس سے پوچھیں گی کہ وہ کب سے ڈیوٹی پر جا رہی ہے۔ ان کے درمیان اس موضوع پر ابھی تک بات نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ مٹی کی آنکھوں میں چھپے سوال کو پڑھ سکتی تھی۔

”میں بس یوں ہی بیٹھی تھی۔“ اس نے سادہ سے انداز میں جواب دیا۔ پھر ان کو وارڈ روم کی جانب جاتا دیکھ کر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مٹی کھٹکی کھٹکی ی ہیں۔ وہ صبح جب اسپتال کے لیے نکل رہی تھیں۔ تب بھی زارا نے انہیں بالکونی سے جلتے دیکھا تھا اور اسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ بیمار ہیں۔

”کپڑے دیکھنے کے لیے نہیں ہوتے، پہننے کے لیے ہوتے ہیں۔“ انہوں نے اس کے ہانگ کیے ہوئے سوئٹوں کو دیکھ کر بات برائے بات کی تھی۔ وہ ہمہ وقت اس کے کچھ لور شکلوں والے کپڑوں میں لمبوس ہونے کی وجہ سے اسے ٹوک رہی تھیں۔

زارا ابھی بے وجہ پھٹکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا چہرہ دیکھنے لگی کہ وہ مدعا بیان کرے۔ وہ طے کر چکی تھی کہ وہ مٹی کے استفسار پر کہہ دے گی کہ آنے والے ویک اینڈ کے بعد سے وہ ڈیوٹی پر جانا شروع کر دے گی۔ اور جب جلنے کا دن آئے گا تو دل چاہے گا تو چلی جائے گی۔ ورنہ پھر کوئی بہانا بنائے گی۔ اسی لیے وہ مٹی کی باتوں کے جواب دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھی۔

وہ سری جانب اس کی مٹی صرف اس کے کپڑوں کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

”تمہارے پاس گرنیڈوں کے سب کپڑے پرانے



# MEDICAM

Bleach Cream

## Whiteness in 14 days

"No Side Effects"



رکے سپر نظر .... آپ پیر!

ہیں نا۔ تم نے اس بار کوئی ایک بھی چیز نہیں خریدی۔ اتنے اچھے اچھے کلرز کسے ہیں بریزے پر۔ بھانسی تھا رہی تھیں 'ہروز' کے کسی دوست کی بہن نے صدر میں بوتھک بنائی ہے۔ بہت اچھے ڈریسز ہیں اور قیمت بھی مناسب۔ کسی دن چلو میرے ساتھ۔ تمہیں شوز اور بیگ بھی لے کر دوں۔ یہ ہی ایک براؤن بیگ لیے پھرتی ہو۔ بہت پرانا ہو گیا ہے۔ تمہارا دل نہیں کرتا اپنے لیے شاپنگ کرنے کو۔ لڑکیوں کو تو اتنا شوق ہوتا ہے خریداری کا۔"

انہوں نے وارڈروب کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا۔ پھر اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے الماری بند کی تھی۔ اور اس کے بستر پر بائیکس سیٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ فرصت سے اس کے پاس بیٹھنے کے لیے آئی ہیں۔

زارا نے اپنی آئینا ہٹ چھپاتے ہوئے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔ اس کی یادداشت میں کوئی ایسا لمحہ نہ تھا۔ جب مئی نے اس سے ایسے کوئی بات کی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ خریدتی یا لاتی نہیں تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے ہریزن میں اس کے لیے اپنی مرضی سے کپڑے جوئے خرید لایا کرتی تھیں اور یہ سلسلہ اس کے بچپن سے ہی چل رہا تھا۔ عمر کی شاوی وہ پہلا موقع تھا۔ جب زارا نے اپنے لیے کوئی لباس خود جا کر خریدا تھا اور تب بھی وہ اپنی نمائی یعنی شہرہ زکی امی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھی۔

"آپ لے آئیں میرے لیے۔ مجھے کہاں مینس ہے ایسی چیزوں کا۔" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کا دل اور دماغ ایسی چیزوں میں نہیں لگتا تھا اب۔

"زارا! یہاں آؤ میرے پاس۔" انہوں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اٹھ کر ان ہی کے پاس آ رہی تھی۔ لیکن ان کا اس طرح کہنا اسے بہت عجیب لگا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے پاس آ گئی تھی۔

زارا ایک لمحے کے لیے تو سس سی ہو گئی۔ اسے نہیں یاد تھا کہ اس کی ماں نے آخری دفعہ اسے کب گلے لگایا تھا۔ وہ چند ثانیے کے لیے ان کے لمس کو محسوس کرتی رہی۔ پھر اس نے خود کو ان کی بانہوں میں ڈھیلے چھوڑ دیا تھا۔ کتنا سکون تھا! ماں کی آغوش میں اور اسے یہ آغوش اپنے ہوش و حواس میں اس انداز میں پہلی بار میسر ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بالوں میں نمی کو محسوس کیا۔ مٹی رد رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بھی تر ہونے لگیں، لیکن کتنے مزے کے تھے یہ آنسو جو سکون عطا کر رہے تھے اور کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں تھا اور ان



دونوں کو خواہش بھی نہیں تھی کہ کوئی ان آنسوؤں کو پوچھتا۔

”آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں کیا ہوا ہے؟“ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ مت پریشان ہوں گی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں پیرے ڈیوٹی پر چلی جاؤں گی۔“ اس نے ان کو تسلی دی تھی۔

”میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی زارا! مجھے پہلے ہی ایسا لگتا ہے کہ میں نے تم پر اپنے فیصلے مسلط کر کے تمہیں مفلوج کر دیا ہے۔ تمہیں اپنے اشاروں پر چلا چلا کر تمہیں اس قابل نہیں جوڑا کہ تم اپنی مرضی سے اپنے لیے کوئی جوڑا ہی خریدو۔ لیکن زارا! میری نیت پر شک مت کرنا میرے بچے میں تمہاری ماں ہوں اور مجھ سے زیادہ تمہیں کی نہیں مہاہ سکتا۔ میں نے تمہیں اپنے رول میں چھپا کر تمہاری پرورش کی، تاکہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو، کوئی زندہ نہ پہنچے۔ تم سے پہلے میرے تین بچے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی اللہ کے پاس واپس چلے گئے۔ تمہیں بہت منتوں، مرادوں کے بعد پایا تھا۔ تم بہت قیمتی ہو میرے لیے۔ اسی لیے ہمیشہ یہ خدشہ لاتی رہا کہ کوئی میری اتنی قیمتی بیٹی کو نقصان نہ پہنچا دے۔“

وہ اس کے بالوں میں اٹکایا چلاتے ہوئے بول رہی تھیں۔ زارا کو عجیب سی زندگی ہوئی۔ وہ اسے صفائی کیوں دے رہی تھیں۔ اسے اس ساری صورت حال میں کچھ عجیب سا احساس ہونے لگا تھا۔

”میں جانتی ہوں ماما۔ آپ ایسے بات مت کریں۔“ وہ منہ ان کی جانب بے ہوش رہی تھی۔ زارا کچھ خوف زدہ ہوئی تھی۔ لایا سوچ رہی تھیں۔ ان کے دل کو یک دم کیا خدشہ لاحق ہو گئے تھے۔ کیا ان کی ماموں یا شہروز سے کوئی بات ہوئی تھی۔ کیا پھر وہ اس کی شادی کے مسئلے کے پریشان تھیں۔

”مجھے بات کرنے دو زارا! میں اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ میں آج کل بہت دہمی ہو گئی ہوں۔ زندگی، موت کا بھروسہ کیا ہے آج ہوں۔ کل نہیں رہوں گی۔ میرے بعد کون تمہیں سنبھالے گا زارا!۔“

کاش تمہارا کوئی بھائی ہوتا یا بہن ہی ہوتی کوئی تو ہوتا۔ ماما باپ کے بعد بہن بھائی ہی ہوتے ہیں جو سہارا دیتے ہیں۔ باقی سب تو بے کار کے۔ بھلا دے ہیں۔ کوئی رشتہ دار دوست احباب یا کزن کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ سب کو اپنے مقصد اپنے عزائم عزیز ہوتے ہیں۔ سب کے لیے اپنی ذات پہلے ہوتی ہے۔ باقی اس کے بعد آتے ہیں۔ یہ ہی دنیا ہے۔“ ان کے لہجے میں اب کی بار عجیب سی آکٹاہٹ تھی۔ زارا دل میں چوری چوری ہوتی۔

”آپ کی شہروز سے بات ہوئی ہے کیا؟“ اس نے ان کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”شہروز کی بات مت کرو۔ مجھے اس کے متعلق بات نہیں کرنی۔ مجھے آج کسی غیر متعلقہ شخص کے بارے میں بات نہیں کرنی۔ ہم آج اپنی باتیں کریں گے۔ وہ باتیں جو ہم نے آج تک نہیں کی ہیں۔ تمہاری اور میری باتیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں زارا! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ بہت زیادہ محبت۔ تم بھی یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے محبت نہیں کرتی تھی۔“

وہ بہت جذباتی ہو رہی تھیں۔ زارا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کی گفتگو بے ربط تھی۔

”ماما! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ میں جانتی ہوں۔ محبت کوئی ناپے کی چیز تھوڑی ہوتی ہے کہ زیادہ یا کم کا فیصلہ کیا جائے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔ پلیز ایسی باتیں مت کریں۔“ وہ رو رہی ہو رہی تھی۔

”ہاں۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔ چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں۔ کسی مال میں چلتے ہیں۔ ہم بھی تو دیکھیں زارا کہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں کتنی اہم ہوتی ہیں۔“

وہ کہہ رہی تھیں۔ زارا نے ان کے چہرے پر پھیلی بے چینی کو دیکھا تھا۔ ایسا پتہ چلا کہ وہ پتہ چلا کہ شاید ہی پہلے کبھی ہوا ہو۔

”آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ آئیں، میں

آپ کا بلڈ پریشر چیک کروں پہلے۔ کیا ہو رہا ہے آپ کو۔ مجھے بتائیں۔“ اس نے بستر سے پاؤں نیچے اتارتے ہوئے۔ ان کا ہاتھ تھلا۔

”ٹھیک ہوں میں۔ بس۔ یوں ہی سہتا نہیں۔“ انہوں نے بے ربط سے انداز میں کہا۔ پھر وہ اسی کے بیڈ ریلٹ گئی تھیں۔

زارا اچھی پھٹی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی، لیکن ابھی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔

”ماما! کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ وہ چلائی تھی۔ ماما نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا، خود کو سہلایا تھا اور اس کو دیکھ کر مسکرائی تھیں اور آنکھیں موند لی تھیں۔

”ماما! کیسی۔“ زارا ان پر جھپٹی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے ان کی نبض جانچی۔ سینے پر ہاتھ رکھا، پھر وہ فون کی جانب لپکی تھی۔ یہ ایمر جنسی کیس تھا۔ ایمر لینس کی فوری ضرورت تھی۔

\*\*\*

ماں کی ضرورت زندگی میں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کی محبت آکسیجن کی طرح ہوتی ہے، جس کی ضرورت آخری سانس تک رہتی ہے اور جب یہ نہیں رہتی تو ان کی ضرورت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ زارا نے یہ بات اپنی ماما کے جانے کے بعد سیکھی تھی۔ وہ بہت مضبوط عورت تھیں، اتنی مضبوط کہ انہوں نے اپنے ارد گرد رہنے والوں کو بھی کبھی اپنی ذات میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ ماما کو اس کی پروا نہیں ہے۔ وہ اس کی پریشانیوں میں پریشان نہیں ہوتی۔ وہ جب اتنی بے سکون رہتی ہے تو یہاں پہلے کے باوجود ہمیشہ بے سکون رہتی ہیں۔ وہ پریقین تھی کہ ماما اس سے محبت ہی نہیں کرتیں۔ وہ اس سے لاپرواہ رہتی تھیں تو اس نے بھی ان سے لاپرواہ رہنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے اپنے دائروں میں اپنی اپنی زندگیاں جینے لگے تھے۔ انہوں نے ان دائروں کی

خلاف ورزی کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط رابطہ بنانے کی کوشش ہی ترک کر دی تھی جو تعلقات میں بے حد ضروری ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ماما کے انتقال نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی تھی۔

”کیا کوئی ایسے بھی چلا جاتا ہے چھوڑ کر۔“ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ابتدا میں سب لوگ اس پاس تھے۔ ماموں احسان بھی لندن سے آگئے تھے۔ کسلی والا سا دینے کے لیے رونے کے لیے کوئی نہ کوئی کندھا میسر رہا، لیکن پھر کچھ دن بعد ہی سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہونے لگے۔

شہروز بھی چند دن میں تین مہینوں کے لیے لندن جانے والا تھا۔ اس کی واپسی پر بالآخر یہ طے پا گیا تھا کہ ان دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ زارا سب کے چہرے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرتی تھی۔

اس نے ماما کی زندگی میں ہمیشہ ان کی مداخلت کو ناپسند کیا تھا اور اب ان کی وفات کے بعد وہ سارا دل یہ سوچتی رہتی تھی کہ اب کیا کرے گی، کیسے زندہ رہے گی۔ اسے ان کے بغیر ایک قدم اٹھانے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی، لیکن ان کی وفات سے اس نے یہ ضرور سیکھ لیا تھا کہ بعض اوقات بڑے بڑے حادثے زندگی میں انسان کو کمزور کرنے کے بجائے بہادر بنا دیتے ہیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے زندگی میں جو کرنا تھا، عقل مندی سے، بہادری سے کرنا تھا۔ اس کی غلطیوں پر پردے ڈالنے والی ماما اب نہیں رہی تھی۔

\*\*\*

”میں تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔ دس منٹ میں اگر تم باہر نہیں آئیں تو سنکچ کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔“

یہ دس دن بعد کی بات تھی۔ وہ ماما سے گھر صاف کر رہی تھی، جب فون کی بیل بجی تھی۔ دوسری جانب بیٹھو تھا۔ زارا کو اس شخص کا انداز اب ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ ماما کی تدفین والے روز بھی وہ کچھ دیر



کے لیے آیا تھا، لیکن زارا سے بات نہیں ہو پائی تھی۔  
”فرض کیجئے میں نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے آپ۔“

اس نے بات کرنے کے ساتھ ساتھ ماسی کو اشارے سے میز کے نیچے سے کچرا نکالنے کے لیے کہا تھا۔ کافی دن سے صفائی ستھرائی ٹھیک سے نہ ہونے کے باعث کافی کچرا جمع تھا۔

”بحث کرنے کا وقت تو ہے میرے پاس، مگر آج ہمت نہیں ہے۔ تمکا ہوا ہوں۔ اس لیے مولیٰ فرما کر دس منٹ میں تشریف لے آئیے۔“ وہ سابقہ انداز میں بولا تھا۔

”کہاں جاتا ہے؟“ زارا نے منٹوں میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اس کے ساتھ جانا ہے۔

”سوال مت پوچھو، تشریف لاؤ، سوال پوچھ پوچھ کر تم ذہین نہیں ہو جاؤ گی۔“ وہ چڑ کر بولا تھا۔

زارا نے فون بند کیا تھا، پھر ماسی کی ضروری ہدایات دے کر فریش ہونے میں اس نے واقعی دس منٹ ہی لگائے تھے۔ گیٹ کیپر کو گیٹ کھولنے کا کہہ کر اس نے گاڑی اشاریٹ کی تھی اور ابھی پوری طرح باہر بھی نہیں نکلی تھی کہ وہ سامنے سرخ آٹو میں بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ وہ اشارے کر رہا تھا کہ اپنی گاڑی اندر کر لو۔

زارا نے کچھ دیر سوچا تھا، پھر وہ گاڑی سے نکل آئی تھی۔ گیٹ کیپر کو چابی تمکا کر وہ اس کی آٹو میں آ بیٹھی تھی۔

”اب تو بتاؤں کہاں جاتا ہے؟“ اس نے بیٹھتے ہی سوال کیا تھا۔ ٹیپو نے گاڑی ریورس کی تھی۔

”میرے گھر۔ اپنی امی سے ملواؤں گا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ زارا نے سر ہلایا۔ اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔

وہ راستے وینڈکٹی بار گئی تھی، لیکن کبھی ٹیپو کے گھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ زارا جانتی تھی کہ اس کے گھر میں اس کی امی ہی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی امی کی باتیں جاتا رہتا تھا۔ اس کی امی کی اور اس کی بہت ٹوک جھوٹک ہوتی تھی۔ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا اور ٹریفک

زیادہ نہیں تھی۔ وہ چالیس منٹ میں رائے وینڈ پینچ گئے تھے۔ ٹیپو نے اپنے گھر کے باہر ہی گاڑی روک لی تھی۔ وہ بڑے سے گیٹ والا عام طرز کا گھر تھا جس کے باہر پٹیل کے گھنے درخت تھے، جبکہ بیرونی دیواروں کے ساتھ ساتھ اونچی اونچی بوگن ویلیا تھی۔ سخت گرمیوں کے دن تھے، لیکن وہاں اتنا سبزہ تھا کہ جلدیست تر و تازہ ہو گئی تھی۔

”تم اندر چلی جاؤ۔ میں ایک ضروری کام پٹا کر آتا ہوں۔“ اس نے زارا کے اترتے ہی کہا تھا اور خود آگے بڑھ گیا تھا۔ زارا پکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔ وہ بیٹا تعارف اندر کیسے جاسکتی تھی، پھر اس کا خیال تھا کہ اس کی امی گاؤں کی سادہ آن بڑھ عورت ہوں گی۔ وہ ان کو کیا بتانی کہ وہ کون ہے۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھی کہ اندر جائے یا نہ جائے، جب گیٹ خود بخود کھل گیا تھا۔

”آؤ۔ اندر آ جاؤ۔ کب سے کھڑی ہو یہاں۔“ ایک خاتون نے ذرا سا باہر نکل کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ زارا چپ چاپ اندر داخل ہو گئی تھی۔

وہ گھریا ہر سے جتنا سبز تھا، اندر سے اس سے زیادہ ہرا ہرا تھا۔ سرخ اینٹوں کے فرش سے سجا ہوا سامن جس کے ساتھ ساتھ کیاریاں تھیں۔ مختلف پودے پھول اور پھولوں کی خوشبوؤں نے ایک ساتھ اس کا استقبال کیا تھا۔ اسے بڑی حیرانی ہوئی۔ گاؤں کے گھروں کا ایسا تصور تو کبھی نہیں کیا تھا اس نے۔ ٹیپو کی امی نے برآمدے کی جانب اس کی رہنمائی کی تھی۔ برآمدہ بھی اسے سی نہ ہونے کے باوجود ٹھنڈا تھا۔ ایک جانب دیوان پڑا تھا، جبکہ اس کے سامنے سفید آئرن راڈ کی کرسیاں تھیں جن کی دونوں طرف لپٹائیاں تھیں۔ دیواروں پر بھی ایسی آرائشی چیزیں تھیں جن کو دیکھ زارا کا وہ تصور ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جو اس نے گاؤں کے گھروں کے متعلق ذہن میں بٹھا رکھا تھا۔

”یہاں تخت پر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تھک گئی ہو گی۔“ ٹیپو کی امی نے ہلکا آن کیا تھا، پھر اسے کرسی پر بیٹھتا

دیکھ کر بولی تھیں۔  
زارا نے ان کی بات سے انکار نہیں کیا تھا، وہ گھر کا جائزہ لینے کے بعد اب ان کی جانب دیکھ رہی تھی اور ان کو دیکھ کر بھی اسے حیرانی ہی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں ٹیپو کی امی کا جو حلیہ تھا، وہ بھی غلموں کے تناظر میں سوچا تھا اس نے۔ ایک فربہ مائل عورت جو کھلے کھلے پانچھوں والی شلوار پہنے سر پر چادر کی بکل مارے بالوں میں ڈھیروں تیل ڈالے آنکھوں کو سرے کی دھار سے سجائے دودھ وی کی خوشبو سے مہلکاں جو د نظر آئے گی۔ وہ ٹیپو کی امی تھیں۔ یہ کیسے ممکن تھا، وہ زارا کو حیران نہ کرتیں۔ وہ لباس تو عام سیاہی پہنے ہوئے تھیں۔ لیکن اس پر کوئی شکن نہیں تھی۔ انہوں نے مانگ نکال کر چٹیا بنا کر رکھی تھی۔ صاف ستھرے ہاتھ پاؤں والی وہ خاتون پہلی نظر میں ہی پردہ کی لکھی لگتی تھیں۔ وہ اس کی ممی جیسی مارڈرن خاتون تو نہیں تھیں، لیکن شہوں میں رہنے والی عام خواتین جیسی خاتون تھیں۔

”تم آمنہ ہو؟“ انہوں نے سوال کیا تھا۔  
”نہیں۔ میں زارا ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اوکے۔ معاف کرنا۔ میں نہیں جانتی تھی۔ دراصل میرے بیٹے کو ایسے ادھورے کام کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اس نے آمنہ کا ذکر کیا تھا، اس لیے میں نے سوچا شاید تم آمنہ ہو۔“ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

”نہیں۔ میں زارا ہوں۔ آمنہ کون ہے؟“ اس کے منہ سے بے ساختہ پھسل گیا تھا۔ اس نے ٹیپو کے منہ سے کبھی آمنہ کا ذکر نہیں سنا تھا۔ ٹیپو کی امی نے اس کی جانب دیکھا، پھر جیسے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔

”زارا! انہوں نے دہرایا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو، یہ نام سن رکھا ہے یا نہیں۔“ زارا خاموش رہی تھی۔

”تمہاری والدہ کا انتقال ہوا ہے نا، ہاں یاد آ گیا۔ ذکر

کیا تھا ٹیپو نے۔ بس بیٹا! تمہارا نقصان تو بہت ہوا۔ سال کا چلے جانا بڑا المیہ ہے، لیکن رب کی جو مرضی، اللہ تمہیں صبر و استقامت دے، استغفرہ، آمین۔“  
وہ کہہ رہی تھیں۔ زارا ابھی بھی خاموشی سے بیٹھی رہی۔ ایسی باتوں کے جواب خاموشی ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ بھی چند لمحے کے لیے خاموش رہی تھیں۔  
”زارا! میں ابھی اسکول سے آئی ہوں۔ کھانا بھی نہیں کھایا ہوا میں نے۔ تمہیں بھی بھوک لگی ہو گی۔ ایسا کرو تم میرے ساتھ کچن میں ہی آ جاؤ۔“  
وہ بڑی پھرتیلی سی عورت لگ رہی تھیں۔ زارا کو بھی یہ ہی بہتر لگا۔ وہ ان کو الٹھا دیکھ کر ان کے ساتھ کچن میں آ گئی تھی۔ کچن بھی اچھا اور کافی وسیع تھا۔ ایک دیوار کی جانب شلٹ اور کپینڈو تھے۔ باقی سارا کچن خالی تھا۔ انہوں نے ایک کپین کھول کر اس میں سے فولڈنگ کرسی اور چھوٹی سی میز نکالی تھی، پھر کھول کر اس کے لیے رکھ دی تھی۔

”میں آٹا گوندھ چکی ہوں۔ مولیاں کرش کی ہوئی ہیں۔ تم مولی کا برٹھا کھا لو گی نا؟“ وہ پوچھ رہی تھیں۔ زارا اس ساری گفتگو میں پہلی بار مسکرائی تھی۔ ان کا انداز بہت دوستانہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ بالکل بھی ٹکلف نہیں برت رہی تھیں، جو اسے اچھا لگ رہا تھا۔  
”جی ہاں۔ کھاؤں گی۔“ اس نے بھی رسمی طور پر ”نہیں اس اوکے“ آپ رہنے دس“ کی گردان کر کے ان کے خلوص کی تائید نہ کی تھی۔ انہوں نے چولہا جلایا، پھر اس پر توار رکھ کر اس کی جانب دیکھے بنا بولیں۔

”تم ذرا فریج سے چٹنی نکالو اور وہاں پانی کی بوتل بھی ہو گی۔“ زارا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔  
”وہاں شلٹ پر اچار بھی رکھا ہے۔“ انہوں نے دوسرا حکم دیا تھا۔

ذرا اچار کا جار بھی اٹھا لائی تھی۔ انہوں نے تھب تک پراٹھا تیل لیا تھا۔ چند لمحوں بعد سنرا سنرا اگرما گرم پراٹھا اس کے سامنے موجود تھا۔ انہوں نے اپنے اور اس کے لیے پراٹھے بنائے اور موڑھا لے کر اس کے



ساتھ ہی آجیٹھیں۔ انہیں پندرہ منٹ ہی لگے تھے یہ سارا کام بنانے میں، جبکہ ذرا سی بھی بے ترتیبی نہیں پھیلی تھی۔ پر اٹھے بھی ذائقہ دار اور خستہ تھے۔

”اب بتاؤ زارا کیا کرتی ہو تم پڑھ رہی ہو؟“ انہوں نے کھانے کے دوران ہی پوچھا تھا۔

”نہیں۔ ڈاکٹر ہوں۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا سوال پوچھتیں، زارا نے پوچھا تھا۔

”آپ ٹیچر ہیں؟“

”جب ٹیچر جیسی نالائق اولاد ہو تو ماں کو ٹیچر بننا ہی پڑتا ہے۔“ وہ اچار کی سٹھیلی کو منہ میں رکھ کر چونستے ہوئے بول رہی تھیں۔

”آپ نے ذکر کیا تھا کہ آپ اسکول سے آتی ہیں تو اس لیے میں نے سمجھا کہ آپ ٹیچر ہیں۔“ زارا نے وضاحت دی تھی۔

”میں نے اپنا ایک سکول بنا رکھا ہے، سلائی اسکول، وہاں پر ہفتے میں پانچ دن غریب کام کج کرنے والے بچوں کے لیے بنیادی ابتدائی تعلیم کا اہتمام بھی کرتی ہوں۔ ٹیچر بھی سمجھ لو، پرنسپل بھی فراغت راس نہیں آتی، ہم جیسے لوگوں کو۔ اب صبح اسکول چلی جاتی ہوں۔ شام کو بچیاں گھر پر بھی ٹیوشن پڑھنے آ جاتی ہیں۔“

”اور رات کو امی خود پڑھتی ہیں۔ وہ پٹیاں، جوابی کو امی کی مسہلیاں اور ارد گرد کے لوگ میرے بارے میں آکر پڑھاتے ہیں۔ بہت پڑھنے لکھنے والی خاتون ہیں میری امی۔“ یہ ٹیپو نے کہا تھا۔ زارا نے سر کر دیا۔ وہ کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ امی کوئی جواب دیتیں، وہ اس سے پوچھنے لگا تھا۔

”امی کی باتوں کا برا نہ ماننا۔ یہ بہت بورنگ خاتون ہیں۔“ اس سے پہلے کہ انہی کوئی جواب دیتیں، وہ تھٹ سے ہار چلا گیا تھا۔ زارا ہنسنے لگی تھی، جبکہ وہ ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں ٹیپو لقمہ بتاتی رہیں۔

”ٹیوشن میں کیا مضامین پڑھاتی ہیں آپ؟“ زارا کو

ان سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

”سب کچھ۔ تمام مضامین جو ابتدائی کلاسز میں ضروری ہوتے ہیں۔ انگلش، مہنت، اردو۔ زیادہ تر لڑکیاں انگلش سے خار کھاتی ہیں اور انگلش میں مدد چاہتی ہیں۔ اسکول میں بھی اسی طرح کا حساب ہے۔ دراصل یہ عام طرز کا اسکول نہیں ہے۔ انہم کوئی ہارڈ اینڈ ٹاسٹ روٹر پر نہیں چلتے۔ ہمارے پاس بہت غریب طبقے کے بچے ہیں جو ایک لوٹ بک بھی انورڈ نہیں کر سکتے۔ یہ عام بچہ اچھے والے ہوں لوں میں کام کرنے والے اور دکانوں پر جھاڑو پونچھا کرنے والے بچے ہیں جو ہمارے پاس آتے ہیں۔ ہم انہیں اس قابل کرتے ہیں کہ یہ علم کی اہمیت کو سمجھ سکیں اور اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کر سکیں کہ انہیں اپنی عزت نفس کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی روزی روٹی کیسے کمائی ہے۔ میں تعلیم کے ساتھ ہنر سیکھنے کو برا نہیں سمجھتی۔ اسی لیے میں انہیں کام کرنے سے منع نہیں کرتی، وہ محل بھرے انداز میں سمجھا رہی تھیں۔

”امی! آپ بہت باتیں کرتی ہیں۔ اب اٹھ جائیں اور میرے لیے کڑکڑا خستہ سا پراٹھا بنا کر لائیں۔“ ٹیپو ایک بار پھر آدھا کھا تھا اور اس نے ان کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ زارا نے دیکھا، انہوں نے ابھی بھی اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں اور چولے کے پاس جا کھڑی ہوئی تھیں۔ ٹیپو ان کی جگہ پر آ بیٹھا تھا۔ زارا کا کھانا ابھی بھی ختم نہیں ہوا تھا۔

”آپ نے ڈاکٹر صاحبہ کو میٹھک میں اے سی چلا کر بٹھانا تھا۔ یہاں بٹھارایا، تاکہ اے سی نہ چلانا پڑے اور آپ کا خرچہ بچ جائے۔ بہت بری بات ہے امی! مسلمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ اتنی تجویز اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ مسلسل بول رہا تھا، جبکہ دوسری جانب بالکل خاموشی تھی۔

”اے خوب صورت خاتون! کوئی جواب نہیں دیتا، چاہتیں تو ایک محبت کی نظر ہی ڈال لیں۔ کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا۔“ وہ ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگا

تھا۔ زارا کو لگا انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی ہے۔ وہ زارا کو اشاروں میں بتا رہا تھا کہ امی ناراض ہیں۔

”حسن والوں سے اللہ بجائے۔ ماہ جمالوں سے اللہ بجائے!“ ٹیپو ان کی بے اعتنائی دیکھ کر گانا گانے لگا تھا۔ انہوں نے میز پر اس کی پلیٹ رکھی تھی اور توڑے سے پر اٹھا چنے کی مدد سے اٹھا کر ڈائریکٹ اس کی پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ پھر ٹیپو کے سر پر چٹ لگائی تھی۔

”کھانا کھاؤ۔ گانا بعد میں بھی گایا جاسکتا ہے۔“

”آپ نے کھانا کھالیا۔“ امیں میرے جیسے کے رزق کی ہر گت برہما میں۔“ اس نے ان کو دعوت دی تھی۔

زارا نے دیکھا۔ انہی چائے کا پانی چولے پر رکھ رہی تھیں۔ ٹیپو نے گرم پرائے کا ایک لقمہ بنایا تھا۔ پھر اسے چٹنی میں ڈبو کر اپنی امی کے پاس چلا گیا تھا اور وہ لقمہ ان کے منہ کی جانب بڑھایا تھا۔ زارا کو بہت اچھا لگا۔ محبت کے یہ پُر خلوص مظاہرے اس کی زندگی میں کم کم ہی آئے تھے۔

”ڈاکٹر ابے! بایاں بہت آتی ہیں میرے لعل کو۔“ انہی مسکرائی تھیں۔

”میری تعریفیں چھوڑیں اور یہ بتائیں کہ ڈاکٹر صاحبہ کی آؤ بھگت اچھے طریقے سے کی ہے نا آپ نے۔ شہر والوں کو پنا چلنا چاہیے کہ چنڈو کتنے مسمان نواز ہوتے ہیں۔“ وہ اب رغبت سے کھانا کھانے لگا تھا۔

”تمہارے کلام اتنی غلٹ والے ہوتے ہیں کہ سب بھڑ جاتا ہے۔ تم مجھے پہلے سے جانتے تو میں کچھ اچھا بناتی۔“ انہی شرمندہ ہوئی تھیں۔

”کھانا اچھا نہیں تھا کیا؟“ امی ایم سو ری ڈاکٹر امی کو اچھا کھانا نہیں بنانا آتا۔ ان کے ہاتھ میں ذائقہ ذرا کم ہے۔“ ٹیپو اپنی امی کو چڑا رہا تھا۔

”بکو مست۔“ میرے کہنے کا مطلب تھا کہ کوئی اچھی ڈش بنا لیتی۔ بتاؤ موبی کے پرائے پر ٹر خاویا لے کر چاری کو۔ اور اس سے بھی بری بات یہ ہوتی کہ میں بھی یہ آمنہ ہے۔“ وہ سانس پین میں ڈوہ ڈال رہی تھیں۔

زارا کو لگا آمنہ کے ذکر پر ٹیپو کچھ چپ رہا ہے۔

”آپ نے بتا دیا کہ آمنہ کون ہے۔“ وہ گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔ زارا کو محسوس ہوا اس کے تاثرات مصنوعی ہیں۔

”میرے مجھے بھی کہاں پتا ہے کہ آمنہ کون ہے۔ زارا! تمہیں پتا ہے کہ آمنہ کون ہے؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔ زارا نے نفی میں سر ہلایا، جبکہ ٹیپو ان کو چپ رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ زارا سولہ انداز میں آنٹی کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”امی! اب کیا ساری باتیں باہر والوں کو بتا دیں گی۔ راز کی باتیں چھپا کر رکھنے کی ہوتی ہیں۔“ وہ اس بھی رہا تھا اور انہیں روک بھی رہا تھا۔ زارا کو بہت حیرانی ہوئی۔ وہ اس شخص سے اپنی کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔

”چپ کر۔“ جو گھر کے اندر آ جاتا ہے، وہ باہر والا نہیں ہوتا۔ زارا! میں تمہیں بتاتی ہوں، سارا معاملہ کیا ہے۔ دراصل میں جب بھی اس سے شادی کا ذکر کرتی ہوں تو یہ کہتا ہے۔ آمنہ سے کروں گا۔ آمنہ سے کروں گا اور جب میں کہتی ہوں۔ مجھے آمنہ سے ملو! تو یہ بہانے بنانے لگتا ہے اور کہتا ہے آمنہ مان جائے گی تو ملو! گا۔ وہ جب کے گی تب اس کے گھر لے جاؤں گا۔ آمنہ راضی ہوتی ہے نہ یہ مجھے اس سے ملو! پتا ہے۔ اسی لیے تمہیں دیکھ کر میں سمجھی شاید تم آمنہ ہو۔ لیکن اب مجھے لگ رہا ہے یہ جھوٹ پڑتا ہے مجھ سے۔ آمنہ کوئی ہے ہی نہیں۔ مجھے ماننے کے لیے کسی فرضی لڑکی کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔“ وہ کالی چڑ کر بول رہی تھیں۔ زارا نے سوالیہ انداز میں ٹیپو کا چہرہ دیکھا۔

”آنٹی! کپوں میں چائے انڈیلنے لگی تھیں۔“

”کون ہے آمنہ؟“ زارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ ٹیپو کی زندگی کا ایک ذاتی معاملہ اسے پتا چل رہا تھا۔

”اب مگروں پے جاؤ! پیچھے پڑ جائی! ایک پراٹھا تم کھا نہیں سکتیں۔ میرا دل غور کھا جاتی ہو۔“ وہ اس کے نامکمل پرائے کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ زارا کا پیٹ بھر



چکا تھا۔ لیکن پرانٹھا ابھی بھی تھوڑا سا باقی تھا۔  
 ”بتائیں نا کون ہے آمنہ؟“ زارا نے اس کی بات کو  
 دھیان سے سنای نہیں تھا۔  
 ”امی! اس کو میرے پیچھے لگا دیا۔ اس کو نہ بتایا تو اس  
 نے روئے لگ جانا ہے۔“ وہ اٹھ کر سنگ پر ہاتھ  
 دھونے لگا تھا پھر شایف پر بڑے چائے کے کپ اٹھا کر  
 دوبارہ اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ آٹلی سنگ میں پڑے برتن  
 دھونے لگی تھیں۔  
 ”آمنہ ایک اچھی لڑکی ہے تمہاری جیسی اور کیا  
 بتاؤں؟“ اس کا چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے  
 ہوئے اس نے کہا تھا۔  
 ”کیا کرتی ہے؟“ زارا کو برا خوش گووار سا تجسس  
 ہو رہا تھا۔  
 ”کچھ نہیں کرتی میری طرح بونگیاں مارتی ہے اور  
 بیہوش بکریاں چراتی ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔  
 ”تم کس کی باتوں میں آگئی ہو زارا! یہ جھوٹ بول  
 رہا ہے۔ مجھے یقین ہے آمنہ کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ  
 سب بہانے ہیں اس کے۔“  
 آٹلی نے اپنا چائے کا کپ اٹھایا تھا اور اسے اشارہ  
 کیا تھا کہ اپنا کپ لے کر دوسرے کمرے میں  
 آجائے۔ پوپو کچھ نہیں بولا تھا۔ زارا سمجھ نہیں پائی تھی  
 کہ وہ سچ بول رہا ہے یا اس کی امی۔ آٹلی چونکہ باہر بلا  
 رہی تھیں۔ اس لیے وہ مزید کچھ کہے بنا اپنا کپ اٹھا کر  
 ان کے پیچھے چل دی تھی۔

\*\*\*

”یہ ساری زمین میری ہے۔“ آٹلی رافعہ نے اپنے  
 سامنے پھیلے تاحہ نگاہ لہلہاتے کھیتوں کی جانب اشارہ  
 کر کے اسے بتایا تھا۔  
 ”یہ ساری۔“ زارا حیران ہوئی۔ اس کے خاندان  
 میں دور دور تک کوئی گاؤں سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔  
 اس نے صرف من رکھا تھا کہ لوگوں کی ذاتی زرعی  
 زمینیں بھی ہوتی ہیں اور آج وہ اپنی آنکھوں سے بھی  
 دیکھ رہی تھی۔ پوپو کھانا کھانے کے بعد چونکہ کہیں باہر

نکل گیا تھا۔ اب زارا اس کی منتظر تھی کہ وہ واپس آئے  
 تو اسے واپس چھوڑ کر آئے۔ شام ڈھل رہی تھی۔  
 سوچ کی تنگی تھی کہ نہیں اپنا پورا بستر سمیٹ کر اگلی  
 منزل کی تیاری کر رہی تھیں اور جہاں تک نگاہ دیکھ سکتی  
 تھی وہاں تک صرف سبز ہی نظر آ رہا تھا۔  
 آٹلی اسے گھر سے باہر اپنا اسکول دکھانے لے  
 جا رہی تھیں۔ گھر کے پچھلی جانب سے گزرتے ہوئے  
 انہوں نے اسے سرسری سے انداز میں بتایا تھا کہ یہ  
 ساری زرعی زمین ان کی ہے۔ زارا نے سن رکھا تھا کہ  
 یہ بہت فخر کا حوالہ ہوتا ہے، لیکن آٹلی رافعہ نے قطعاً  
 کسی فخر کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ آٹلی رافعہ سے مل کر  
 اسے دلی خوشی ہوئی تھی۔ ان کی سوچ بہت مثبت تھی۔  
 حالانکہ انہوں نے بتایا کہ وہ صرف تیس سال کی  
 تھیں۔ جب بیوہ ہو گئیں۔ اس کے باوجود زارا نے  
 ساری دوسراں کے منہ سے مختلف باتیں سنی تھیں،  
 لیکن ایک بھی واقعہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کی  
 زندگی میں کبھی کوئی مشکل بھی آئی تھی۔ وہ اپنی ذات  
 سے متعلق بات ہی کم کرتی تھیں۔ ان کی ساری زندگی  
 اپنے اسکول، اپنے طلباء کے گرد گھومتی رہی اور زارا  
 حیران تھی کہ وہ اس کام کا کریڈٹ بھی نہیں لیتی  
 تھیں۔ ابھی بھی ان کا انداز دیکھ کر زارا بہت متاثر  
 ہوئی۔

”آپ بہت اچھی ہیں آٹلی۔ اتنی عاجزی میں نے  
 کسی اور میں نہیں دیکھی۔“ وہ یک دم چلتے چلتے ان کا  
 ہاتھ پکڑ کر بولی تھی۔ آٹلی اس فعل سے حیران ہو گئیں  
 پھر انہوں نے سر ہلایا۔

”یہ کوئی خوبی نہیں ہے۔ یہ میری خود غرضی ہے۔  
 عاجزی انسان کی شخصیت کا سنگھار ہے۔ اس کو اپنانے  
 سے انسان خوب صورت لگنے لگتا ہے اور خوب  
 صورت لگنے کا مجھے بڑا شوق ہے۔ کیا کروں عورت ہو  
 نا۔“ وہ اپنے بیٹے کی ہی ماں تھیں۔ وہ دونوں رانائی کا  
 مزاحیہ درجن تھے۔ زارا ان سے متاثر ہوئی جا رہی  
 تھی۔

”آٹلی! مجھے بھی خوب صورت ہونا ہے۔ ایسا

## زبیدہ آیا واٹنگ سوپ استعمال کرو اور چھا جاؤ



Anford's  
Values Life



سکھار کرنا مجھے بھی سکھا دیں۔" وہ ان ہی کے انداز میں بولی تھی۔ آنٹی نے اس کی جانب دیکھا۔

"تم تو پہلے ہی اتنی خوب صورت ہو اور مزید خوب صورت ہونے کے لیے اللہ نے مواقع بھی بے شمار دیے ہیں۔ تم مسیحا ہو، مسیحائی کے ساتھ عاجزی تو فکر کو مہیا ہے۔" وہ اتنی سی دیر میں زارا سے کافی بے تکلف ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں ایک گھر کے پاس رک گئی تھیں۔ آنٹی نے ہاتھ میں چوڑی چابی سے دروازے پر لگا ہلاکھول کر پورا دروازہ کھول دیا تھا۔

"آنٹی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں بھی ایسا کچھ کرنا چاہتی ہوں کہ آپ جیسی ہو جاؤں۔ اچھی ہو جاؤں۔ اپنی مٹی کے لیے صدقہ جاریہ بن سکوں۔ توہ منت بھرے انداز میں بولی تھی۔ آنٹی نے ایک جانب لگے سوچ بورد کا جنرل دیکر لائٹ آن کی تھی۔

"کیا تم اچھی نہیں ہو۔" وہ نبھانے پوچھ رہی تھیں یا بتا رہی تھیں۔

"آنٹی! اچھی ہوتی تو بے سکون کیوں ہوتی۔ میرے دل کو چین نہیں آتا۔ میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتی۔ میرے ارد گرد والوں کے لیے میں ایک بے کار چیز کے سوا کچھ نہیں ہوں۔" وہ مغموم لہجے میں بولی تھی۔ آنٹی رافعہ نے ہنسندگی سے اس کی جانب دیکھا۔

"زارا! تم بھی بہت اچھی ہو، منضول باتیں مت کرو مجھے تمہاری باتیں سن کر اندازہ ہوا ہے کہ تمہیں فراغت کی بیماری ہے۔ جس کی بنا پر تم صرف اپنے آپ کے گرد چکر لگاتی رہتی ہو۔ اپنی ذات کے جنگل سے باہر نکل کر دیکھو۔ باہر آؤ اس خود ترسی سے۔ مجھے زندگی میں صرف خود ترسی سے نفرت ہے۔ یہ انسان کی ساری طاقت، ساری توانائی کھا جاتی ہے۔ جتاؤ سکون کیسے ملے گا۔ ارے لڑکی! ذاتی سکون تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ وہ اللہ نے انسان کے اندر کہیں چھپا کر رکھا ہوتا ہے۔ تمہارا سکون تمہاری اپنی ذات میں کہیں مقید ہے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم دوسروں کا سکون تلاش کرنے میں ان کی مدد کرو۔ اپنے ارد گرد

بکھرے لوگوں کو دیکھو۔ ان کے مسائل کو سنو ان کے دکھوں کو محسوس کرو اپنے بارے میں کم دوسروں کے بارے میں زیادہ سوچو۔ اپنی توانائیوں کو مثبت انداز میں استعمال کرو۔" انہوں نے ڈیوٹ کرکھا تھا پھر ایک دم سے اس کی جانب مڑیں۔

"تم میں بہت انرجی ہے۔ تم اس کو سنبھال سنبھال کر رکھتی رہی ہو۔ اب یہ پھٹنے لگی ہے۔ یہ جو تمہارا ڈپریشن ہے۔ یہ اسی بنا پر ہے کہ ہم میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا، لیکن تم دیکھ سکتی ہو کہ یہ انرجی ضائع ہو رہی ہے۔ انسان کی انرجی ضائع ہوگی تو اس کا دل تو دکھے گا نہ۔ کب تک دکھے گا۔ جاگ جاو۔ کوئی اور تھوڑی آئے گا تمہاری مدد کرنے کو۔ تمہیں خود ہی ہمت کرنی ہوگی۔" وہ نصیحت بھی کتنے انداز میں کرتی تھیں۔

"فرض کرو زارا! اگر بلبل کو راستہ دکھانے کے لیے جگنو نہیں ملتا تو کیا وہ گم ہو جاتا۔ رستہ تلاش نہ کر پاتا؟" انہوں نے ایک عجیب سا سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ وہ کبھی گم نہ ہوتا۔ اس کو چند لمحوں بعد خود بخود تاریکی میں نظر آنے لگتا۔ اس کی حسیات تاریکی کو شکست دینے کے قابل ہو جاتیں۔ راستہ خود بخود نظر آ جاتا۔ یہ ہی قانون قدرت ہے۔ جگنو کا انتظار مت کرو بچے، جگنو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوا کرتے۔"

وہ بے حد سنجیدہ مگر محبت بھرے انداز میں سمجھا رہی تھیں۔ زارا چپ چاپ ان کے پیچھے چلتے ہوئے ان کی جانب دیکھنے لگی۔

"جگنو ہر کسی کا نصیب نہیں ہوتا۔ میں آپ سے نہ ملی ہوتی تو ایسے ہی سوچتی۔" وہ ان کے پیچھے چلتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی۔



"میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

زارا نے واپسی پر پیپوسے کہا تھا۔ رات اتری نہیں تھی مگر اترنے والی تھی۔ موسم گرم تھا مگر شام کی اپنی نرم و نازک مسحور کردینے والی آوازیں تھیں۔ او! بہت

تیز نہیں چل رہی تھی، لیکن جو بھی جھونکا آتا تھا، ہاپوس نہیں کرتا تھا۔ زارا کھڑکی کے شیشے سے بھی باہر دیکھ رہی تھی اور وہ اسکرین سے بھی سامنے نظر ڈالتی جاتی تھی۔ اس کو آج پھر ایک نئی امید کے انجکشن لگے تھے۔ وہ مطمئن تھی۔ اس نے عزم محکم کر لیا تھا اور اس پر قائم بھی تھی۔

"اللہ تبارک و تعالیٰ میں رات کو شکرانے کے نوافل ضرور ادا کروں گا۔ تم بھی کر لیتا۔" پیپو کا انداز ہمیشہ کی طرح چڑا دینے والا تھا۔

"آپ میرے لیے کوئی جگہ ڈھونڈیں گے۔ میں اپنا ایک ذاتی کلیںک بنانا چاہتی ہوں۔ اپنے علاقے میں کوئی چھوٹا اچھا گھر ڈھونڈ دیں گے نا آپ۔ لیب اور فارمیسی بھی دیں بناؤں گی۔" وہ اس سے درخواست کر رہی تھی۔

"میرا نہیں خیال کہ یہ آئیڈیا فیئر بہل ہے۔ کلیںک بنانا بے شک دنوں کا کام ہے، لیکن اسے چلانا سالوں کا کام ہوتا ہے۔ آپ تو سال چھ مہینے میں رخصت ہو جائیں گی شہر و میاں کے سنگم۔ اس کے بعد میں یا میری ای اتنی بڑی ذمہ داری نہیں سنبھال سکیں گے میڈم۔" وہ اب کی بار سنجیدہ تھا۔

"آپ ہمیشہ نصیحتوں کی دکان نہ کھول کر بیٹھے رہا کریں۔ بورت ہونے لگتی ہے۔ کوئی اچھی بات کریں۔ آپ کی گاڑی میں کوئی بل گم وغیرہ یا پیپس کا پیکٹ نہیں ہوتا۔ شہر تو ہمیشہ چاکلیٹ رکھتا ہے۔"

زارا سنجیدہ نہیں تھی۔ اس نے پیپرسٹ والا چیمبر کھولتے ہوئے غیر سنجیدہ انداز میں کہا تھا۔

"میں آئندہ وہاں رکھوں گا جی۔ کون سی چاکلیٹ پسند ہے محترمہ کو؟" وہ شاید ابھی کچھ لور بھی کہتا لیکن چیمبر کے کھلتے ہی کچھ کٹھنات اس کی گود میں آکرے تھے۔

"عہد الست۔"

زارا نے نمایاں کر کے لکھا یہ لفظ پڑھا تھا، پیپو نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اسے ہی سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے لور محمد سے ملنا ہے۔" میں نے سوالیہ انداز میں اپنی جانب دیکھتے اس شخص کو جواب دیا تھا۔ یہ لوٹن کی جامع مسجد تھی جہاں آنے سے پہلے میں نے بہت سوچا تھا اور ہر بار میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ مجھے اس شخص سے ملنا ہی تھا۔ یہ 2006ء کے ابتدائی مہینوں کی بات تھی۔

ہمارے خوش نما رنگ ہر جانب بکھرے تھے۔ لندن موسم ہمار کو بہت محبت سے منانے کا عادی رہا ہے اور لندن ہونے کی وجہ سے میں نے ہمیشہ ہمار کا استقبال خوش دل سے کیا تھا لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے میں نے ہر چیز سے کنارہ کیا ہوا تھا۔ میں گزشتہ کئی مہینوں سے بولی ایل کی بتائی ہوئی تمام تر تفصیل کی روشنی میں کام کر رہا تھا۔ میں اپنا آخری ناول لکھنا چاہتا تھا اور یہی ناول دراصل میرا پہلا ناول بھی تھا۔ میں نے لوٹن میں ایک گھر لیا تھا اور اپنی تمام ضروری اشیاء ہاں منتقل کر لی تھیں۔ جامع مسجد میں باقاعدہ داخل ہونے سے بھی پہلے میں کئی روز تک باہر جائزہ لیتا رہا تھا۔ میرے دل میں کشمکش جاری تھی لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔ مجھے اس مسجد کے اندر جانا ہی تھا۔

دوسرے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ۔" اس شخص نے مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اس سوال کی توقع تھی اور میں اس کا جواب تیار کر کے لایا تھا لیکن مجھے جواب دینے میں وقت لگ رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی گہری سانس بھری۔ یہ عام عبادت گاہوں جیسی عبادت گاہ تھی۔ میں نے زندگی میں پہلے بھی چند ایک مساجد دیکھ رکھی تھیں۔ یہاں کا انیور بھی ان ہی مساجد جیسا ساہ تھا۔ لیکن لوٹن کی مسجد میں مجھے بے سکونی کا جو احساس ہو رہا تھا وہ پہلے کہیں اور نہیں ہوا تھا، حالانکہ لیا کے ساتھ میں نے بہت سے لیپھلا دیکھے تھے۔ ہم نے اجماع اور سری لنکا میں بھی مسلمانوں کی مساجد اور بدھسٹ کی پرانی پرانی عبادت گاہیں دیکھی تھیں۔ ہمیں وہاں جا کر اچھا لگتا تھا لیکن آج جو بے چینی دل کو



لاحق تھی وہ ایک نیا تجربہ تھا۔

”کیا کام ہے آپ کو نور محمد سے؟“ اس شخص نے مجھے مسلسل خاموش پا کر دوسرا سوال کیا تھا۔ میں نے غائب دماغی سے اس کی جانب دیکھا۔

میں جو سوچ کر آیا تھا مجھے وہی کرنا تھا۔ میرے تذبذب کا میرے فیصلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اپنے فیصلے پر قائم تھا لیکن میرا دل بے چین تھا اور اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں یہاں آنے سے پہلے سارا ہوم ورک کر کے مسجد میں آیا تھا جو مسلمانوں کی عمارت تھی اور دہشت گردوں کی آماجگاہ۔ یہاں دنیا کو برباد کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ دنیا جن بھوتوں سے زیادہ ان سے خوف کھاتی تھی۔ کیا میں نے یہاں آکر کوئی غلطی تو نہیں کر لی تھی۔ میری حقیقت جان کر یہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ یہ میں نہیں جانتا تھا لیکن میں پھر بھی یہاں موجود تھا۔

”یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر۔ اللہ سبحان تعالیٰ! آپ (اللہ) سے میری کوئی پہچان نہیں ہے۔ میں آپ کو نہیں جانتا لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو آپ کو نہیں جانتے کیا آپ بھی ان کو نہیں جانتے۔“

میں نے دل میں پھر دہرایا تھا۔ یہ بات میں ایک عرصے سے خود کو یاد کر رہا تھا۔ میں اس بات کا مفکر نہیں تھا کہ دنیا کو چلانے والی ایک عظیم مقدس طاقت ہے۔ میں قدرت کا معترف تھا۔ میں اس کے کسی اصول سے انحراف نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی مذہب کے خلاف شراکیزی پھیلانے کا قائل بھی نہیں تھا لیکن کسی مذہب کے نام پر دنیا میں دہشت پھیلانے کا حق بھی کسی کو نہیں تھا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ میں اس فلاسفی کو بے نقاب کر سکوں جو دنیا کو کسی مذہب کے نام پر دہشت اور خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ میں نے ایک اور گہری سانس بھری۔

”میں نو مسلم ہوں“ میں نے کہہ دیا تھا۔ یہ ایک بہت اونچی چوٹی سے گہری کھالی میں چھلانگ لگانے کے مترادف تھا اور میں نے چھلانگ لگادی تھی۔ اس

شخص کے چہرے پر موت والی مسکراہٹ محبت والی مسکراہٹ میں بدلی۔

”بائشاء للہ۔ بہت مبارک ہو آپ کو۔“

”میرا نام احمد معروف ہے۔ میں اسلام کے بارے میں کتابوں میں پڑھ چکا ہوں لیکن میں اب باقاعدہ دین کا علم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسی سلسلے میں نور محمد صاحب سے ملاقات کا خواہش مند ہوں۔“ میں نے وہ کہہ دیا جو میں نے کہنا تھا۔ وہ شخص بے تحاشا خوش ہوا تھا۔

”میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں لیکن میں آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ آپ نور محمد کے بجائے استقلال بیگ سے میلے۔ وہ زیادہ قابل اور عالم ہیں۔ ان کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے لیکن وہ انگلش پر عبور رکھتے ہیں۔ وہ نور محمد کی نسبت آپ کی زیادہ مدد کر سکتے ہیں۔“ میرے سامنے بیٹھے شخص نے مخلصانہ انداز میں کہا تھا۔

”نہیں۔“ میں نے قطعیت سے انکار کیا پھر ان کے چہرے پر پھیلا تحیر دیکھ کر میں نے مزید کہا تھا۔ ”مجھے نور محمد سے ہی ملنا ہے۔ وہ بہت خوش الحان ہیں۔ وہ بہت اچھا قرآن پڑھتے ہیں۔ میں نے ان کی تعریف سن رکھی ہے۔“

میں نے عجلت بھرے انداز میں کہا تھا کہ کہیں وہ شخص مجھے نور محمد کے علاوہ کسی اور کے پاس نہ بھیج دے۔ اس شخص نے سر ہلایا۔

”میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن میں ایک بات کی وضاحت کروں۔ نور محمد زیادہ ملنسار انسان نہیں ہے۔ وہ ہر شخص سے ملنا پسند نہیں کرتا۔“

”آپ مجھے ایک بار ملو اور مجھے۔ میں ان سے خود بات کر لوں گا۔ میں ان کو رضامند کر لوں گا۔“ میں نے منت کی تھی۔

”میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔ ابھی وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ اگلی نماز کے لیے آئے گا تو میں بات کر کے دیکھوں گا۔“ انہوں نے۔ کہا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

\*\*\*

اور یہ 2006 کی ہی بات تھی جب مجھے نور محمد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس کو دیکھ کر میرے ارمانوں پر اوس بڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے کسی نے میرے سکتے غراجم پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے رک کر دیکھنے دو سری نظر ڈالنے یا مخاطب کرنے کی خواہش ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ انسان سینما میں بیٹھ کر پاپ کارن بیچنے والے کو اس سے زیادہ غور سے دیکھ لیتا ہے اور میرے معزز دوست اسے جلد کر کہہ رہے تھے۔

پہلی بار وہ مجھے ڈھیلی سی جینز اپنے وجود سے ذرا بڑا ہل اور پنے مسجد میں گھومتا نظر آیا۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ وہ خوش الحان تھا۔ وہ اذان کے نام پر جو کلمات ادا کرتا تھا وہ سمجھ کر کن گتے تھے۔ میں نے اسے قرآن پاک پڑھتے بھی سنا اور مجھے اس کی آواز کے علاوہ اس کی شخصیت میں کچھ بھی قابل ذکر نہیں لگا تھا۔ میں چاہ کر بھی اس میں وہ سب تلاش کرتا رہا جس کا مسٹر فیروز تذکرہ کرتے رہے تھے۔ دہشت گرد کو دہشت کی علامت ہونا چاہیے لیکن وہ شخص بہت معصوم اور بے جاہ سا لگتا تھا۔ کیا وہ بہت بڑا اور اکار تھا۔ میں اس کو دیکھ دیکھ کر یہی سوچتا رہتا کیونکہ اس نے مجھ سے ملنے سے ابتدا میں ہی انکار کر دیا تھا۔ نظیر اختر جن سے پہلے دن میری بات ہوئی انہوں نے مجھے محبت سے سمجھایا تھا کہ میں اس کے دوسرے سے دل برداشتہ نہ ہوں اور وہ نور محمد کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔

میں مسلسل مسجد جاتا رہا اور اس کی حرکات و سکنات پر غور کرتا رہا۔ میں نے مسجد کے بے حد قریب گھر لیا تھا اور اپنی بہت سی کتابیں اور اپنے پروجیکٹ سے متعلق تمام مواد وہاں منتقل کر لیا تھا۔ انہوں نے اس کو نجانے کیسے سمجھایا میں نہیں جانتا لیکن کچھ دن بعد میں اس شخص کے سامنے بیٹھا تھا۔

”آپ کیوں ملنا چاہتے تھے مجھ سے۔ میں آپ کو

نہیں جانتا۔“ اس نے نیچی نگاہوں اور ہکلاتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

یہ تھا وہ پہلا جملہ جو اس شخص نے مجھ سے کہا تھا اور میں اس کا انداز دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ وہ آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس کی آواز حلق سے رک رک کر نکلتی تھی۔ وہ اپنی انگلیوں کو سیکنڈ کی سوئی کے حساب سے چٹکاتا تھا۔ اس کی باڈی لہنگوٹن کیسی تھی کہ اس پر ترس آتا تھا۔ وہ کس چیز سے خوف زدہ تھا۔ وہ دہشت گرد تھا۔ جو دنیا کے لیے دہشت کی علامت تھا۔ وہ خود مجھ سے دہشت زدہ تھا۔ میں ایک دہشت گرد کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ کیسے کوئی عام واقعہ ہو سکتا ہے۔ میرا دل چاہنے لگا کہ میں اپنے گھٹنوں میں منہ دے کر زور زور سے چیخیں ماروں۔

”کیا دہشت گرد ایسے ہوتے ہیں۔“ میرے ذہن میں ایک ہی سوال کی گردش تھی۔ وہ مجھ سے لگ بھگ بیس سال تو چھوٹا ہو گا۔ وہ ایک ذرا ہوا چھچکا ہوا انسان تھا جو بات کرتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ انتہائی کم گو تھا۔ اپنی مرضی سے بات کرنا پسند کرتا تھا اور وقفہ دے دے کر جملہ مکمل کرتا تھا۔ وہ ایک جملہ بولتا تھا اور پھر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی بات کو سمجھنے کے لیے لگ بھگ دس منٹ درکار ہوتے تھے۔

یہ تھی۔ میری نور محمد سے پہلی ملاقات جس نے مجھے انتہائی مایوس کیا تھا۔ اس کے باوجود کوئی تحریک تھی جو مجھے کہتی تھی کہ جو کام کرنے آئے ہو اسے ناکمل مست چھوڑنا اور نہ خود ناکمل رہو جاؤ گے۔

”مجھے کسی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ اسے اس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر میں نے آخری حربہ آزما دیا تھا۔ خضر الہی کس کا نام تھا میں نہیں جانتا تھا لیکن مسٹر فیروز کے منہ سے میں نے سنا تھا کہ نور محمد کو ان لوگوں ہوتے تھے اور وہ کہا کرتا تھا کہ اس کا ایک دوست ہے جس کا نام خضر الہی ہے۔ میں نے اسی لیے خضر الہی کا ذکر کرنے کا سوچا تھا۔



”خضر الہی“ نے ”نور محمد کے چہرے پر جیسے بجلیاں چمکنے لگی تھیں۔ وہ حیران ہوا تھا۔“  
نور محمد نے یہ نام سن کر میری مدد کرنے کی ہائی بھری تھی اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ نام استعمال کر کے اسے رضامند کر لوں گا۔

\*\*\*

”کیا دین میں نماز اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں ہے؟“

یہ تھا وہ پہلا سوال جو میں نے ایک دن نور محمد سے پوچھا تھا۔ میری بات سن کر وہ میرا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ ایک دم سے اپنا موقف بیان نہیں کر پاتا تھا اور اس کی وجہ اس کی لاعلمی نہیں بلکہ اس کی شخصیت میں اعتدال کا فقدان تھا۔ نور محمد کی قربت حاصل کرنے کے لیے میں نے اس کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ ابتدا میں جتنا خشک اور تنگ مزاج لگتا تھا وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ بے تکلف ہونے لگا اس کے پاس علم تو تھا۔ وہ حافظ قرآن تھا اور اس کو فقہ ربی عبور تھا۔ وہ احادیث و سنت کے متعلق بھی مکمل آگاہی رکھتا تھا۔

ایک بات میں نے ابتدا میں ہی تسلیم کر لی تھی کہ وہ بے حد ذہین آدمی تھا۔ اس کے اندر نئی چیزوں کو سیکھنے کی صلاحیت تھی۔ لیکن نئی چیزوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ یہ میری اب تک اس کے بارے میں ایک رائے تھی جو بدلنے جا رہی تھی۔

”میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ قرآن میں تو زندگی گزارنے کے سہرے اصول ہیں رہنمائی ہے۔ اس کو بڑھاتا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن نماز کا اس قدر حکم کیوں ہے؟“ میں نے اس کے تاثرات دیکھ کر فوراً وضاحت کی تھی۔

میرے سوال پر وہ چند لمحے میرا چہرہ کھتا رہا۔ پھر اس نے جو جواب دیا اس نے میرے چہرہ طبع روشن کر دیے۔

”یقیناً اگر یہ کہوں کہ نماز ہم اللہ کی رضا حاصل

کرنے کے لیے پڑھتے ہیں تو آپ کی تفسیر نہیں ہوگی۔ آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوتے رہیں گے۔ میں بھی پہلے حیران ہوتا تھا کہ نماز کی پابندی کا اتنا حکم کیوں ہے۔ یہ کیوں چند حالتوں کو چھوڑ کر کسی حالت میں معاف نہیں ہے اور ہمارے نماز پڑھنے سے ایسا کون سا جادوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کریم نے نماز کو اس قدر ضروری کیوں قرار دیا ہے۔ جب میں نے جانچنا شروع کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نماز کی پابندی روح کو طاقت فراہم کرنے کا عمل ہے۔ ہمارے جسم کی طرح ہماری روح کا بھی ایک مد العنی نظام ہے۔

نماز اس مد العنی نظام کو فعال اور متحرک رکھتی ہے۔ میں اب آپ کو اس کا میکینزم سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دراصل انسان کا ضمیر اس روحانی مد العنی نظام کا الارم ہے۔ نماز اس الارم کو کمزور نہیں ہونے دیتی اس کو چمکنے نہیں دیتی۔ یعنی نماز ہمارے اس الارم کو مکمل چارج کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جس طرح جسمانی مد العنی نظام کی حفاظت نہ کی جائے تو جراثیم حملہ کر دیتے ہیں۔ انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روحانی مد العنی نظام سے لاپرواہی برتنے پر روح کو بھی کیرا لگ سکتا ہے۔ اس کیرے کا نام شیطان ہے۔ شیطان کی طاقت کے متعلق کبھی کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہمہ وقت ایسے جراثیم یا برائی انسان کی جانب بھیجتا رہتا ہے جو اسے روحانی طور پر بیمار اور لاچار کر سکتے ہیں۔ ہم ہمہ وقت ان جراثیموں کی زد پر ہوتے ہیں اور ہر برائی سے بچ کر اور ہر نیک عمل کر کے ہم اپنے اس نظام کو مضبوط رکھ سکتے ہیں۔ نماز کو ترک کرنے سے یا پابندی نہ کرنے سے ضمیر ان جراثیموں کا شکار سب سے پہلے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ضمیر کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی مزاحمت کی طاقت کم ہونے لگتی ہے۔ وہ آپ کو برائی کے متعلق وارن کرنے کی اپنی قدرتی صلاحیت کھونے لگتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ برائی وہ ہے جو انسان کے دل میں کھٹکا پیدا کرے اور یہ کھٹکا دراصل ضمیر پیدا کرتا ہے۔ روح مضبوط ہوگی تو

اس کا الارم ٹھیک کام کرے گا۔ ورنہ اچھائی اور برائی میں تخصیص کرنے کی قدرتی صلاحیت جو اللہ نے اسے پیدا کی طور پر عطا کی ہوتی ہے وہ دھیرے دھیرے کم اور پھر ختم ہونے لگتی ہے۔ اچھائی اور برائی کا فرق مٹنے لگتا ہے۔ انسان کفر کی جانب مائل ہو سکتا ہے۔ اس لیے روح کو ایلیسی جراثیموں یا برائی سے بچنے کے لیے انتہائی طاقت ور ملٹی وٹامن کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے مد العنی نظام کو مضبوط رکھ سکے۔

نور محمد کی یہ ایک حیرت انگیز وضاحت تھی جس نے مجھے یہ باور کروایا کہ وہ ذہانت میں بے مثال ہے۔ ”اللہ نے یہ ملٹی وٹامن ہمارے لیے پہلے سے تجویز کر کے رکھا ہے۔ پانچ گولی دن میں پانچ مرتبہ پانی کے ساتھ۔ پابندی کے ساتھ۔ تاکہ یہ سارا میکینزم متحرک رہے۔ نماز کی پابندی روح کو کمزور نہیں ہونے دیتی۔ اس کے امیون سسٹم کو طاقت فراہم کرتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ مکمل نیت اور خود سپردگی سے نماز ادا کی جائے۔ ظاہر ہے جتنا اچھا ملٹی وٹامن ہو گا اتنا اچھا امیون سسٹم ہو گا۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے اپنی انگلیاں ہی چٹا رہا تھا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا تھا۔

یہ تھا وہ نور محمد جو دہشت گرد تھا اور جس نے مجھے دہشت گردی کے اس دائرے میں داخل کر کے بالآخر اس کو مجھنے میں مدد دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہم مزید ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ نور محمد نے مجھے اپنے ہارے میں سب بتانا شروع کر دیا۔ وہ بہت تلخ ماضی کا بوجھ اٹھائے پھر رہا تھا۔ میرے روئے سے متاثر ہو کر اس نے میرے ساتھ وہ بوجھ بانٹنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بھی چند ایک باتوں کے علاوہ سب کچھ بتا دیا تھا۔

\*\*\*

2007ء کی ابتدا میں نور محمد میرے ساتھ

میرے گھر میں منتقل ہو گیا۔ میں زندگی میں اتنا سکون پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جتنا ان دنوں تھا۔ زندگی میں بالآخر سب کچھ ٹھیک ہونے والا تھا۔ میں ہر روز لکھنے کا شغل جاری رکھتا اور دل کو بہلاتا رہتا کہ میں یہ سب صرف اپنی ذات کے لیے نہیں کر رہا۔ مجھے پہلی بار انسانیت کے لیے کچھ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ان دنوں وہ عجیب باتیں ہوئیں۔

مسٹر ٹیرن نے خودکشی کر لی۔ وہ یونی ایل کے اس گروپ کے ایسی موت مرنے والے آخری ممبر تھے جو مجھ سے اس ناول پر کام کروانے کے لیے آتے رہے تھے۔ پہلے تین لوگ ایک کار ایجنسیڈنٹ میں مر گئے تھے۔

مسٹر ٹیرن نے خودکشی کر لی اور مسٹروٹسن کو کینسر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کو امید تھی کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کا کینسر ابتدائی مرحلے پر تھا لیکن نجانے کیسے وہ کیمو تھراپی کے سائیڈ ایفیکٹس برداشت نہیں کپائے تھے۔ ان سب لوگوں کی ایسی اندویش انگ اموات نے مجھے اس ناول پر مسلسل کام کرنے کے لیے مزید متحرک کیا۔ یونی ایل ان دنوں کافی غیر فعال ہو گئی تھی۔ اس کے ممبرز کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ لیکن مجھے اب کسی کی معاونت کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ میں اب کسی چیز سے خائف نہیں تھا۔ کوئی چیز مجھے میرے عزم سے یا ارادے سے متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔

دوسری عجیب بات کا نام سلمان حیدر تھا۔

\*\*\*

”میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔“ نور محمد نے کہا تھا۔ ہم چہل قدمی کی غرض سے ہر روز باہر نکلتے تھے۔ اس روز بھی ہم شی سینٹر تک کا چکر لگا کر واپس آ رہے تھے جب نور محمد نے کہا۔

”میں انہیں کچھ پوسٹ کارڈز پوسٹ کر دوں۔ انہیں اچھا لگے گا۔ اتنے سال ہو گئے میرا کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میرے پاس ایڈریس لکھا ہوا



ہوئی۔

”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ میں اس سے عمر میں دگنا تھا۔ اسے مجھ سے اس انداز میں سوال کرنے کا حق نہیں تھا۔

”میں صحافی ہوں سر۔ سوال پوچھتا ہوں تو رزق آتا ہے۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو برا لگا تو؟“ وہ دوبارہ پلیٹ کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس لمحے نجانے کیسے میرے دل نے اشارہ دیا کہ مجھے ایک رازدار کی ضرورت ہے وہ شخص بے وقوف نہیں لگتا تھا۔ وہ وقت بڑے پر میری مدد کر سکتا تھا۔ مجھے کسی کی مدد تو چاہیے تھی۔

”عہد الست میری اور نور محمد کی کہانی ہے۔“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے اس کے سوال سے بھی زیادہ بری لگی۔

”آپ یوں کہتے ہیں یہ حق اور باطل کی کہانی ہے۔“ وہ پھر مسکرایا تھا۔ میں نے کئی بھرے انداز میں اپنا فورک پلیٹ میں رکھ دیا۔

”ایسا نہیں ہے۔ میں سوالوں سے جڑ کر آپ کی بات مان نہیں سکتا۔ میں باطل نہیں ہوں۔“ میں اب کی بار بہت محل سے بولا تھا۔

”میں نے کب کہا آپ باطل ہیں۔ میں نور محمد کو باطل کہہ رہا ہوں۔“ وہ چرانے میں مابہر تھا۔

”وہ بھی باطل نہیں ہے۔“ میں حیران سا ہوا تھا۔

”سرا کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ مانتے ہیں۔ وہ ایک جمادی تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔“

”کہا جروں“ کے لیے کام کر رہا ہے۔“ وہ دھیمی سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ یہ کوئی اور ہی معنہ تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کون تھا۔ وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا۔ کیا وہ واقعی اس کا دوست ہے یا اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔

”میں نور محمد کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔“ میں نے کہا تھا۔

”کیسے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔

”میں نے اس کتاب میں۔“ وہ میرے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے الجھن جھکا تھا۔

”کیا ہے اس کتاب میں۔“ وہ میرے چہرے کی

جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے الجھن

نہیں رہی تھی۔“

سلمان نے یک دم اپنی پلیٹ سے اٹھ کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ ہم تینوں یک دم چپ ہو گئے تھے۔ سلمان حیدر کا مجھے نہیں جانا لیکن میں اس بات سے آگاہ تھا کہ نور محمد کی پٹائی کرکٹ کھیلنے پر بھی ہوا کرتی تھی۔

”میں تم سے بہت جھگڑا کیا کرتا تھا۔ میں بچپن میں زیادہ کچھ دار نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب میں دیرا نہیں رہا۔ میں اب سمجھتا ہوں کرکٹ کھیلنا سیکھا سکتا ہوں۔ شرط وہی ہے۔ بیٹ نہیں خود لانا ہو گا۔“

سلمان نے بے تکلف انداز میں کہا۔ مجھے اس کی یہ بات پسند آئی۔ وہ اچھا انسان تھا۔

”میں بھی اب دیرا نہیں رہا۔“ نور محمد نے اتنا ہی کہا تھا۔ میں نے چکن فلڈ والی ٹرے سلمان حیدر کی جانب بڑھائی۔ اس نے ایک قلم اٹھایا تھا۔ نور محمد خاموشی سے کالی بنانے کے لیے اٹھ گیا تھا۔

”آپ کا نیا ناول کب آ رہا ہے مارکیٹ میں؟“ اس کے جانے کے بعد سلمان حیدر نے یک دم پوچھا تھا۔ میں چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے ادھی عمر کا تھا لیکن اس لمحہ وہ مجھے اپنے آپ سے زیادہ چالاک محسوس ہوا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا تو اس نے ظاہر کیوں نہیں کیا تھا اور اگر نہیں پہچانتا تھا تو اسے میرے نئے ناول کی سن گن کس سے ملی تھی۔ میں تو عوامی طور پر اعلان کر چکا تھا کہ میں لکھنا چھوڑ چکا ہوں اور میرے حالیہ پروجیکٹ کا میرے چند قریبی لوگوں کے علاوہ صرف یوٹیوٹیل کے منتظمین کو پتا تھا۔

”کیا نام ہے اس ناول کا؟“ وہ ابھی بھی فورک اور پاستا میں گن لگا تھا۔ لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ وہ بیٹ میں دائرہ می لے کر پھرنے والا انسان ہے۔

”عہد الست۔“ میری زبان سے پھسلا تھا۔

”عہد الست۔“ اس نے دہرایا۔ پھر میری جانب جھکا تھا۔

”کیا ہے اس کتاب میں۔“ وہ میرے چہرے کی

جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے الجھن

جھکا تھا۔

”سبک تو مل گیا تھا۔ اچھا۔ مزید کی حاجت نہی

کشت نہیں تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے ذہانت

جھلکتی تھی۔ وہ عام لوجو والوں جیسا ایک جوان آدمی تھا۔

یہ میری اس کے بارے میں پہلی رائے تھی۔ نور محمد کی دعوت پر ہمارے گھر آ گیا تھا۔

مجھے نور محمد کے دوستوں نے خوش گوار حیرت میں

جتا کیا۔ وہ اس شخص سے مل کر بے پناہ خوش تھا۔ یہ

بات میری میری سمجھ میں آئی تھی کہ وہ دونوں بچپن

کے دوست تھے اور ایک اسکول میں پڑھتے رہے تھے۔

نور محمد نے اس کے لیے بہت شوق سے ایک پراہتمام

کھانا تیار کیا تھا جسے کھانے کے لیے ہم اب میز پر

موجود تھے۔

”تمہارے بارے میں ہمیشہ میں یہ ہی سوچتا تھا کہ

تم بہت کامیاب انسان بنو گے۔“ نور محمد نے اس کو

دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ارے اتنا سوچتے تھے تم میرے بارے میں۔ اتنا

تو میری امی بھی نہیں سوچتی تھیں میرے بارے

میں۔“ وہ کانٹے سے آنکس برگ کے سبز پتے ٹوٹتے

ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں تمہارے جانے کے بعد بھی تمہیں یاد کیا کرتا

تھا۔“ نور محمد بولا۔

”آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ میں نے سنجیدگی سے سپاٹ انداز میں پوچھا۔ میں اس سے عمر میں دگنا تھا۔ اسے مجھ سے اس انداز میں سوال کرنے کا حق نہیں تھا۔

”میں صحافی ہوں سر۔ سوال پوچھتا ہوں تو رزق آتا ہے۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ معذرت خواہ ہوں اگر آپ کو برا لگا تو؟“ وہ دوبارہ پلیٹ کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس لمحے نجانے کیسے میرے دل نے اشارہ دیا کہ مجھے ایک رازدار کی ضرورت ہے وہ شخص بے وقوف نہیں لگتا تھا۔ وہ وقت بڑے پر میری مدد کر سکتا تھا۔ مجھے کسی کی مدد تو چاہیے تھی۔

”عہد الست میری اور نور محمد کی کہانی ہے۔“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے اس کے سوال سے بھی زیادہ بری لگی۔

”آپ یوں کہتے ہیں یہ حق اور باطل کی کہانی ہے۔“ وہ پھر مسکرایا تھا۔ میں نے کئی بھرے انداز میں اپنا فورک پلیٹ میں رکھ دیا۔

”ایسا نہیں ہے۔ میں سوالوں سے جڑ کر آپ کی بات مان نہیں سکتا۔ میں باطل نہیں ہوں۔“ میں اب کی بار بہت محل سے بولا تھا۔

”میں نے کب کہا آپ باطل ہیں۔ میں نور محمد کو باطل کہہ رہا ہوں۔“ وہ چرانے میں مابہر تھا۔

”وہ بھی باطل نہیں ہے۔“ میں حیران سا ہوا تھا۔

”سرا کیا یہ حقیقت نہیں کہ آپ مانتے ہیں۔ وہ ایک جمادی تنظیم کے ساتھ وابستہ ہے۔“

”کہا جروں“ کے لیے کام کر رہا ہے۔“ وہ دھیمی سی آواز میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا۔ یہ کوئی اور ہی معنہ تھا جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کون تھا۔ وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا۔ کیا وہ واقعی اس کا دوست ہے یا اس کے پیچھے کچھ اور ہے۔

”میں نور محمد کو آپ سے بہتر جانتا ہوں۔“ میں نے کہا تھا۔

”کیسے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔

”میں نے اس کتاب میں۔“ وہ میرے چہرے کی

جانب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز سے الجھن

جھکا تھا۔

”سبک تو مل گیا تھا۔ اچھا۔ مزید کی حاجت نہی

کشت نہیں تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے ذہانت

جھلکتی تھی۔ وہ عام لوجو والوں جیسا ایک جوان آدمی تھا۔

یہ میری اس کے بارے میں پہلی رائے تھی۔ نور محمد کی دعوت پر ہمارے گھر آ گیا تھا۔

مجھے نور محمد کے دوستوں نے خوش گوار حیرت میں

جتا کیا۔ وہ اس شخص سے مل کر بے پناہ خوش تھا۔ یہ

بات میری میری سمجھ میں آئی تھی کہ وہ دونوں بچپن

کے دوست تھے اور ایک اسکول میں پڑھتے رہے تھے۔

نور محمد نے اس کے لیے بہت شوق سے ایک پراہتمام

کھانا تیار کیا تھا جسے کھانے کے لیے ہم اب میز پر





بھری۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

\*\*\*

یہ اس روز کی بات تھی جب میں بلیک برن گیا تھا۔  
ٹیا کی خود کشی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ بلیک برن  
کے یوگا سنٹر میں ایک لیکچر ہو رہا تھا۔ جو سکون کی تلاش  
کے موضوع پر تھا۔ لیکن جس نے مجھے آکٹاٹ میں  
جتلا کر دیا تھا۔ میں ہال سے اٹھ کر باہر آیا تھا۔ پھر میں  
وہیں باہر بیٹھ گیا تھا۔ میں لیکچر ختم ہونے کا انتظار کرنے  
لگا۔ مجھے ان اسکا رسے دوبارہ ملنا تھا۔ مجھے ان سے کچھ  
سوالوں کے جوابات پوچھنے تھے۔

”کیا مذہب ہر مسئلہ حل کر رہا ہے؟ میں اگر یہ مان  
لوں کہ ہر پچہ دنیا میں آنے سے قبل خدا سے ایک عہد  
کر کے آتا ہے تو کیا میں سکون ہو جاؤں گا؟ کیا رب کو  
رب مان لینے سے انسان کو سکون مل جاتا ہے؟“

جب ہال میں سے سب اٹھ کر چل دیے تو میں نے  
سوال کیا تھا۔ ہال میں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں  
تھا۔ میرا اشارہ قرآن کی اس آیت کی طرف تھا جو اس  
لیکچر کی ابتدا میں تلاوت کی گئی تھی۔

”ہاں۔ ہم مسلمانوں کا تو یہی عقیدہ ہے۔“  
انہوں نے سر ہلایا تھا۔ ان کے جواب نے مجھے مایوس  
کیا تھا۔

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عہد الست کا مطلب  
یہ ہے کہ ہم سب پیدا ہونے والے مسلمان ہیں؟“ میں اپنی  
ناگوار پچھچھائی پٹا تھا۔

”میں نے یہ نہیں کہا۔ آپ اپنا لہجہ درست  
کر لیجئے، مسلمان ہونا کوئی گالی نہیں ہے۔“ انہوں نے  
درشت لہجے میں کہا۔ میں شرمندہ ہوا۔ میرا لہجہ واقعی  
کچھ غیر مناسب ہو گیا تھا۔ میں حاجت مند تھا اور  
حاجت مند کو سر جھکا کر بات کرنی چاہیے۔

”میں گالی نہیں دے رہا، لیکن میں مذہب کے  
بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ آپ برا مت مانجیے  
گا۔ لیکن میں کسی مذہب کو نہیں مانا۔ میں سکون کی  
تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے صدیوں پرانی باتیں نہیں

سننی۔ یہ میرے لیے انہی باتوں کی طرح ہیں جو  
ایک مدت کے استعمال کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ یہ  
سیٹھ سکون کے موضوع پر تھا جو مجھے نہیں ملا۔ آپ  
لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ انسان کو سکون کے لیے ایک  
کندھا چاہیے ہوتا ہے، ایک آغوش جس میں منہ  
چھپا کر وہ اپنا سارا غم بھول سکے اور جسے وہ محسوس  
کر سکے۔“ میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ انہوں  
نے سر ہلایا۔

”اچھا۔ میں مذہب کی بات نہیں کروں گا۔ میں  
سائنس کی بات کرتا ہوں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ  
انسان کے خلیوں میں کلیے چھپے ہوتے ہیں۔ ایک  
خلیہ ہے اس کی ایک حفاظتی پرست ہوتی ہے اس کا  
ایک مرکز ہوتا ہے۔ مرکز میں جینز ہوتی ہیں۔ سائنس  
بتاتی ہے کہ جینز میں بہت ہی باریک چھوٹے حجم کے  
کروموسومز ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد چھیالیس ہوتی

ہے اور یہ تینس جوڑوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ یہ  
اس قدر مختصر حجم کے ہوتے ہیں کہ خروبین سے بھی  
صرف اس وقت دیکھے جاسکتے ہیں جب خلیہ تقسیم  
کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ان کی تعداد بہت اہمیت  
رکھتی ہے۔ سائنس مانتی ہے کہ ایک زیادہ ہو گیا یا  
ایک کم ہو گیا۔ سمجھیں سارا تناسب بگڑ گیا۔ ایک  
ہندسہ اور نیچے ہوا نہیں اور انسان نارمل نہیں رہتا۔

ایک نارمل ہو جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ  
سائنس مانتی ہے کہ جینز میں پلے جلتے والے کروموسوم  
ناہی ان اسٹرکچر کی تعداد انسان کو نارمل رکھنے میں اہم  
کردار ادا کرتی ہے۔ اب میں آپ کو اپنی ایک تحقیق  
کے متعلق بتاتا ہوں۔ آپ بے شک اسے مفروضہ  
سمجھ لیجئے۔ عہد الست کا ذکر قرآن کریم کے پارہ نمبر  
9 سورہ نمبر 8 اور آیت نمبر 172 میں  
ہے۔ اس آیت کے تمام حرفوں کا حرف چھٹی میں جو

مقام ہے آئیں اسے شمار کرتے ہیں۔ یہ حرف ”ع“  
پھر ”ا“ ”ل“ ”س“ ”ت“ پر مشتمل ہیں۔ ”ع“ کا مقام  
18 ہے۔ پھر ”ا“ کا نمبر 27 بنتا ہے اسی طرح  
”س“ 1 ”ل“ 23 ”ت“ 12 اور

آخری حرف ”ت“ کا نمبر 3 بنتا ہے۔ آپ ان تمام  
18، 27، 12، 23، 3 کو جمع کر لیجئے۔ یہ  
بانوے بنتے ہیں۔ ”وہ بہت اطمینان سے اپنی بات کی  
وضاحت کر رہے تھے جبکہ میں ہونٹوں کی طرح ان کا  
چہرہ کچھ رہا تھا۔“

”انسان کے چھیالیس کروموسومز ایک صورت میں  
بانوے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ صورت تب ہوتی ہے۔  
جب انسان اس دنیا میں آنے کے لیے اپنی ماں کے  
وجود میں مقید ہوتا ہے۔ حاملہ ماں کے کروموسومز  
چھیالیس اور اس کے وجود میں پلے والے سنجے کے  
کروموسومز بھی چھیالیس۔ یہ مل کر بانوے بن گئے۔  
یعنی عہد الست کے کل حروف۔ ماں پچہ پیدا کر کے پھر  
واپس چھیالیس ہو جاتی ہے۔ پچہ اپنے چھیالیس  
کروموسومز لے کر اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس طرح  
عہد الست میں بندھا ایک اور وجود دنیا میں آ جاتا ہے،  
اور عہد الست کیا ہے یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔“  
ان کی مسکراہٹ پر اسرار ہو گئی تھی۔

”کروموسومز بھی محسوس تو نہیں ہوتے“ حتیٰ کہ  
خوردین سے بھی چند حالتوں کے سوا نظر نہیں آتے  
لیکن یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسانی ذہن کی حالت ان کی  
تعداد پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ کم یا زیادہ ہو جائیں تو انسان  
کی دماغی حالت ایب نارمل ہو سکتی ہے جو بے سکونی  
پیدا کرتی ہے۔ سکون دراصل دماغ ہی کا معاملہ ہے۔  
کیا یہ بات مانتے ہیں آپ۔ اب تو میں نے سائنس  
کی رو سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مان لیجئے  
کہ اگر چھیالیس نمبر انسان کو نارمل رکھنے کے لیے  
ضروری ہیں تو بانوے نمبر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔  
آپ حقیقت کو ساری زندگی نہ مانیں، مگر آپ کے  
خلیے مانتے ہیں اور مانتے رہیں گے۔ ان کے چہرے  
پر پھر اسرار مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

”یہ ساری باتیں جو میں نے آپ سے کہی ہیں نا۔  
میری نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کیا  
سمجھتے ہیں خدا کو اپنا وجود منوانے کے لیے ہندسوں کی  
ضرورت ہے۔ وہ سائنس کا ممکن ہے۔ نہیں۔ ایسا

نہیں ہو تاکہ اللہ جس دل میں بسنا چاہتا ہے وہ خود وہاں  
بس جاتا ہے۔ آپ اس حقیقت کو مان لیجئے اور یہ  
مان گئے ہیں تو یہ بھی مان لیجئے کہ ربوبیت کا اقرار  
انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا کیونکہ انسان کی فطرت  
میں سرسبب وجود کی ہے۔ سجدہ صرف ربوبیت کو چھتا ہے۔  
اور ربوبیت کا اقرار انسان کی فطرت ہے۔ انسان دین  
حق پر پیدا کیا گیا ہے، یہی عہد الست ہے۔ یہ ہی سکون  
ہے۔ اس سے منکر ہو جانا ہی دراصل دنیا کی بے سکونی  
کی بنیادی وجہ ہے۔ آپ چھیالیس کی اہمیت کو مانیں  
اور بانوے کی اہمیت کو نظر انداز کریں تو آپ ایب  
نارمل ہونے لگتے ہیں۔ یعنی بے سکون ہونے لگتے  
ہیں۔ دنیا اسے ڈپریشن بھی کہتی ہے۔ یہ بھی مانتی ہے  
کہ ڈپریشن بہت بڑھ گیا ہے اور رب کو رب بھی نہیں  
ماننا چاہتے۔“ وہ پھر رکے تھے اور گہری سانس بھر کر اپنی  
ٹانگوں کا زاویہ درست کیا تھا۔ وہ اپنے گھٹنوں کو سہلا  
رہے تھے۔

”یہ ہی وجہ ہے کہ میں عہد الست کو یعنی ربوبیت  
کے اقرار کو انسان کے سکون کی بڑی وجہ قرار دیتا ہوں۔  
اللہ اس دنیا میں سونے جیسے لوگ بھیجتا ہے اور وہ توقع  
کر رہا ہے کہ ہم سونے جیسے ہو کر ہی اس تک، واپس  
پہنچیں۔ آئیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیسے ہوتا  
ہے۔ اللہ نے انسان کو مٹی اور پانی سے بنایا اور پھر اس  
میں ہوا، یعنی روح داخل کر دی۔ یہ تین عناصر ہیں۔  
آگ یعنی چوتھا عنصر اللہ نے اسے نہیں دیا یا شاید ہر  
ایک کو نہیں دیا۔ یہ عنصر ہمیں اپنے اندر خود پیدا کرنا  
پڑتا ہے۔ لوہا اگر واقعی لوہے کو کاٹتا ہے تو شیطان کی  
آگ کو کلٹنے کے لیے انسان کو آگ چاہیے جو اسے  
خود پیدا کرنی پڑتی ہے۔ آپ کو نیک عمل کرنا پڑتا ہے۔  
اور ہر نیک عمل چاہے وہ کچھ بھی ہو اگر وہ کل انسانیت  
کے لیے عمل خیر ہے تو وہ سنہری روشنی جیسی آگ پیدا  
کرتا ہے جسے نور کہتے ہیں۔ جس کی سنہری روشنی  
آگ کی روشنی سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے یہ  
ہی سنہری روشنی دھیرے دھیرے سر مٹی سرد مٹی کی  
برف کو جلا سکتی ہے۔ یہ نسخہ آزما کر دیکھیے، میری



تخصیص ہے کہ آپ کے اندر آگ کم ہو چکی ہے جو آپ کے وجود کو دھیرے دھیرے سرد پاوی کے حوالے کرتی جا رہی ہے۔ اپنے اندر آگ پیدا کیجیے۔ ہر وہ عمل جو انسانیت کو بگاڑنے کے لیے کر جیتے ہیں تو اس سے منکر ہو کر توبہ کیجیے اور عمل خیر کا آغاز کریں۔

انہوں نے گفتگو ختم کر دی تھی۔ میرا پورا وجود پسینے میں نہا چکا تھا۔

”عمل خیر کیا ہے۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ جو عمل میں کر رہا ہوں وہ انسانیت کو سنوار رہا ہے؟“

میری آواز میں سرسراہٹ تھی۔ میرے وجود پر کبھی طاری ہو رہی تھی۔ انہوں نے اب کی بار میری آنکھوں میں دیکھا۔

”ہر وہ عمل جو آپ اپنی ذات سے ہٹ کر کسی دوسرے انسان کی بھلائی کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں وہی عمل خیر ہے۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلا دینے سے لے کر کسی سے بیٹھنی سچی بات کر لینے تک ہر عمل، عمل خیر ہے اور اس میں خیر ہی خیر ہے۔ اسی لیے اخلاق اور اخلاص کی بے حد اہمیت ہے۔ ان سے پوری انسانیت فیض یاب ہو سکتی ہے۔ یاد رکھیں عمل خیر جو نیک ختم نہیں ہوتا۔ زندہ رہتا ہے۔ اس لیے اس سے حاصل ہونے والی انرجی مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ یہ بعد از مرگ بھی انسان کے لیے کہیں تارکی میں راہ دکھانے والا جگنو بن کر ساتھ رہتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کا اجر ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اللہ آپ کے اس لقمے کا اجر بھی ضائع نہیں ہونے دے گا جو آپ نے مخلص ہو کر کسی بھوکے کو کھلادیا ہو گا۔ ہر وہ لفظ جو کسی کھوٹ کے بغیر کسی سے محبت بھرے انداز میں کہا گیا یا ہر وہ دعا جو کسی کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کی گئی۔ عمل خیر ہے۔“

وہ ابھی بھی مسکرا رہے تھے۔ میں پہلے بھی زمین پر ہی بیٹھا تھا۔ تب تو مجھے لگا جیسے میں زمین پر جھٹکا چلا جا رہا ہوں۔

وہ میرے قریب آگئے تھے پھر میرے سر پر ہاتھ رکھ

کر بولے۔

”میں یہ نہیں کہہ رہا آپ اسلام قبول کر لیں۔ مسلمان ہو جائیں۔ تب صرف حق کو کھوجیں۔ سچ کو تسلیم کر لیں۔ اللہ خود آپ کو ہمت عطا کرے گا۔ وہ جس کو سنہرا کرنا چاہتا ہے خود کر دیتا ہے۔ یہ جو بچہ ابھی میرے ساتھ تھا۔ اسے دیکھا آپ نے۔ اس کا نام نور محمد ہے۔ ایسا انمول انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ جب میرے پاس آیا تو تقریباً ”مکمل پاکل ہو چکا تھا۔ اس کا دوبا ماٹن لیول پر بڑھا ہوا تھا۔ یہ سیزو فرینیا کی اسٹیج اے پر تھا۔ آج ماشاء اللہ تمام نمازیوں کی پابج وقت امامت بھی کر دیتا ہے اور اذان بھی دیتا ہے۔ دنیا اسے بے شک بد بخت کے، لیکن میں جانتا ہوں وہ اللہ کا بہت پیارا بندہ ہے۔ اللہ اسے عزیز رکھتا ہے تو اسے اتنی بڑی ذمہ داری عطا کی ہے۔ میں نے کہا نا وہ جسے سنہرا کرنا چاہتا ہے خود کر دیتا ہے۔“ وہ کہہ رہے تھے۔

میں اس روز گھر واپس آیا تو میں وہ نہیں تھا جو وہاں گیا تھا۔ اس رات میں نے چند خوف ناک حقیقتوں کو تسلیم کر لیا۔ میں نے جائزہ لیتا شروع کیا کہ میں نے جب سے یہ ناول لکھنا شروع کیا تھا، میری زندگی میں ہر چیز بے ترتیب ہو گئی تھی۔ میں ایک کے بعد ایک حادثے کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا بچہ اپنی بیوی اور اپنا ہنر سب کھو دیا تھا اور تب بھی میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ میں جو لکھ رہا تھا۔ میں اتنا ڈپرہسٹ رہا تھا کہ خود کسی کرنے کی نوبت آگئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے ناول میں اسلام اور اس کے ماننے والوں کے خلاف شرانگیز مواد جمع کر رہا تھا۔ میں نے جب جب بھی اس ناول کا کوئی نیا باب لکھا تھا، مجھے کوئی نیا غم ملا تھا اور تب بھی میں لاعلم کیوں رہا تھا کہ میں شریع کر کے اس میں سے خیر کیسے پاسکتا تھا۔ اس رات میں نے وہ سب جواب تک لکھ رکھا تھا، سب کا سب نذر آتش کر دیا تھا اور تہیہ کیا تھا کہ اب جو ٹکھوں کا سچ لکھوں گا۔ تب میں نے ایک نیا ناول شروع کیا تھا۔ میں نے عہد اُست لکھنا شروع کر دیا تھا۔

”یہ نہیں بک بیٹا ہے میں نے۔“

عمر نے اپنا لپ ٹاپ امامت کے سامنے کیا تھا۔ وہ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جبکہ امامت جیت لیتی تھی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ پریگنٹ تھی اور اس حالت کے سائیڈ ایفیکٹس نے اس کا برا حال کیا ہوا تھا۔ وہ سارا دن ٹھکی رہتی تھی یا ابکائیاں کرتی رہتی تھی۔ اس کی توجہ نہ چاہتے ہوئے بھی آج کل کسی چیز پر نہیں رہی تھی۔ وہ نقاہت بھی محسوس کر رہی تھی، سو اس کے بھائی کی تلاش کرنے کا کام اب عمر کے سر اُٹھایا تھا۔

عمر کی یہ بات اسے پسند بھی بہت تھی۔ وہ جب کسی کام کو کرنے کی ٹھان لیتا تھا تو پھر پوری توانائی سے اس کام کو سر انجام دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے اتنے دلوں میں اب تک لوٹن کا چکر تو لگایا ہی تھا، لیکن انٹر نیٹ سے بھی اس نے نہ صرف لوٹن بلکہ بلیک برن کی بھی تمام مساجد کی معلومات اکٹھی کی تھیں۔ اس نے وہاں کے کانٹیکٹ نمبرز بھی تلاش کیے تھے۔ بلیک برن وہ جگہ تھی جہاں نور محمد رو چلے سے آیا تھا۔ جب اس کی ذہنی حالت بے حد مخدوش تھی۔ اس نے کچھ لوگوں کو فون بھی کیے تھے۔ تاحال کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے نیٹ پر زیادہ منظم معلومات نہیں دی گئی تھیں۔

لوٹن کی جامعہ مسجد کا نمبر اسے وہاں مل نہیں سکا تھا۔ اس لیے وہ ایک بار وہاں گیا بھی تھا، لیکن تب نماز کے اوقات نہیں تھے، سو اسے کوئی مل نہیں سکا تھا۔ مسجد کے باہر تالا لگا ہوا تھا۔ وہ ہر روز وہاں نہیں جاسکتا تھا۔ جانب کی ذمہ داریاں بھی تھیں اور وہ علاقہ بھی ان کی گتھ بک میں نہیں تھا۔ اس لیے وہ انٹر نیٹ پر جو ہو سکتا تھا وہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے نور محمد اور نور آفاق اور نور بن آفاق کے نام سے فیس بک پر سرچ کرنا شروع کیا تھا۔ اس نام کی لاتعداد آنی ڈیز فیس بک پر موجود تھیں۔ سو اسے تلاش کرنا ممکن تھا۔ اس لیے اس نے ایک فیس بک پیج بنایا تھا جس میں نور محمد کے متعلق تمام تر معلومات جو اب تک اسے

دستیاب تھیں اس نے لکھ ڈالی تھیں۔ اس نے لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اگر کوئی اس کے متعلق جانتا ہے تو آگے آکر معاونت کرے۔ کل ویک اینڈ تھا۔ سو اسے فراغت تھی۔ وہ لپ ٹاپ لے کر بیٹھا ہوا تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں اس میں آئی اور انٹل کی تصاویر بھی اب لوڈ کروں۔ کیا پتا نور محمد نے کسی اور نام سے آئی ڈی بنائی رکھی ہو۔ اس کی نظر سے گزرے تو اسے اچھا لگے۔ آئی، انٹل کی تصاویر سے جذباتی طور پر بھی ہٹ کیا جاسکے گا۔“ وہ امامت کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں لپ ٹاپ کی اسکرین پر تو تھیں، لیکن توجہ ابھی بھی وہاں نہیں تھی۔

”تم آئی کو کہو کہ وہ ہمیں کچھ پرانی تصویریں بھجوا دیں۔ نور محمد کے بچپن کی مل جائیں تو کیا کہنے۔“ امامت اس کی بہت سن ہی نہیں رہی تھی۔ عمر نے بغور اسے دیکھا۔

”کیسا محسوس کر رہی ہو، طبیعت ٹھیک ہے؟ تمہارے لیے جوس لائوس؟“ وہ یک دم اس کی جانب جھکا تھا۔ امامت کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

”نہیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ اسی انداز میں بولی تھی۔

”اپنا خیال رکھا کرو نا پار۔ یاد نہیں می کیا کہہ رہی تھیں کہ بھوک نہ بھی لگے یا دل نہ بھی چاہے تو کچھ نہ کچھ کھاتے رہتا چاہیے۔ پہلے ہی اتنی کمزور ہو گئی ہو۔“ وہ اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔

”دل تو چاہتا ہے بھوک بھی لگ رہی ہے، مگر پھر ڈر لگتا ہے، کچھ بھی کھا لوں ہضم نہیں ہوتا، الٹی آجاتی ہے۔“ وہ لاچار رہی بھرے لہجے میں بولی تھی۔ اس نے لپ ٹاپ بھی سائیڈ پر رکھ دیا تھا۔

”میں اسٹراپرز لایا تھا۔ بہت فریش۔“ لھندی ہونے کے لیے رکھی تھیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔ تم نمک ڈال کر کھاؤ۔ اس سے الٹی نہیں آئے گی۔“ وہ محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امامت مسکرائی۔

”ایسی باتیں کون سکھاتا ہے تمہیں عمر۔ ایسی







### مہر خاموشی

ہمیں چپ رہنے کا سبق آگیا ہے اب  
کوئی لمحہ خوشی کا ہو کہ دکھ اترے رگ جاں میں  
کوئی تنہا ہمیں کر دے کہ باندھے عہد و پیمان میں  
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا  
یہ سب ماضی کے قسطے ہیں  
کہ ہم جڑیا کے مرجانے پر پہروں جی جلاتے تھے  
کبھی جذلوں کے آنگن میں شے سینے سجاتے تھے  
ملن کی تسلیاں بھی اپنے پر بھینچا یا کرتی تھیں  
ہمیں کد ان کہی باتیں سمجھ میں آیا کرتی تھیں  
کبھی آگ نرم سرگوشی ہمیں خواب دہکتی تھی  
کبھی چھوٹی سی کوئی بات بھی دہکتی تھی  
یہ سب باتیں پرانی ہیں  
اب ایسا کچھ نہیں ہوتا  
وادت نے ہوں پر مہر خاموشی لگا دی ہے  
خوشی کی بات کا غم بھرا اتر ہم پر نہیں ہوتا  
نظر سے گل کھلا نا کا اگر ہم پر نہیں ہوتا  
شائے کھل آئیں یا پھر خزاں میں ہم اکیلے ہوں  
شفق آنگن میں اترے یا بدن خواہش کے میلے ہوں  
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا  
ہمیں اب کچھ نہیں ہوتا

تسلیم کوثر

سندھ زخم شاخوں کے سیلے ہیں  
بہار آئی ہے خفتے کیل گئے ہیں

مگر میرے دیار رنگ و بو میں  
وہی پت جھڑکے ڈیرے کیوں لگے ہیں

برہنہ سرکھڑی ہیں ناخستائیں  
نیشن رات ان کے جل گئے ہیں

یہاں انسانیت مرد پڑی ہے  
یہ گدھ اس کے بدن کو لوپتے ہیں

اجازت کس نے دی پھر قتل و خون کی  
یہ قاتل کیوں یہاں داخل ہوئے ہیں

نظر حیران ہے ان سانحوں پر  
دلِ ناستاد کو جھٹکے لگے ہیں

مٹے ان کو بھی مولا بار یابی  
دعا کو ہاتھ تو آٹھے ہوئے ہیں  
شمیم طاہرہ

اپنا سارا حوصلہ ساری ہمت کھودیتے ہیں۔ کھو جانے  
والے کا دکھ مرنے والے کے دکھ سے بہت زیادہ منگ  
ہوتا ہے۔ آئی بہت مشکل میں ہیں۔ آئی دوش میں ان  
کے لیے کچھ کر سکوں۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ جلد از  
جلد اللہ کریم آئی سے ان کے بیٹے کو ملوادے۔“

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ امائمہ کو بے حد حوصلہ ہونسیہ  
عورت کے لیے بہت طاقت ور احساس ہوتا ہے کہ  
آپ کا شریک حیات آپ کے ماں باپ یا بہن بھائی کو  
اتنی ہی اہمیت دے جتنا کہ وہ اپنے ماں باپ یا بہن  
بھائی کو دیتا ہے۔

”تم کافی کچھ تو کر رہے ہو۔ میں تو اس بات کے لیے  
بھی بہت شکر گزار ہوں عمر!“ اس نے تشکر آمیز انداز  
میں کہا تھا۔

”چھالو۔ اب باتیں بند کرو اور اس اسٹریپری کو ختم  
کرو۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ میں نے یہ بیچ تو بنالیا  
لیکن میں سوچ رہا تھا کہ شہروز آجائے تو اس سے بات  
کروں گا پچھلے۔ اس کے بعد آگے کالا کد عمل طے  
کریں گے۔ جو جراثیم ہے اس کی اپروچ ہم دونوں  
سے زیادہ ہے۔ وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکے گا۔ آٹھے  
ساتنے بیٹھ کر بات کرنا زیادہ اچھا رہے گا کیا خیال  
ہے۔“

”کب آ رہا ہے شہروز۔ انگل (عمر کے والد) کی تو  
دس تاریخ کی فلاٹ ہے۔ ان کے ساتھ ہی آ رہا ہے یا  
بعد میں آئے گا۔“ امائمہ نے ہاتھ میں پکڑا اسٹریپری کا  
آؤھا حصہ منہ میں رکھ لیا تھا۔

”ابو کی ڈائریکٹ فلاٹ ہے۔ وہ جمعہ کی صبح پہنچ  
جائیں گے۔ شہروز بیس تاریخ تک آئے گا۔“ عمر نے  
بتایا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

باتیں تو مجھے بھی یاد نہیں رہیں۔“  
”بہترین مذاق اڑا رہی ہو مجازی خدا کا۔ ٹھہرو  
میں پہلے کچن سے اسٹریپریز لے آؤں پھر پوچھتا ہوں  
تمہیں۔“ وہ جھل سا ہو کر اٹھا تھا اور پھر باہر نکل گیا تھا۔  
چند لمحوں بعد امائمہ نے اسے اسٹریپری والی باسکٹ  
اٹھائے واپس آتے دیکھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا تھا  
پھر ایک اسٹریپری اس کی جانب بڑھا کر بولا۔

”میں تمہیں جو باتیں بھی سمجھاتی رہتی ہیں۔ میں  
بس ان ہی کو ذہن میں رکھتا ہوں۔ میں تمہارا خیال  
رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری امی تو ہیں نہیں یہاں۔  
مجھے ہی خیال رکھنا پڑے گا نا۔“ اس نے ایک  
اسٹریپری اپنے منہ میں چھپی رکھی تھی۔

”حقیک یو عمر! تم بہت اچھے ہو۔ جب تمہارا  
پرپونل آیا تھا تو امی سب سے زیادہ خوش تھیں اور  
انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ امائمہ تم میرے اس فیصلے  
پر ایک دن فخر کرو گی۔“ اس نے اسٹریپری کا ایک پائٹ  
لیا تھا۔

”اچھا تو اب تم اس فیصلے پر فخر کرنے لگی ہو۔  
اشاروں اشاروں میں تعریف کر رہی ہو میری۔“ وہ  
مسکرایا تھا۔

”اشاروں میں ہی کیوں۔ میں کھن کر تمہاری  
تعریف کرتی ہوں۔ تم بہت اچھے ہو عمر! میرے لیے کتنا  
کچھ کرتے ہو۔ میرے بھائی کو ڈھونڈ رہے ہو۔ اتنی  
محنت کر رہے ہو کون کرتا ہے کسی کے لیے اتنا کچھ۔“  
امائمہ کے دل میں جو بھی تھا اس کے چہرے سے ظاہر  
ہو رہا تھا۔

”کسی کے لیے۔۔۔؟“ عمر نے اسے گھورا تھا۔ ”تم  
اب میری فیملی کا حصہ ہو۔ ان لمکٹ تم میری فیملی  
ہو۔ میرا سب کچھ ہو تم۔ تمہارے لیے نہیں کروں گا تو  
کس کے لیے کروں گا۔ مجھے اب آئی (امائمہ کی امی)  
کے لیے زیادہ فکر ہوتی ہے۔ ابھی میں نے بے بی کا پیار  
محسوس نہیں کیا۔ ابھی ہم ابتدائی مرحلے میں ہیں  
لیکن میں ابھی سے محسوس کر سکتا ہوں امائمہ! کہ اولاد  
کا دکھ بہت بڑا ہوتا ہے۔ آپ اپنے بچے کو کھو کر جیسے





## رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”تم اپنے لیے بددعا نہ کرو، نہ اپنی اولاد کے لیے بددعا کرو اور نہ اپنے ممالک کے لیے بددعا کرو (کہیں ایسا نہ ہو) تم اللہ کی طرف سے اس نغمہ کی پالیوں جس میں اس سے جو مانگا جائے، وہ تمہارے لیے قبول کر لے۔“  
 (مسلم)

فائدہ:-

اللہ تعالیٰ ویسے تو ہر وقت ہر کسی کی فریاد سنتا اور قبول فرماتا ہے لیکن بعض اوقات اس نے ایسے بھی مقرر کیے ہیں کہ ان میں کی گئی دعائیں زیادہ قبول فرماتا ہے۔ اس لیے انسان کو کسی وقت بھی اپنے یا اپنے بچوں یا کاروبار وغیرہ کے لیے بددعا نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بددعا وقت قبولیت کو پالے اور بعد میں وہ کف افسوس ملے۔

## قابل رنگ حکمران،

اورنگزیب عالمگیر، مغلی بادشاہوں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے قرآن پاک حفظ کیا۔  
 وہ نہایت سخیہ اور بردبار تھا۔ اس جیسا عبادت کرنے والا متعلو کی تارنک میں کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ وہ ہفتے میں چار روزے رکھتا تھا۔ اس کا مقبرہ بھی دوسرے بادشاہوں کے عظیم الشان مقبروں کے برخلاف سادہ جبکہ قبر کی ہے۔  
 نمرہ، آخری گراچی

## دو عربی اشعار کا ترجمہ،

تم ہر بار گڑوا بانی پیٹنے سے انکار کرو گے تو یہاں رہ جاؤ گے۔ اور کتنے لوگ ہیں جنہیں صاف پانی ملتا ہے۔  
 تم ہر کام میں اپنے وطن پر نکتہ چینی کرو گے اور اسے ڈانٹ پلاؤ گے تو یاد رکھو، ایک وقت ایسا آئے گا جب تمہاری ڈانٹ برداشت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چھتہ

## سچی دوستی،

باپ، ”رات کو کہاں تھے؟“  
 بھائی، ”دیر ہو گئی تھی۔ دوست کے گھر ہی رُک گیا تھا۔“  
 باپ نے اسی وقت فون اٹھایا اور اس کے دس دوستوں کو کال کی۔  
 چھ دوستوں نے کہا: ”ہاں انکل! وہ رات میرے پاس ہی سو رہا تھا۔“  
 تین نے کہا: ”انکل وہ سو رہا ہے۔ آپ کہیں نہ آجھا دوں۔“  
 ایک نے توجہ کر دی، کہنے لگا: ”جی (تو) بولیں۔“  
 انجن۔ ڈہر کی

## سوال جواباً،

”بگم! ہمیں کچن میں گئے تین گھنٹے ہو گئے کیا پانی ابھی تک اتنی نہیں جاسکیں؟“

”نہ تو میں نے لی تھی لیکن وہ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی، اگلی نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے انہیں بھون لیا۔ لیکن بھوننے سے وہ جل گئیں۔ اب اگر آپ ذرا دیر اور صبر کریں تو میں انہیں ابال کر لاد ہی ہوں۔“  
 فوزیہ بیگم۔ بکرات

## ہم ہیں پاکستانی،

پاکستانی با آسانی شناخت ہو سکتے ہیں کیونکہ...  
 وہ ہر کھانا انیس اور پیاز میں پکاتے ہیں۔  
 گھٹ پیاز کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔  
 گیٹ پر رخصت ہونے سے پہلے آدھا لکھنہ ضرور ہات کرتے ہیں۔  
 بچا ہوا کھانا خیریت میں ضرور دیکھتے ہیں۔  
 کھانا پکھنے ہوئے کبھی بھی بھانہ ناب کر ڈال استعمال نہیں کرتے۔ بس اندازے سے ڈالے جلتے ہیں۔  
 بغیر ڈاکٹر کی تجویز کے دوائیں استعمال کرتے ہیں۔

ہیڈ ڈیٹ یا صوفے کو صاف رکھنے کے لیے کوئی چادر یا کپڑے اور ڈال دیتے ہیں۔  
 ہمیشہ کہتے ہیں: گندہ کپڑا دینا کوئی جیسز صاف کرتی ہے۔  
 عائشہ۔ گوجرہ

## راہ کے دیپ،

دل کی طرح طاقت ور ہونا اچھی بات ہے لیکن دیو کی طرح طاقت استعمال کرنا ظلم ہے۔  
 (شیکیپیٹر)  
 میں زندگی میں کبھی ناکام نہیں رہا کیونکہ میں نے ہر کام سے کچھ نہ کچھ فائدہ اور سبق ضرور حاصل کیا۔  
 (ایڈلین)  
 ہر دُشمن کو بیمار یوں، سیال یوں اور زلزلوں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا غلط مشوروں نے۔  
 (والیٹر)  
 جب تک نوموں کو خود اپنی اصلاح کا خیال نہیں آتا۔ قدرت بھی انہیں درست نہیں کرتی۔  
 (علامہ اقبال)

## شعاع

جنوری 2015

جنوری 2015

کاشمارہ شاہ

ہو گیا



”کار نہیں سے مردے“ نے سال کی ریلیز پر،  
 ”میرا ایک کمال ناول“ ”یاد“،  
 ”مریم ناز کا کمال ناول“ ”تم ساتھ رہنا“،  
 ”سبنا ڈشین کا کمال ناول“ ”میرے بے خبر، میرے بے نظار“،  
 ”رخسانہ گارڈان کا سلسلہ راز ناول“ ”ایک نئی مثال“،  
 ”عمر ساجد کا ناول“ ”غریب رحمت“،  
 ”ایم۔ ایم۔ جی۔ کینز ناول، سیاست نامہ، میرا وطن میں اور تیرا دشمن کا فرار“،  
 ”مشہور مزاح نگار کاظم بھٹو“ ”نویس ہٹ“ سے واقعات،  
 ”معروف شخصیات سے گفتگو سلسلہ“ ”دستک“،  
 ”پیارے نئی نئی کی پیاری باتیں“ ”ادبیات نوری صلی اللہ علیہ وسلم“،  
 ”خطاب کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے نمبروں سے موسم کے گوان اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا جنوری 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں





بیان کیا ہے۔

## سیلف میڈ لوگوں کا الہیہ

روشن مزاجوں کا کیا عجب مقتدر ہے  
زندگی کے رستے میں بچھنے والے کانٹوں کو  
رام سے ہٹانے میں

ایک ایک تیکے سے آشتیاں بنانے میں  
خوشنویس پکڑنے میں گلستاں سجانے میں  
عمر کاٹ دیتے ہیں

اور اپنے حقے کے پھول بانٹ دیتے ہیں  
کیسی کیسی خواہشوں کو قتل کرتے جاتے ہیں  
دگرزد کے گلشن میں پھول بن کے بہتے ہیں  
صبر کے سمندر میں کشتیاں پلالتے ہیں  
یہ نہیں کہ ان کو اس درد و شب کی محنت کا  
کچھ صلہ نہیں ملتا

مرنے والی آسوں کا خول پہنا نہیں ملتا  
زندگی کے دامن میں جس قدر بھی خوشیاں ہیں  
سب ہی ہاتھ آتی ہیں

سب ہی مل بھی جاتی ہیں  
وقت پر نہیں آتیں  
وقت پر نہیں ملتیں

ان کو محنت کا اجر مل تو جاتا ہے  
لیکن اس طرح جیسے

قرض کی رقم کوئی قسط قسط ہو جلتے  
اصل جو عبادت ہو پس نوشت ہو جاتے  
فصل گل کے آخر میں پھول ان کے کھلتے ہیں  
ان کے صحن میں سورج  
دیر سے لگتے ہیں

کے دائری سے



میسری ڈائری میں تحریر بشیر بد کی یہ خوبصورت  
عزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

یہ چراغ بے نظر ہے، یہ ستارے زباں ہے  
ابھی تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے

وہی شخص جس پہ اپنے دل و جان مٹا کر دوں  
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگیاں ہے

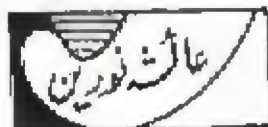
کبھی پا کے تجھ کو کھوتا، کبھی کھوکے تجھ کو پانا  
یہ جنم جنم کا رشتہ بہتر ہے میرے دریاں ہے

میرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں  
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسماں ہے

میں اس گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں  
تیسرا جنم بے تغیر، میرا پیار عباد و داں ہے

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے  
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہمسفر کہاں ہے

کے دائری سے



وہ تپتے جو غربت میں آنکھ کھولتے ہیں، جن  
کا بچپن اور جوانی کڑی مشقت میں گزرتی ہے۔  
پھر ایک عمر گزار کر کامیابی ملتی ہے۔ اس کیفیت  
کو مجد اس سلام امجد نے بڑی خوبصورتی سے

ایک قانون نے لوگیر آواز میں ماہر نفسیات  
کو بتایا۔

”میرا شوہر مجھ سے زیادہ اپنی ماں کو چاہتا ہے۔  
ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ میں اور تمہاری  
ماں ڈوب رہے ہوں تو تم پہلے کس کو بچاؤ گے؟“  
”اس نے کیا کہا؟“ ماہر نفسیات نے غیبتیں بھرے  
بوج میں پوچھا۔

”وہ کہنے لگا:“ اپنی ماں کو کیونکہ اس کا حق زیادہ  
بتا ہے۔“ اب مجھے بتاؤ میں ان حالات میں کیا  
کروں؟“

ماہر نفسیات نے چند کتابیں دیکھیں، پھر بڑی  
سنجیدگی سے بولا۔  
”آپ تیسرا کی سیکھنا شروع کر دیں!“  
مسترت الطاف احمد کراچی

## تفریح

ایک سفری سلیزین کاروباری دورے پر تھا۔  
راستے میں اسے ایک گاؤں میں روکنا پڑا۔ اسام سے فارغ  
ہو کر شام کو اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے  
ایک مقامی دیہاتی سے پوچھا۔

”یہاں کوئی سینا ہے؟“  
”نہیں،“ دیہاتی نے جواب دیا۔  
”کوئی تھیر وغیرہ ہے، جہاں آدمی جا کر کوئی ڈراما  
یا شو وغیرہ دیکھ سکے؟“

”نہیں جناب،“ دیہاتی نے نفی میں سر ہلایا۔  
”حیرت ہے! پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟“  
شہری سلیزین نے پوچھا۔

”بس جی۔ وہ بازار میں ایک چائے خانہ ہے۔ ہم  
وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی شہری بالو  
آکر بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے آکر دیکھتے ہیں۔ بس یہی  
ہماری تفریح ہے۔“

شبانہ خدیب۔ گوہرائیوالہ

☆

ہر دراشت میں مجلسی ملے تو شرافت کو اپناؤ۔

ہر زندگی دوسروں سے اُدھار نہیں لی جاتی اسے  
خود ہی اپنے اندر روشن کرنے کی ضرورت  
ہے۔ (علامہ اقبال)

ہر جہاں خواب و خیال چھین لیے جائیں، وہاں  
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم انسانوں میں  
رہ رہے ہیں یا جانوروں کے ساتھ۔

ہر انجام اچھا ہے تو تمام اچھا ہے۔  
سیدہ نسبت زہرا۔ کبرڈپکا

## اہم بات

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک  
حوصلہ توڑنے والے اور دوسرے حوصلہ بڑھانے والے۔  
لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس کی بات پر عمل  
کرتے ہیں۔

گرڈیا شاہ۔ کبرڈپکا

## صد

در شاہی سے ٹکرا کر صدا میں لوٹ آئی ہیں  
مجھے دریاں نے اتنا بتایا ہے  
ہمارا بادشاہ بس بولتا ہے  
”سن نہیں سکتا“

(صفورہ احمد)

نمرہ، اقراء۔ کراچی

## عقل اور علم

ہمیں ہر اس شے سے محبت کرنی چاہیے جو محبت  
کرنے کے لائق ہو اور ہر اس چیز سے نفرت کرنی چاہیے  
جو قابل نفرت ہو لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے  
جب ہمارے پاس دونوں کا فرق کرنے کے لیے عقل  
کی دولت اور علم کی روشنی ہو۔  
صائمہ جمی۔ کراچی





نارنگی خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا  
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔  
Email: info@khawateendigest.com  
khawateendigest@hotmail.com

فرحت میاں۔۔۔ جھنگ

میرا خواتین کے ساتھ رشتہ بہت پرانا ہے تقریباً اسکول کے زمانے سے جب ہم سب دوست اپنی کتابوں میں چھپا کر بڑھا کرتی تھیں اور اب تو ماشاء اللہ خود کے جتنے بچے بھی ہو گئے ہیں میں گاؤں میں رہتی ہوں اور مجھے خواتین خریدنے میں کافی مشکل ہوتی ہے اس لیے پلیز آپ مجھے جنوری 2015ء سے خواتین ہر ماہ دسمبر تک ارسال کر دیں۔

ج : پیاری فرحت! اگر ہم آپ کو ہر ماہ دو کتابیں گے تو آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ آپ کو ذرا کیہ 130 روپے دینا پڑیں گے جبکہ پرچے کی قیمت 60 روپے ہے اس لیے آپ ہمیں 700 روپے مئی آرڈر کر دیں ہم آپ کو ہر ماہ رجسٹری کر دیں گے آپ کو گھر بیٹھے ہر ماہ باقاعدگی سے پرچا ملتا رہے۔

مئی آرڈر اس ایڈریس پر کریں  
خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار۔ کراچی  
اپنا صحیح ایڈریس بھی لکھیں۔

شبانہ عندلیب۔۔۔ مگو جرنل والہ

میری کل سالگرہ سے ایک دن پہلے یعنی پانچ دسمبر کو خواتین ملا کر یہ کیا۔! دل دھک سے رہ گیا۔ اپنا چھوٹا سا نام بھی نہ ملا ڈھونڈے سے ابھی اپنا نم لگا نہیں ہوا تھا کہ ایک اور دھچکا لگا نموا احمد کا مکمل غائب۔ اس کے بعد گرتے پڑتے اب حیات تک کتنی سالار سکندر کی طرح ہمارے نو سال بھی ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ ناول کا پہلا صفحہ پڑھ کے بالکل نہیں لگا کہ ہم نو سال بعد پڑھ رہے ہیں۔ عموماً جی یہ آپ کا خیال تھا کہ ہم پیر کامل کو کچھ کچھ بھول گئے ہیں۔ یہ آج بھی ہمارے دل میں روز روشن کی طرح زندہ ہے اور پہلے سے زیادہ۔

شادی کے دوسرے دن سے ہی مسئلے مسائل شروع ہو گئے اور اس میں سالار اور امامہ دونوں کی ہی غلطی تھی۔ کیونکہ سالار نے اپنے رویے سے امامہ کو واقعی بائوس کیا۔ کہاں رات کو محبوبہ اور دلربا اور مئی زندگی کی پہلی سحری بھی ساتھ نہیں کی۔ سالار صاحب کو بھی کچھ ہوش کے ناخن لینے ہی پڑیں گے کہ مقابل بھی کئی ایویں نہیں ہے۔ فکر برابر ہے۔

اب آتے ہیں نمل کی طرف۔ ہاں جی نمرو جی بتائے۔ آپ کیوں غائب رہیں اس میں نے۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کی غیر حاضری ہمیں بالکل بھی گواہ نہیں سوجھ کر میں آئندہ سے ایسا نہیں کریں گی۔ حنین زمر اور فارس نے ہمیں اپنے حصار میں قید کر لیا ہے اب ہمیں اس سے سعدی ہی باہر نکال سکے گا۔

عبدالست کے لیے تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ بہت خوب صورتی سے اپنے انجام کی طرف گامزن ہے۔ تنزیلہ کے لیے بہت زیادہ دعا میں۔

ج : شبانہ! بے حد معذرت کہ آپ کے خطوط شامل نہ کر سکے۔ "پیر کامل" بھلا یا نہیں جاسکتا ہمیں اس کا بخوبی اندازہ ہے۔ ہم نے "پیر کامل" کا خلاصہ ان قارئین کے لیے دیا جنہوں نے "پیر کامل" نہیں

پڑھا۔  
خواتین ڈائجسٹ یہ تفصیلی تبصرہ کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

سدرہ خان۔۔۔ جہلم

پورا سال KID پڑھا۔ دادیں ہمیں کہ سیلابی صورت حال میں بھی ڈائجسٹ منگوا لیا۔ باوجود اس کے کہ سارا علاقہ پانی سے گھرا ہوا تھا ہمارے گھر کے چاروں طرف بھی پانی ہی پانی تھا۔

اس ماحول کو نہ پا کر ناخوش ہوں۔ مگر کوئی بات نہیں اچھی ہار سکی۔ بن مائی دعا اور عبدالست ٹھیک جا رہے ہیں۔ عموماً احمد کے دوبارہ آنے کی خوشی تو ہوئی مگر اب حیات مکمل ہونے کا انتظار ہے کیونکہ جب یہ ناول مکمل ہوگا میں تب پڑھوں گی کیونکہ پہلی قسط مجھے اتنی سمجھ نہیں آئی۔

ثمینہ صاحبہ اچھا لگا آپ کا انداز۔ سائرہ رضا حد ہوتی ہے حقیقت لکھنے کی۔ آئینہ پڑھ کر پھر یہ احساس ہوا۔ ذرا ہاتھ ہولا رہیں۔ آپ کے افسانوں کے کردار ارد گرد ڈھونڈنا شروع کر دیتی ہوں۔ باقی سب سلیپ بہترین ہیں۔

ج : سدرہ! آپ کمائی لکھ کر بھجوائیں پھر ہم کوئی رائے یا مشورہ دے سکتے ہیں۔ "آب حیات" مکمل ہونے کا انتظار نہ کریں۔ ہر ماہ پڑھ کر اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کریں۔ پہلی قسط سے اندازہ نہ لگائیں۔ آگے کمائی صاف اور واضح ہے۔

ملانکہ کوثر۔۔۔ بسمل اللہ پور

"نزل" میمونہ صدف کا تلخ حقائق پر مبنی ناول تھا

جس کو پڑھ کر میں روتی رہی۔ مجھے لگا۔ میمونہ صدف نے میری کمائی لکھ دی ہے۔ میری ماں بولتی نہیں تھی۔ اپنی ماں کو کھانا کھانا، کھانا پکانا، پکانا، پکانا سارے کام کوئی اپنے ہاتھ سے کرنے میں مجھے بھی عار محسوس نہیں ہوا۔ آخری دن کی صبح جب امی جان کو کمزوری کی وجہ سے پاٹ کی کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو گیا تو بہت غم زدہ حالت میں ان کی بے چارگی دیکھ کر میرے منہ سے یہ لفظ نکل گئے۔ اللہ سوئے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ آخری ٹائم ہے جب ان کو بخنی والی پھپھڑی کھلا رہی تھی تو نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ وہ سوت کی داوی میں اتر گئیں۔ مجھے لگا یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے صبح والا جملہ پھر کھانا کھانے کی کوشش جب کہ وہ رخت سرفراز رہی تھیں۔ میں بہت روتی، بھکتی رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے معافیاں مانگتی رہتی تھی ایک دن میں نے خواب میں دیکھا میری ماں (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) بڑے تنکے کے سارے لپٹی ہیں میں بھاگ کر دوتے ہوئے ان کے سینے سے لگ جاتی ہوں۔ وہ اپنے مہربان ہاتھوں سے میرے آنسو صاف کرتی ہیں اور کہتی ہیں "یہ سب اللہ کے کام ہیں انسان کے بس میں کوئی اختیار نہیں ہے تم مت رویا کرو۔" میں کہتی ہوں اچھا ٹھیک ہے میں اب بالکل نہیں روؤں گی۔ پھر سانا پنا لوٹ گیا۔

"آئینہ" سائرہ رضا کی زبردست کمائی تھی۔ وہ جب بھی لکھتی ہیں با کمائی اور موضوع بھی لا جواب چھتی ہیں۔ ثمینہ عظمت علی کی "بابا کانوت" صوفیہ سرور کی "روشن صبح" وجیہ احمد کی "دھوپ سے پہلے گھر" بے حد پسند آئیں۔ "عبدالست" میں تنزیلہ ریاض کا فن نکھر نکھر کر

ساتھ ارحمال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ دلشاد نسیم اور ڈاکٹر نگہت نسیم کی والدہ طویل علالت کے بعد اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

انا اللہ والیہ راجعون

ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑا سانحہ ہے۔ خصوصاً ایسی ماں جنہوں نے کشن حالات کے باوجود اولاد کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہ آنے دی ہو، ہم بس دلشاد نسیم اور نگہت نسیم کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اہل خانہ صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

خواتین ڈائجسٹ 269 جنوری 2015ء

خواتین ڈائجسٹ 268 جنوری 2015ء

copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY



سامنے آ رہا ہے۔ نہوا احمد کی "سمل" کو اس دفعہ مس کیا۔  
بے حد اچھی لگ رہی ہے اس کی کہانی بھی "کوہ گراں" تھے  
ہم "عنبزہ سید کی تعریف کے لیے موزوں الفاظ نہیں مل  
رہے۔

ج: پیاری ملائکہ! کسی مقدور کی خدمت آسان نہیں  
ہست تھا کہ دینے والا کام ہے۔ کبھی کبھی جب ہم خود کمزور یا بیمار  
ہوتے ہیں تو نہ چاہتے ہوئے بھی منہ سے کچھ ایسے کلمات  
نکل جاتے ہیں لیکن ماں کا دل اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ اسے

اولاد کی کوئی بات بری نہیں لگتی۔ آپ نے اپنی ماں کی اتنی  
خدمت کی ان کا ہر طرح سے خیال رکھا۔ اللہ تعالیٰ اس کا  
اجر دے گا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثوبیہ نور۔ کشن گڑھ بھلول نگر

"کوہ گراں" تھے ہم "جس کا عنوان بھی زبردست تھا)  
زندگی کے سچ و شیریں رنگوں سے آشنائیاں دلا کر بالآخر  
انتقام کو پہنچی گویا ایک پورا اور ختم ہوا۔

خاصیت ہی سہی نگر میں اس پر تھوڑا تبصرہ کرنا چاہوں  
گی۔ حسب توقع اور حسب سابق عنبزہ جی نے بہت  
زبردست لکھا۔ حالانکہ آغاز میں ریشم کے ذروں جیسے  
ابجھے کردار تھے مگر عنبزہ جی نے ہر کردار کے ساتھ  
انصاف کیا۔ عنبزہ جی! کوہ گراں کے اختتام کے ساتھ ہی  
میں نے آپ کی دوبارہ آمد کا انتظار شروع کر دیا ہے۔  
صمیرہ واحد کا نام اتنے عرصے کے بعد دوبارہ دیکھ کر خوشی  
ہوئی ابھی چونکہ کرداروں کا "کردار" کھل کر سامنے نہیں  
آیا تو تبصرہ تو کیا ہی کیا جاسکتا ہے۔ مگر یقین ہے کہ ہمیشہ کی  
طرح زبردست ناول پڑھنے کو ملے گا اور بے چارے سالار  
کے ساتھ تو شادی کے اگلے دن ہی سعیدہ لماں کا اتنا برا  
سلوک کیا ہی ناپسندیدہ ہو سکتا ہے ساتھ ہوتا ہو گا (شادی  
کے اگلے ہی دن تو شاید نہ ہی ہوتا ہو)

بینک میں اعلیٰ عہدہ 'زہین' و فطین بندہ جس کے آلی کیو  
لیول کاؤنڈر اور پورے پیر کال میں بٹار ہا بے چارہ غریب  
بیوی کو ذلیل کرنا نہیں جانتا سالار کو چاہیے تھا اس دوران  
کوئی دو چار افیر ہی چلا لیتا۔ تجربہ ہو جاتا۔ جتنی خواتین کو تو  
بڑے بڑے فلا سفر نہ سمجھ سکے۔ سالار صاحب کس کھیت  
کی مولیٰ ہیں۔ "منہ سے پھوٹنا بھی نہیں اور یہ امید بھی کہ  
اگلا بندہ وہ ہی کرے جو ہم نے سوچ رکھا ہے شوہر نہ ہو  
گیا نجوی ہو گیا۔

"عند الست" کے لیے تو کیا ہی کہوں۔ تنزیلہ جی تو ہمیشہ  
ہی زبردست لکھتی رہی ہیں مگر اب کے تو بد ریاضت کر رہی  
ہے۔ کافی عرصے بعد آئی ہیں (اب تو آئے ہوئے بھی) کافی  
عرصہ "ہو گیا اور چھپا گئی ہیں اور چھپائے ہوئے بھی)  
"بن مانگی دعا" میں عفت جی اور حرون کی ایسی کی تیسری  
کردار ہی ہیں تو ادھر ایسا ہاکی۔ ویسے یہ محترمہ ثانیہ کی مجھے  
تو سمجھ نہیں آئی ایک طرف تو اتنی انہرستی کہ شوہر کی ایک

غلطی معاف کرنے کو تیار نہیں اور دوسری طرف ناراض  
کے ساتھ ایسی بے تکلفی کہ عزت نفس کا ہی خیال نہیں  
اور عفت جی منہ پھٹ دہانت والی اصطلاح بھی میری سمجھ  
سے باہر ہے بھئی عادت یا فطرت کا شعر اور دیہات سے تو  
تعلق نہیں جتا بلکہ "تم چپ رہو" کا سبق دیہاتوں میں  
زیادہ بڑھایا جاتا ہے۔

نتیجہ روشن کا اختتام اچھا تھا انسان معاف کر کے جتنا  
پر سکون ہو سکتا ہے انتقام لے کر ہرگز نہیں ہو سکتا۔  
دھوپ سے سیلے گھر "میں ماشہ والا قصہ ڈال کر بلاوجہ بات  
کو بڑھایا گیا۔ ساتھ رضا ہمیشہ کی طرح اچھا ٹاپک لے کر  
آئیں۔ راشدہ رفعت نے اچھا پیغام دیا انسان ہمیشہ نہ  
ہونے کے رونے روتا رہتا ہے جو ہے اس کی قدر نہیں  
کرتا۔ میمونہ صدف کے خیال سے تو سو فیصد متفق ہوں  
کہ عزت کے بغیر زندگی گزارنا عذاب بن جاتا ہے۔ محبت  
تو ثانوی چیز ہے بلکہ جہاں عزت ہو وہاں محبت بھی ہو ہی

دعا

ہماری پیاری مصنفہ قرۃ العین رائے کے بازو میں فہم کھو ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ سے نوازے  
قارئین سے بھی دعائی اور خواست ہے۔

جاتی ہے۔ ذر نش سے ملاقات اچھی رہی۔ کیوٹی سی لڑکی  
پیاری پیاری باتیں اور ناجیہ کے بجائے تو سہیل احمد کا  
اشرو پو کرنا چاہیے تھا بلکہ اب کر لیں "یہ تو خالی ہنسنے کے  
پیسے لیتی ہیں یعنی تم کے تم گھٹیلوں کے دام (ہنسنے سے  
خون بڑھتا ہے؟ بڑھتا ہی ہو گا شاید اسی لیے تو اتنی صحت  
مند ہیں ماشاء اللہ)

ج: ثوبیہ! طویل تبصرہ بہت جامع اور دلچسپ ہے۔  
افسوس کہ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے ہم شائع نہیں کر  
سکتے۔ عنبزہ احمد کا تو نام ہی کافی ہے "آب حیات" کے  
بارے میں آپ کا یقین درست ہے۔ مصنفین تک آپ  
کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ عنبزہ کی  
آمد کا میں بھی انتظار ہے۔

نوزیہ ثمرٹ "آمنہ میر"۔ گجرات

عمیرہ جی نے اپنا وعدہ ایفا کیا ہے۔ دوسری قسط سے  
شروع کیا۔ لا جواب عمیرہ جی کا تو کسی سے کوئی مقابلہ ہے  
ہی نہیں۔

مگر ایک بات ہے۔ ان کی تحریر ہمارے دماغ کے سائز  
سے کچھ کچھ بڑی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ ابتدا میں جو لڑکی  
پاسٹ کو ہاتھ دیکھا رہی ہے کیا امامہ تھی۔ پچھلی تحریر کا  
خلاصہ بھی تو نہیں تھا۔ وجہ احمد کی تحریر پہلی دھوپ کے  
سیلے گھر۔ ذیل دن وجہ جی۔ اتنی اچھی تحریر دل خوش کر

دیا۔ بھئی! کا کردار پسند آیا۔ عورت کی جب مت ماری جاتی  
ہے تو پھر ماشہ جیسی ذلت ہی اس کا نصب ہتی ہے۔ بھئی  
نور خدیجہ دونوں کردار بہت اچھے تھے اپنوں کے لیے اپنی  
خوشیاں قربان کرنے والے۔ روشن صبح دل موہ لینے والی  
تحریر۔ حذیفہ خوش نصیب نکلا۔

دعائے مغفرت

ہماری ساتھی صبا سحر کے بہنوئی محمد اسلم شیخ مختصر سی علالت کے بعد رانی ملک عدم ہوئے۔

اللہ وانا الیہ راجعون

محمد اسلم شیخ نہایت مرنجان منج اور محبت کرنے والی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی اچانک وفات ان کے  
متعلقین کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جنت فردوس میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر  
جہیل عطا فرمائے آمین  
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔





خاتونِ ڈائجسٹ  
رات کیا سوئے کہ بانی عمر کی پندار و پند  
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا بے خبر کا  
عائشہ احسان  
ہمارا درد بیدی کا یہ ماجرا ہے کہ ہم  
مسافروں کی طرح اپنے گھر کو دیکھتے ہیں  
تحریم  
یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے  
ان سے مت مل کہ انہیں روک میں خرابوں والے  
درویش شیرازی  
جس کی نظروں میں ہم نہیں آتے  
کچھ تو وہ شخص بھی برا ہو گا  
حرمت ردا  
بھڑکتے وقت کسی سے ہمیں تھا ہی گمان  
کہ زخم کیسا بھی ہو، عمر بھر نہیں رہتا  
نادید، طواری  
یاد ہے میں اس کے سوچیں بھی تو کیا سوچیں تھیں  
وہ غییر نہیں تو اپنا بھی نہیں لگتا  
نخبہ اکبر  
لوگوں کو گمان تک نہیں ہوتا ہے جنوں کا  
ہم دل کی طرح چاک گر یہاں نہیں کرتے  
نوید  
کسی کو اس آئی سیے وقائی  
کسی کو کہ دیا رسوا دھلے  
نغمہ شہباز  
عشق سچا ہو تو اس طرح امر ہوتا ہے  
جس طرح مر نہیں سکتا کسی فن کار کا فن

ناہیدہ شبیر پانا  
ابھی تو خشک ہے موسم بارش ہو تو سوچیں گے  
کہ ہم نے اپنے ارمانوں کو کس مٹی میں بونا ہے  
صبا لڑ شاہی  
نہ اٹھا سکوں گی ہاتھ میں میرے ہاتھ ہیں لہو لہو  
میری ذات کی ہیں جو کہ جیاں تم دکھ سکھو سمیٹ لو  
زاہدہ سلیم  
تم نہ مانو مگر حقیقت ہے  
عشق انسان کی ضرورت ہے  
سلمیٰ صابر  
ہزار رنگ دیے جس نے زندگی کا کافی کو  
اسی نظر سے محبت میں سادگی آئی  
شفاعت بتول  
یہ دستور وفا صدیوں سے دن ہے رات میں  
صدائے قرب دی جن کو انہی کو دودھ دیکھا  
حافظہ سمیرا  
157- این بی  
وجہ بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی  
بس وہ لہجہ بدلتے گئے اودھم اٹھتی ہوئے  
تمینہ کوثر عطاری  
دو دو گزرات  
وہ تباہ حال وہ سر بھرے مڑا نام عشق میں گر گئے  
تری جستجو میں جو کھو گئے، تری آرزو میں جو مر گئے  
سے روش روش میں شگفتگی، کس تازگی کس نغمگی  
یہ جمن سے کس کا گزند ہوا کہ تمام پھول ٹھہر گئے  
نگینہ شہباز  
شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے  
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے

اقرا اسحاق چوہدری۔۔۔ حوالی لکھا، ضلع اوکاڑہ  
تحصیل بدین پور

اس ماہ مکمل ہوا، وجہ احمد کا "پیلی دھوپ کے سیلے گھر"  
اور صوفیہ سرور کا "نوشن میج" دونوں ہی زبردست تھے۔  
ساتھ رضا میر سے پاس الفاظ نہیں ہیں اس اتقا کوں کی  
ایکسیبلنٹ۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ حسب  
حال کی ناچیہ سے ملاقات اچھی رہی۔ فی دی فنکارہ زرنش  
کچھ خاص نہیں تھیں۔ خاتون کی ڈائری میں نوشاہہ منظور  
کی غزل اچھی لگی۔ رنگا رنگ پھول بھی زبردست تھے،  
خاص طور پر "مرچیں"، "کھٹا میٹھا" اور "قیمت"  
چھوہارے کا طہو نرائی کیا تھا، مزہ دار بنا تھا۔ ظاہر ہے ہم نے  
جو بنایا تھا۔

ج : پیاری اقرا! خواتین کی پسندیدگی کے بارے میں جان  
کر بہت خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف  
ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

آمنہ شبیر راجس۔ راولپنڈی

بہت عرصے سے سوچ رہی تھی کہ خواتین کی محفل میں  
شرکت کروں لیکن دل کچھ ٹوٹ سا گیا تھا خواتین ڈائجسٹ  
سے۔ سوچا تو تھار شہی توڑوں۔ لیکن دل پہ لگی تصویر  
کاغذ کی بنی تصویر کی طرح نہیں ہوتی جسے آسانی سے بھاڑ دیا  
جائے اور نہ ہی موبائل یا کہ وہ میں کھینچی گئی تصویر کی طرح  
جسے ڈیلیٹ کیا جاسکے۔ یہ ہوا میرے ساتھ اور پھر۔ لکھ  
ڈالی میں نے چھی آپ کے نام۔

ج : آمنہ بہت اچھا کیا کہ آپ نے اپنے دل کی بات سن  
لی اور ہمیں چٹھی لکھ ڈالی۔ یہ صحیح ہے کہ آپ لوگ اتنی  
محبت سے ہمیں خط لکھتی ہیں اور خط شامل نہیں ہوتا تو  
آپ کو دکھ ہوتا ہے۔ خط شائع نہ ہونے کی مختلف وجوہات

ہیں بھی تاخیر سے موصول ہوتے ہیں تو ہم شامل نہیں کر  
پاتے، کبھی صفحات کی مجبوری آٹھ آجاتی ہے۔ اور کبھی  
ہمیں موصول نہیں ہوتے۔ آپ کا خط شامل اشاعت  
ہے۔ اب آئندہ ماہ بھرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

آپ حیات کا انتظار رہنا ہے۔  
ج : پیاری عائشہ! ہم ان سطور کے ذریعے آپ کی ہلا  
سے کہیں گے کہ وہ آپ کو خواتین ڈائجسٹ پڑھنے سے نہ  
روکیں۔ اس میں سبق آموز کہانیاں بھی ہوتی ہیں اور  
مغید سلسلے بھی جن سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے لیکن  
عائشہ! ایک بات کا آپ بھی خیال رکھیں جب آپ کی ہلا  
آپ سے کوئی کام کرنے کو کہیں تو فوراً "ڈائجسٹ" رکھ دیں،  
اور پہلے وہ کام کریں پھر وہ آپ کو ڈائجسٹ پڑھنے سے نہیں  
روکیں گی۔

## قارئین متوجہ ہوں!

1. خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی نمبر پر  
بجھائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال  
کریں۔
2. افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے  
ہیں۔
3. ایک طرحی چھوڑ کر خوش یاد لکھیں اور سنیے کی پشت پر یعنی سنیے کی  
دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
4. کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا  
مکمل پتہ لکھیں اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
5. سروس کے ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، تاکہ اصل اشاعت  
کی صورت میں تحریر واپس بھیج سکیں ہوگی۔
6. تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی  
کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
7. خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط سلسلوں کے لیے  
احتمال، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر ہر مہتری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور اردو خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے  
حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعیت پر ڈراما، فلمی، ٹیلی ویژن  
اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔







ڈاکٹر سیریل چپ ریتو کے ہیرو  
عمیدہ ملک کے بھائی

## باتیں فیروز خان سے

شایان اسد

- 1 "اصلی نام؟"
- "فیروز خان۔"
- 2 "پیار کا نام؟"
- "ای مجھے گڈا کستی ہیں بات تو سب فیروز ہی کہتے ہیں۔"
- 3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
- "11 جولائی 1990ء / کوئٹہ۔"
- 4 "ستارہ / قد؟"
- "کینسر / اور 5 فٹ 11 قد ہے میرا۔"
- 5 "ہنس بھائی / آپ کا نمبر؟"
- 12 "صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے یا؟"
- "الحمد للہ مجھے صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے اور میں نو بجے تک اٹھ جاتا ہوں۔"
- 13 "رات کب سوئے ہیں؟"
- "اس انداز میں صبح کا تو یہ ہے کہ کب ہونی ہے رات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔" قہقہہ۔
- 14 "صبح اٹھ کر سب سے پہلے کس کو دیکھتے ہیں؟"
- "اپنی ماں کو ان کے پاس بیٹھتا ہوں اور باتیں کرتا ہوں۔"

15 "گھر والوں کی کوئی بات جو بڑی لگتی ہو؟"

"الحمد للہ... دل پہ ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں مجھے اپنے گھر والوں کی کوئی بات بڑی نہیں لگتی... مجھے اپنے گھر والوں سے بہت پیار ہے۔"

16 "کیا اپنے آپ کو مکمل انسان سمجھتے ہیں؟"

"جسمانی لحاظ سے الحمد للہ میں ایک مکمل انسان ہوں۔"

17 "شدید بھوک میں کیفیت؟"

"اوہو... میں پاگل ہو رہا ہوتا ہوں اس وقت میرے سامنے کوئی بھی آئے میں کات لوں گا۔"

18 "دوستوں میں ایزی فیمل کرتے ہیں یا رشتے داروں میں؟"

"مکمل مل تو جلدی جاتا ہوں مگر دوست کم ہوتا ہوں۔ مجھ سے دوستی کرنا مشکل ہے۔"

19 "مطالعہ کاشوق ہے؟"

"بالکل ہے اور مخالف میں اپنے آپ کو جاننے کے لیے کرتا ہوں۔"

20 "آپ چاہتے ہیں کہ؟"

"میرے والدین خود کہیں کہ ہمارے بیٹے نے بہت محنت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔"

21 "شدید تھکن میں بھی نہیں بھوسے لے؟"

"جسم جاتا... یہ میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

22 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"

"بہت خوش ہو کر اور میں تو ویسے ہی بہت خوش رہتا ہوں۔"

23 "خند کرتے ہیں یا بات مان لیتے ہیں؟"

"میں بہت خندی ہوں۔ کوئی میری بات نہ مانے تو میں ناراض ہو جاتا ہوں۔"

24 "دماغ کب گھوم جاتا ہے؟"

"جب کوئی میری عزت نہ کرے عزت بہت ضروری چیز ہے۔"

25 "آپ کو ڈر لگتا ہے؟"

"قسم سے مجھے اپنے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بچپن میں بہت غلطیاں ہوتی تھیں۔ اب سنبھل گیا ہوں۔"

26 "کس قسم کی خواتین اچھی لگتی ہیں؟"

"جن میں نسوانیت ہوتی ہے ڈینٹ ہوتی ہیں۔ نزاکت ہوتی ہے۔"

27 "کیا بات بڑی لگتی ہے خواتین میں؟"

"اب پہلے جیسی شرم و حیا نہیں رہی لڑکیوں میں۔"

28 "کوئی لڑکی مسلسل گھوڑے تو؟"

"اچھا لگتا ہے... انجوائے کرتا ہوں۔"

29 "پرائیویٹ لیتے ہیں؟"

"نہیں جی... مجھے یقین نہیں ہے۔ مجھے محنت پہ یقین ہے۔"

30 "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"

"بڑے بھائی کا... مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

31 "کچھ وقت سے پہلے ملا؟"

"نہیں جی... بہت جدوجہد کے بعد ملا جو کچھ بھی ملا۔"

32 "جوائنٹ اکاؤنٹ کس کے ساتھ ہونا چاہیے؟"

"بینک کے ساتھ... تاکہ جب اس کو ضرورت ہو وہ رقم نکوالے۔"

33 "کس ملک کی شہریت کے خواہش مند ہیں؟"

"کسی کی نہیں... صرف اور صرف پاکستان۔"

34 "شاپنگ کے وقت آپ کی ترجیح؟"

"پکڑے... مجھے شاپنگ کا بہت شوق ہے۔"

35 "آپ کے دنیا میں آنے کا مقصد؟"

"والدین کو خوش رکھنا اپنے مذہب کو فالو کرنا اور اپنے ہنس بھائیوں کو خوش رکھنا۔"

36 "آپ کانپ جاتے ہیں؟"

"جب میں یاد کرتا ہوں کہ امی بیمار ہوئی تھیں... خدا میری ماں کا سایہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے۔"

37 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"جو کچھ بھی دیں دل سے دیں۔"

38 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"

"تحریف اچھی لگتی ہے۔"

39 "پسندیدہ پرو فیشن؟"

"میری... یعنی شوہر۔"

خواتین ڈائجسٹ 275 جنوری 2015ء

خواتین ڈائجسٹ 274 جنوری 2015ء

copied From Web





40 "آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں یا۔۔۔؟"  
"بستر چھوڑ دیتا ہوں۔ مجھے اٹھنا کبھی بھی مشکل نہیں لگتا۔"

41 "مخلص کون ہوتے ہیں اپنے پیارے؟"  
"دونوں ہی ہوتے ہیں میرے خیال میں۔"

42 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"  
"صرف اور صرف گھر پر۔"

43 "طباس میں کیا پسند ہے؟"  
"شکوہ قیصر بہت پسند ہے، لیکن کم پنتا ہوں تاکہ جب پنوں نیالگے۔"

44 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"  
"ذہین ہونی چاہیے۔ خوب صورتی ایکسٹرا کوالٹی ہونی۔"

45 "گھر کے کس کوٹے میں سکون ملتا ہے؟"  
"اپنے کمرے میں یا پھر ای کے کمرے میں۔"

46 "ٹکس آرٹسٹ کے ساتھ کام کی خواہش ہے؟"  
"بہت خواہش تھی کہ محل کے ساتھ کام کروں جو کہ پوری ہوئی اب صبا قمر کے ساتھ خواہش ہے اور صنم سعید کے ساتھ۔"

47 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوری دیتے ہیں؟"  
"گھروالوں کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتا ہوں۔"

48 "عورت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"  
"میوزک سنتا ہوں، مطالعہ کرتا ہوں یا پھر جم چلا جاتا ہوں۔"

49 "مہمان اچانک آجائیں تو؟"  
"تو کوئی مسئلہ نہیں۔ مجھے مہمان اچھے لگتے ہیں۔"

50 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"  
"بہت مرتبہ۔"

51 "اگر آپ حکومت میں آجائیں تو کیا کریں گے؟"  
"اپنے عوام کی مدد کروں گا، ان کے حقوق کی جنگ لڑوں گا۔"

52 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"دعائیں۔"

53 "صحیح جو بری لگتی ہے؟"  
"صحیح انسان کے بھلے کے لیے ہوتی ہے اس لیے بری نہیں لگتی۔"

54 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"  
"دو دور، وہ وقت جب آپ صحت و تندرستی کے ساتھ اپنا وقت گزار رہے ہوں۔"

55 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"  
"بہت زیادہ پابندی کرنا ہوں اور سب کو تلقین بھی کرتا ہوں۔"

56 "کن پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"  
"اپنے بھائی اپنی بہنوں اور والدین پر۔"

57 "اپنی کمائی سے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"  
"ایک برانڈڈ گھڑی خریدی۔"

58 "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ ڈائننگ ٹیبل؟"  
"جٹائی اپنا بیڈ؟"

59 "ہاتھ سے کھانا اچھا لگتا ہے یا چھری کانٹے سے؟"  
"چھری کانٹے سے کھانا اچھا لگتا ہے۔ لیکن چاول میں ہاتھ سے ہی کھاتا ہوں۔"

60 "جب ساری دنیا سوری ہو سوائے آپ کے تو کیا کریں گے؟"  
"میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔"

61 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"  
"بہت زیادہ۔"

62 "عشق کے بخار چڑھے؟"  
"بہت کم۔۔۔ کیونکہ میں اپنے کام پہ بہت فوکس ہوں۔ بہت دل لگاتا ہوں۔ ان باتوں کی طرف توجہ نہیں ہے۔"

63 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"  
"(بھڑی سانس کے ساتھ) "مرد نرم دل ہوتے ہیں۔"

64 "آپ اغوا ہو جائیں تو پریشان کون ہو گا؟"  
"ایسے امتحان میں اللہ تعالیٰ میرے گھروالوں کو نہ ڈالے۔"

65 "کن کیرے کمزوروں سے ڈر لگتا ہے؟"  
"ڈر نہیں لگتا۔ مجھے چھپکلی سے "کن" آتی ہے۔"

66 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"  
"بالکل اندھی ہوتی ہے محبت تو ایسی ہوتی ہے کہ آپ ایک مرتبہ ڈوبے تو پھر گئے۔"

67 "نویسے تکلیف دیتے ہیں؟"  
"بالکل۔۔۔ جب کوئی عزت نہ دے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

68 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"  
"ہندی۔"

69 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"  
"تحفہ۔"

70 "ہاتھ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"  
"اُمی بھابھی اور حبیبہ بھی پر اٹھا بہت اچھا پکاتی ہے۔"

71 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"  
"مائیکل جیکسن اور قائد اعظم۔"

72 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"  
"زیادہ نہیں۔۔۔ کیونکہ میں اپنا فون نمبر کسی کو نہیں دیتا۔"

73 "آپ کو فوہیا ہے؟"  
"پانی سے گھرے سمندر کو نہیں دیکھ پاتا۔"

74 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"  
"والٹ، موبائل اور اسکرپٹ۔"

75 "لوگوں سے کس طرح ملتے ہیں؟"  
"ہمیشہ مسکرا کے۔"

76 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"  
"بہت آسانی سے۔۔۔ آرام سے۔"

77 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"  
"دماغ کی سنتا ہوں۔۔۔ سارے نیچے دماغ کے کہنے پر کرتا ہوں۔"

78 "آپ کی کوئی اچھی بڑی عادت؟"  
"اچھی تو یہ کہ اپنے گھروالوں کا بہت خیال رکھتا ہوں اور بڑی یہ ہے کہ میرا غصہ بہت تیز ہے۔"

79 "منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"  
"جی بالکل نکلتی ہیں جب غصے میں ہوتا ہوں ماں بہن ایک کر دیتا ہوں۔"

80 "غصے میں کھانے سے ناراضی؟"  
"ہوتی تھی۔ مگر بچپن میں اب کم ہوتی ہے۔"

81 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"  
"تب بنتی ہے جب آپ اپنے آپ کو بہت اعلیٰ سمجھنے لگیں اور غرور میں پاگل ہو جائیں۔ اور اللہ مجھے محفوظ رکھے۔"

85 "آپ کے وارڈ روم میں زیادہ کس رنگ کے کپڑے ہیں؟"  
"کالے، لال اور تقریباً ہر رنگ کے مجھے لال رنگ کی شرتس بہت پسند ہیں۔"

86 "کھانے میں کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"  
"کچھ خاص نہیں۔ اگر آپ کا اشارہ اچار اور اس طرح کی کوئی چیز ہے تو مجھے یہ چیز پسند نہیں۔"

87 "زندگی کب بڑی لگتی ہے؟"  
"نہیں، یہ کبھی بھی نہیں۔ زندگی بہت حسین تحفہ ہے رب کا۔"

88 "تسوار جو شوق سے مہاتے ہیں؟"  
"عید الفطر، عید الاضحیٰ۔"

89 "پسینہ محنت سے ملتا ہے یا قسمت سے؟"  
"محنت سے ملتا ہے۔"

90 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"  
"فقہہ، "الٹھائی نہیں ہوں۔ دوبارہ سو جاتا ہوں۔"

91 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"  
"جب جان پر بن آئے۔"

92 "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟"  
"غصہ کم کرنا چاہتا ہوں۔"

98 "آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"  
"جب اللہ آپ کو کچھ دے اور اس پر آپ شکر کریں تو کبھی زوال نہیں آتا۔ اور آئے تو اللہ پڑھ لیں۔"



میں بہت پریشان ہوں 'آپ میرے لیے بھی دعا کیجئے گا۔۔۔  
اس لمحے مجھے اللہ کی ذات پر بڑا ہمار آیا کہ مجھے گناہ گار کے  
عیبوں کی پردہ پوشی کس طرح کی کہ لوگ مجھ سے بھی دعا کے  
لیے درخواست کرتے ہیں۔

میرے پیارے شہزادے معبذ اکرم کے جانے کے بعد  
جیسے میری زندگی یکسر بدل گئی۔ میرا ظاہر و باطن سب میں  
بہت واضح تبدیلی آئی ہے۔ اکثر میری ملنے والیاں کہتی ہیں  
کہ "شینہ کے ممبر کاٹھنڈیاک نے کتنا اچھا انعام دیا کہ اسے  
اپنے قریب کر لیا۔" بس یہ جملہ سن کر مجھے ایک انمول  
خوشی ملتی ہے۔

(3) زندگی تو پانی کا بلبلہ ہے۔ زندگی کا لمحہ بھر کا بھی  
بھروسہ نہیں۔ ہم اس ذرا سی زندگی کو ناراضی 'لڑائی  
جھگڑے اور آپس کی برنجشوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ میں اب  
اپنی موجودہ زندگی میں کسی سے کوئی برنجش یا ناراضی نہیں  
رہتی۔ پہلے اگر میرے دل میں کسی کے لیے کوئی برنجش  
تھی بھی تو اب نہیں ہے۔ میں معبذ کی شہادت کے بعد  
اکثر اپنے خاندان والوں کے رویہ کو سوچ کر دکھی ہوتی تھی۔  
کیونکہ جو میرے بہت اچھے تھے وہ ہم کی اس گھڑی میں  
بہت دور کھڑے نظر آتے 'جبکہ غیر اچھی لوگوں نے میرا عم  
بانا۔ میں بھی کچھ لوگوں سے ناراض تھی۔ مگر پھر اچانک  
ہی اللہ نے میرے دل کو بدل دیا۔ میں نے اپنے قریبی  
لوگوں سے ناراضی اور برنجش کو خود آگے بڑھ کر ختم کیا۔  
خود چل کر ان لوگوں کے گھر گئی ان کی خوشی اور دکھ میں بھی  
شریک ہوئی۔ برنجش اپنے دل میں نہیں رہتی۔ یہ سب  
اس لیے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ پھر یہ زبان کا بیٹھا  
بول ہی تو یاد آئے 'گد ورنہ تو سب کچھ یہی رہ جائے گا۔

(4) 2014ء میں پاکستانی سیاست کا جو جنازہ نکلا  
ہے۔ سیاست دانوں نے سیاست کا جو بیڑا غرق کیا ہے اس  
کی وجہ سے تو جو ایک دو سیاسی شخصیات پسند بھی تھیں۔ وہ  
اب نہیں رہیں اس سال 2014ء میں کسی بھی سیاسی  
شخصیت نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا ہے 'سوائے ایک  
دوسرے پر کچھ اچھا کرنے کے۔ لہذا انہیں تو رہنے ہی  
ریں۔ اب میوزک 'ڈراما اور کھیل میں پسندیدہ شخصیات

کون سی تو ان شعبہ جات میں میری دلچسپی صفر ہے لہذا  
'کوئی بھی نہیں' میرا جواب ہو گا۔ اردادب اور مذہب  
میں کئی ایک نام قابل ذکر ہیں۔ ارب کے حوالے سے  
میں نے اس سال بھی کئی لوگوں کو پڑھا۔ اشفاق احمد 'یونس  
بٹ 'جاوید چوہدری 'پریم چند 'ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ۔ ہمارے  
ڈائجسٹ بھی تو اب ایک حصہ ہیں۔ صمیمہ احمد 'میرزا  
حمید اور سائرہ رضا اس سال میری سوست فہرست رہیں۔

مذہب میں یوں تو مجھے دینی کتب کے مطالعے میں اب  
بہت دلچسپی پیدا ہو گئی ہے 'مختلف راستوں کے قلم سے مختلف  
کتب میں نے پڑھی مولانا محمد یوسف اصلاحی اور مولانا  
طارق جمیل 'مذہب کے حوالے سے میری پسندیدہ  
شخصیات ہیں۔ جن کی وجہ سے میری زندگی نے نیا سفر  
اختیار کیا۔

(5) ویسے تو قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہی وہ واحد  
کتاب ہے۔ جس کے مطالعے کی وجہ سے ہماری زندگی  
بہت سبب اختیار کر سکتی ہے۔ جو ہر ایک مسلمان کو ضرور  
پڑھنی چاہیے مگر اس کے علاوہ سیرت النبی بھی پڑھیں اور  
ایک کتاب 'شعور حیات' (مولانا محمد یوسف اصلاحی) ہے  
یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر  
میری زندگی یکسر تبدیل ہو گئی اور مجھے زندگی گزارنے کا  
شعور ملا۔ اس لیے میں اپنی قارئین کو بھی 'شعور حیات'  
پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔

#### خباہ رحمن انصاری۔۔۔ شہر سکھر سندھ

(1) جہاں تک بات اچھے کام کر کے گھرا اطمینان  
محسوس کرنے کی ہے تو میں اچھے کام کر کے بھول جاتی  
ہوں۔ بہت یاد کرنے پر بھی صرف ایک یاد آ رہا ہے 'پھولی  
عید کی چاند رات کے دن جب میں بازار جا رہی تھی تو میری  
ہن نے ایک بہت مشہور ہفتہ وار رسالہ منگوا لیا تھا جس  
کے سرورق پر "مادر احسن" اور "عروہ" تھیں اور میری  
ہن مادر کی بہت بڑی فین ہے۔ جب واپسی پر میں نے  
اسے وہ رسالہ دیا تو اس کی خوشی دیکھ کر میں نے خود اپنے  
اندرو خوشی محسوس کی بھی اور ایگزیز کے دوران فرینڈز کی  
"ہیلپ" کر کے کافی خوشی محسوس ہوئی ہے اور اطمینان بھی  
ہو گیا ہے۔

(2) گزشتہ سال میں کافی لوگوں نے میری تعریف کی

لیکن سب سے زیادہ اچھی تعریف جو میرے دل میں خوشی  
کا انمول احساس جگا گئی تھی۔ جب میری کزن نے میری  
ہنوں سے کہا تھا کہ خباہ تم سب ہنوں میں سب سے  
الگ ہے۔ "اور جب میرے ہنوں نے میری ہن کو بولا تھا  
جو میری شکایت کر رہی تھی کہ "نہیں خباہ ایسی نہیں ہو  
سکتی۔ وہ تو بہت معصوم ہے۔" بابا!۔۔۔ کافی خوشی ہوئی  
تھی اور میری فرینڈز کا گزشتہ سال میں کوئی زیادہ سو فائدہ  
کہنا "خباہ سب سے معصوم ہے" اور جب میں اپنے گھر

میں ہنوں کو بتاتی تو وہ کہتیں کہ انہوں نے اصلیت نہیں  
دیکھی ہے ابھی تمہاری اور میرا ان کو ہر بار جانا کافی خوشی  
دیتا تھا۔

(3) اول تو میں گھر سے باہر کسی کو ناراض نہیں کرتی  
لیکن اگر فرینڈز وغیرہ میں کوئی بات ہو جائے تو میں اپنی  
غلطی مان لیتی ہوں لیکن اس سال ہمارے سیاست دانوں  
کی وجہ سے میں نے فیس بک پر کافی بحث کی تھی سب سے  
اور اسی وجہ سے کافی لوگ ناراض ہو گئے تھے مجھ سے تو میں  
بس انہیں لوگوں کی ناراضی ختم کرنا چاہوں گی اور یہ ہی  
کون گی کہ اس طرح کی بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں  
ہو گا۔ اگر آپ سچ بول سکتے ہیں تو سچ سننے کی ہمت بھی  
رکھیں اور آخر میں سب سے سوری کروں گی کہ اگر میں  
نے کچھ غلط کہا ہو کبھی کسی کو۔

(4) 2014ء میں مذہب کے حوالے سے "اقتسام  
الہی نظیر" سیاست کے حوالے سے پہلے "خان صاحب"  
تھے لیکن اب میں کافی تجزیہ کر کے کسی ایسے شخص کو ضرور  
دعوی ہوں جو ہمارے ملک کے ساتھ تخلص ہو۔ میوزک  
کے حوالے سے مجھے کوئی پسند نہیں آیا آج تک۔ ڈراما  
کے حوالے سے "محبت اب نہیں ہوگی" والی صائمہ اکرم  
چوہدری اور خاص طور پر ان کے دھرنے کے متعلق  
اسٹینس مجھے کافی پسند ہیں۔

(5) 2014ء میں تو بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ اور  
میں زیادہ تر اسلامی کتابیں ہی پڑتی ہوں تو میں "امیر حمزہ" کی  
بکس گوں گی کہ ان کی بکس پڑھیں۔ ایک کتاب ہے "عم  
نہ کریں" یہ ایک اردو ترجمہ ہے ایک عربی بک "لا تحزن"  
کا اور اس کا ایک انگلش ترجمہ بھی ہے "be sad"  
Dont "اس کے مصنف کا نام ڈاکٹر عائشہ القرنی ہے۔ تو

اس بک کے لیے کسوں کی کہ یہ پڑھیں اور ایک کتاب ہے  
"زندگی سے لطف اٹھائیے" اور اس کے مصنف کا نام  
ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمن العریضی ہے۔ یہ ایک مسلمان  
کے لیے کافی اچھی اسوہ حسنہ کی روشنی میں کتاب ہے۔  
در ثمن مغل۔۔۔ گاؤں کیلے ضلع شیخوپورہ

(1) ویسے تو کوئی نہ کوئی ایسا کام کرنے کا موقع تلاش  
رہتی ہوں جس سے بہت سکون ملے 'تو پچھلے سال کا قابل  
ذکر کام یہ ہے کہ فروری 2014ء میں لایا کے بیٹے کی  
شادی بھی میں نے زبردست ساسوٹ لینے کے لیے پیسے

جمع کیے تھے۔ کچھ دن پہلے بھائی نے بتایا کہ میرے دوست کا  
داخلہ جانا ہے۔ (جامعہ کا) تو اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور  
اگر داخلہ نہ بھیجے گا تو اس کا سال ضائع ہو جائے گا۔ میں  
نے اسی وقت داخلہ دینے کی ہائی بھری اور بھائی سے کہا کہ  
اسے دے آؤ پیسے تاکہ سال ضائع ہونے سے بچ جائے اور  
کزن کی شادی پر پانے سوٹ سے ہی گزارا کر لیا تھا۔

(2) ایک کزن نے کہا تھا کہ مجھے تم سے زیادہ اچھا کوئی  
نظری نہیں آتا۔ اہم م م۔

(3) میرا مزاج سب سے بھائیوں سے نفرت ہے۔ تو بس  
سب موز کو سمجھنے کے بجائے ہرٹ کر دیتے ہیں جس کی  
وجہ سے کبھی تو اٹھو کر جاتی ہوں اور کبھی ناراض ہو جاتی  
ہوں۔ تو میں چاہتی ہوں کہ اب ایسا نہ ہو۔

(4) ہمارا گھری وی سے پاک ہے تو تفریح کا ذریعہ  
ڈائجسٹ ہی ہیں تو اس لحاظ سے 2014ء کی پسندیدہ  
شخصیات میں انشاہی 'مرواحد اور میرا حمید شامل ہیں۔

(5) پوری دنیا میں سے جو سب سے بہترین کتاب اور جو  
میری بھی پسندیدہ ہے وہ قرآن مجید سچ ترجمہ ہے۔ تمام  
قارئین سے یہی گزارش کروں گی کہ وہ قرآن مجید کو ترجمہ  
کے ساتھ ضرور پڑھیں۔

اقرار اسحاق چوہدری سس حوٹی لکھا 'تحصیل نہ پالپور'  
ضلع اوکاڑہ

تمہیں بھی خبر ہوئی کہ دریا پاس بہتے ہوں تو  
پانی اچھا لگتا ہے  
کنادوں سے جڑی مٹی سے پوچھو  
اس پانی کی چاہت میں





## روٹا وائرس ڈائریا کیا ہے؟

پاکستان میں ہر روز اندازاً 100 بچے روٹا وائرس ڈائریا کے سبب موت کی نیند سو جاتے ہیں۔<sup>1</sup>  
روٹا وائرس ویکسینیشن ہی اس سے بچنے کا سب سے اچھا حل ہے۔<sup>2,3</sup>

آج کل روٹا وائرس کے بارے میں اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

References:  
1. The Lancet. Rotavirus Vaccine: Protect Your Child From Diarrhoea. 2009; 373: 1552-1553.  
2. WHO. Diarrhoea in Vaccines and the Global Impact of the Rotavirus Vaccine. 2009; 373: 1552-1553.  
3. The Lancet. Rotavirus Vaccine: Protect Your Child From Diarrhoea. 2009; 373: 1552-1553.

vaccinatio  
FOR A BETTER TOMORROW

روٹا وائرس ویکسینیشن کے بارے میں مزید جاننے کے لیے GSK Pakistan کے ویب سائٹ پر جائیں۔  
www.vaccinatio.pk  
© 2014 Shikhar Pharmaceuticals Limited

(4) ہمارے گھر میں بیوی نہیں ہے۔ سیدنا حیرانی کی بات!... اس لیے سیاست اور میوزک میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔ ڈراما تو پھر دور کی بات، کھیل کے بارے میں بچے رہتے ہیں، ابھی جو اچھا کھیلتا ہے وہ ہمارا پسندیدہ بن جاتا ہے۔ ادیب کے حوالے سے مجھے عمیرہ احمد، نسیم جازری اور نمرہ احمد بہت پسند ہیں۔

(5) مجھے ایک نہیں بہت ساری کتابیں پسند ہیں نسیم جازری، عمیرہ احمد اور نمرہ احمد نے جنسی بھی کتابیں لکھی ہیں بہت بہت بہت ذہدست ہیں جن میں نسیم جازری کی خاک اور خون، شاہین، عمیرہ احمد کی "پیر کاٹل" و "شہر ذات" نمرہ احمد کی "جنت کے بچے" مصحف، "گو میں ہر قاری کو مشورہ دوں گی کہ وہ انہیں ضرور ضرور پڑھیں۔

مشعل قیاض... گو چراغِ ازل

سب سے پہلے تو سب کو نیا ساں مبارک۔ اللہ خیر سے یہ سال بھی گزارے۔ ہم سب کو اپنی امان میں لے لے۔ اب آتے ہیں جو ابوں کی طرف۔ یقین کریں پور نہیں ہوں گے۔

(1) ہاں 9 نومبر کو جب خواتین پیرتے ہاتھ میں تھا۔ اور میرا خدا اس میں شائع ہوا، یقین کریں ایسا اطمینان بھرا سانس، جب میں فرسٹ ایئر میں پاس ہوئی تھی تب بھی نہ لیا ہو۔ تھینکس بس یہی اچھا کام تھا جو 2014ء میں کیا۔ (آہم)

(2) جب مجھے کسی نے کہا کہ میری ماما نے میری تربیت بہت اچھی کی ہے اور یہ میری ماما نے کہا کہ زندگی میں میں ہر چیز حاصل کروں گی اور میری ماما کی دعائیں۔ بس۔

(3) بالکل نہیں میں کبھی بھی نہیں بھولتی۔ یاد رکھتی ہوں اور مجھے ضرورت بھی نہیں بدتمیز اور افضل لوگوں سے رہنمائی دور کرنے کی۔ ہاں بولتے سب ہیں میں اتنا

کناروں سے اکٹرا کر  
اضنی دلوں میں جانا کتنا مشکل ہے  
کنارہ پھر نہیں ملتا  
تمہیں بس اتنا کہنا ہے کہ  
یہاں جو بھی پھرتا جائے  
دوبارہ پھر نہیں ملتا

(1) جی ہاں! وہ لمحہ ابھی چند دن پہلے ہی آیا ہے جب میں نے مصحف کو پڑھا۔ میں نے مصحف ہی سے قرآن پڑھنا سیکھا کہ قرآن ترجمے کے ساتھ کس طرح پڑھا جاتا ہے اب میں ہر روز ای طرح ترجمے کے ساتھ پڑھتی ہوں اور مگر اس کو محسوس کرتی ہوں۔ اب مجھے شوق نہیں بلکہ جنون ہے کہ میں عربی سیکھوں۔ قرآن کا ساتھ کبھی نہ چھوڑ سکوں (آمین)

(2) ہاں جی آہم آہم ضرور کیوں نہیں ایسا ایک نہیں بلکہ بہت سے جملے ہیں جو کہ ہمارے دل میں خوشی کا "انمول" احساس جگاتے ہیں ارے وہ "انمول" جملہ "نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں آپ نے صرف ایک پوچھا ہے اس لیے ایک ہی لکھ رہی ہوں ایک دفعہ میں اپنی کلاس کو اسلامک موضوع پر لیکچر دے رہی تھی کہ ایک بچی نے کھڑے ہو کر کہا "پچھر آپ کی باتیں سیدھی میرے دل پر اثر کرتی ہیں اور میں ہر وہ کام کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں جو آپ مجھے کہتی ہیں۔"

(3) خدا کا شکر ہے کہ میری کسی سے دشمنی بار بخش نہیں چھوٹی سوتی ناراضیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں ان ہی سے تو زندگی کے رنگ ہیں۔ میری دوست حفصہ، مصباح سے ناراض ہے کہ کیونکہ وہ شادی پہ نہیں آئی یہی دعا کروں گی کہ یہ جانا ہو اس سال اپنے ساتھ اس ناراضی کو لے کر جائے اور اگلے سال ہمارے عشی گروپ کے لیے خوشیوں بھرا سال ہو۔ (آمین)

### انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پریچوں خواتین شعاع اور کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نسل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔  
اس ادارے سے شائع ہونے والے پریچوں کی کسی بھی تحریر کو انٹرنیٹ پر آپ لوڈ نہ کیا جائے۔ کسی بھی فرد یا ادارہ کی جانب سے اس مجرمانہ عمل پر ادارہ خواتین قانونی کارروائی کرنے کا مجاز ہوگا۔





# توت سیاہ

گلے کے درد، وزم اور خراش کے لیے موثر

جداوی یعنی اشیا کا استعمال، انسانی اور حیوانی اور گیہوں اور پھلوں سے بننے والی چیزیں جو انسانی جسم کے کھانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں ان کو غذا کہا جاتا ہے۔ غذا کے ذریعے جسم کو توانائی ملتی ہے اور وہ کام کر سکتا ہے۔ غذا کے بغیر جسم زندہ نہیں رہ سکتا۔ غذا کے ذریعے جسم کو توانائی ملتی ہے اور وہ کام کر سکتا ہے۔ غذا کے بغیر جسم زندہ نہیں رہ سکتا۔

لہذا خالص اور معیاری توت سیاہ کی ضرورت ہے۔  
قرشی کا شربت توت سیاہ اپنی اسناد مال کریں



f Inooboot.com/QarshiPakistan | www.qarshi.com

آفریدی) تل ناظم فیورٹ ہیں اور احمد شہزاد بھی اچھا کھیلنا ہے۔ ویسے سب پسند ہیں۔ ٹینس میں اعصاب اٹھ اور ویسٹ سٹرنڈ پسند ہیں۔ ارب میں تو سمر احمد کی کیا ہی بات ہے۔ وہ کہانی کے ذریعے ہی سبق سکھاتی ہیں۔  
اور اب ہاشم ندیم کو پرہیز ہے۔ بہت اعلیٰ رانٹرز ہیں۔  
(5) میری پسندیدہ کتاب تو ”مصحف“ اور ”جنت کے پتے“ ہیں۔ اگر آپ واقعی اپنی زندگی میں تبدیلی چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور پڑھیں اور ہاشم ندیم کی ”پچپن کا سہرا“ بھی بہت اچھی کتاب ہے۔ وہ پڑھ کر انسان اپنے بچپن میں چلا جاتا ہے۔

## قرحت اشرف گھمن... سید والا

- (1) 2014ء میں مدارس دین اور قرآن پاک کا ترجمہ شروع کر کے میں نے گہرا اطمینان محسوس کیا۔
- (2) مدرسہ میں باقی جان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے ایسے کردار کی خوب سورتی مانگو۔ تاکہ لوگ آپ سے آپ کی سورت کی وجہ سے ہمیں کردار کی خوبصورتی سے متاثر ہوں۔

- (3) میری کزن سے میری ناراضی چل رہی ہے جسے میں نے سال میں ختم کرنا چاہتی ہوں اور آپ میں میری دخل پیدا کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔
- (4) مذہب میں مولانا طارق جمیل صاحب سیاست

- میں نواز شریف میوزک میں عارف اسلم، کھیل میں عمر اکمل، ارب میں وصی شاہ اور ڈرامہ میں سہیل میر پسندیدہ شخصیات ہیں۔
- (5) تحفہ خواتین، مولانا مفتی محمد عاشق الہی صاحب کی ہے۔ یہ کتاب مجھے بہت پسند ہے۔ میں بہنوں کو یہ کتاب پڑھنے کا ضرور مشورہ دوں گی۔



## سرواق کی شخصیت

صاڈل ..... شہیزا  
میک اپ ..... روز بیوتی پلار  
فوٹو گرافر ..... موسیٰ رضا

ہی بھیک ہے۔ ہاں لیکن حورم سلطان سے ناراضی دور کرنے کا ارادہ ہے۔ کہ چلو مرگئی۔ میری جان چھوٹی۔ اب دل میں اس کے لیے کچھ فیمل نہیں ہوتا جب اس کا آرامہ دیکھ کر ہوتا تھا۔ بد تمیز حورم سلطان۔ سلطان کی دم۔

(4) مذہب میں عامر لیاقت سیاست میں نواز شریف۔ کافی ریوٹ ہیں۔ اور ان کا بھائی بھی ارے ارے شہباز شریف یار۔ میوزک میں مجھے سب اچھے لگتے ہیں۔ کھیل میں کرکٹ کیونکہ بس اس کی سمجھ آتی ہے۔ ارب کا پتا نہیں کیونکہ میں نے ابھی کچھ دن پہلے اشفاق احمد کی ”من چلے کا سورا“ پڑھنے کی بہت خوشی کی تھی۔ لیکن رسالہ کی بات ہے تو سب کہانیاں اچھی ہیں اور مجھے پسند ہیں مگر مکمل کچھ زیادہ ہی۔  
(5) میں نے اتنا مطالعہ نہیں کیا صرف ڈائجسٹ میں کہانیاں پڑھیں اور کتابیں سنگولی ہیں پھر بھی میں انہیں مصحف ہی پڑھنے کا مشورہ دوں گی۔ جو سب نے پڑھی ہے۔ (ہا ہا ہا) اب اجازت دیں۔

## شجہہ لاہور

- (1) اس سوال کا جواب تو میرے دل کے بہت قریب ہے کیونکہ اس سال میں تے باتا دھکی سے حجاب لینا شروع کر دیا ہے۔ جس سے مجھے بہت روحانی سکون حاصل ہوا ہے۔
- (2) جی جی! بالکل میرے ایک انگلی نے کہا تھا کہ تمہارا چہرہ بہت پیارا ہے چمکاؤ اور ایک نیلی مہر نے بھی کہا تھا کہ تمہارے چہرے پہ بہت نور ہے تو بہت خوشی ہوئی تھی۔
- (3) میں اپنے دل میں ناراضی کسی کے لیے بھی نہیں رکھتی۔ ہاں بات کرتے وقت کبھی کبھار لہجہ سخت ہو جاتا ہے وہ خوش کرتی ہوں کہ نہ ہو۔
- (4) اس سال رمضان میں مولانا طارق جمیل کا خطاب سنا تھا بس وہی پسندیدہ مذہبی شخصیت ہیں۔ سیاست میں کوئی خاص نہیں۔ میوزک میں گانے زیادہ پسند ہیں۔ ڈراموں میں سب اچھے ہیں۔ ثانیہ سعید اور نعمان اعجاز بہت اچھی اداکاری کرتے ہیں اور آج کل سبیل بھی بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ کرکٹ میں ایسے اللہ (بھٹی شامہ





# خبریں ویک

واصفہ یاسین



یقین

مسلمان تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ ان کے ایمان کا حصہ ہے مگر یہودی جو مسلمان نہیں ہیں اور مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ آپ پر ایمان نہیں لاتے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ہے اسے سچ سمجھتے ہیں اور اس پر پورا یقین بھی رکھتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی مثال ”غزہ کاری“ ہے۔ غزہ ایک جھاڑی نما درخت یا پودا ہے جو حدیث کے مطابق یہودیوں کے لیے باعث براہ ہوگا۔ تو یہودیوں نے پوری دنیا کے ساتھ ساتھ پشتون علاقوں میں بھی غزہ کی بڑے پیمانے پر شجرکاری کی مہم شروع کر دی ہے۔ کابل اور جنوب مشرق کے صوبوں میں امریکی اور یورپی این جی اوز وسیع رقبوں پر یہ درخت لگا رہی ہیں حتیٰ کہ پاکستان

کے پشتون علاقوں کے علاوہ غیر پشتون علاقوں میں بھی غزہ کاری کی شجرکاری انتہائی منظم طریقے سے کی جا رہی ہے۔ وہ این جی اوز افغانستان میں اتحادی فورسز کے تحفظ میں یہ کام کر رہی ہیں (اور ہم؟) عظیم انسان

یہنا مالی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی منفرد گائیگی نے ان کو ایک الگ پہچان دی ہے۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جو شاعری کو سمجھ کر گاتے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے لاہور میں فیض فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ”یوم اقبال“ پر اقبال کا کلام گا کر اہلیان لاہور سے بھرپور داد وصول کی۔ اس موقع پر یہنا مالی نے کہا کہ ”علامہ اقبال کی شاعری کو بڑھ کر سمجھ میں آیا کہ وہ کتنے عظیم انسان تھے۔ وہ بھی ایک جگہ بہت دھری سے کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ وہ ہر چیز کا مطالعہ کرتے تھے۔ یہی بات ایک بڑے انسان ہونے کی دلیل ہے۔ ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ ہمیں دو چار



چیزوں پر یقین ہوتا ہے اور انہیں ہٹ دھرمی سے اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔ اور گہری سیاسی پارٹی تک نہیں بدلتے۔ یہ پہل نہیں ہے۔ اقبال کے ہاں ایک

نشوونما ہے۔ میں تو بہت کم جانتی ہوں لیکن جتنا بھی ان کو پڑھا، ”بجھ کر گایا۔“ ”شکوہ“ ”جواب شکوہ“ لگتا ہے کہ ہمارے آج کی کہانی ہے۔ سو سال کے بعد بھی شکوہ پڑھی تو مجھے لگا کہ یہ آج کے انسان اور آج کے مسلمان کے لیے لکھا گیا ہے۔ (جی یٹنا! مسلمان اپنے حالات سے سبق نہیں سیکھتے جب ہی تو۔۔؟)

قوی کھیل۔۔۔؟

پاکستان میں کھیلوں پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔ وزارت کھیل نہ جانے وہ فنڈ کہاں خرچ کر دیتی ہے جو کھیل اور کھلاڑیوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔ فنڈ بال پر اگر توجہ دی جائے تو پاکستان اس میں یقیناً بہت نام بنا سکتا ہے۔ اسکو اش کے ہم سالوں چیمپئن رہے لیکن انفرادی کوششوں کی وجہ سے حکومت نے اسکو اش کے کھیل اور کھلاڑیوں کی سرپرستی کرنا پسند نہیں کی۔ (بھئی وہ ملک کا نام جو روشن کرتے تھے۔) اس طرح پاکستان کا قومی کھیل ہاکی جس کی ساری ٹرافیوں اور ایوارڈ پاکستان کے پاس تھے۔ آج فنڈ اور تنخواہ نہ ملنے کے باعث کھیل اور کھلاڑی دونوں زوال پذیر ہیں۔

ہاں ایک کھیل ہے جس پر حکومت اور وزارت کھیل کی خوب توجہ ہے اور وہ ہے کرکٹ۔ جس پر حکومتی نوازشات کی بارش ہمیشہ رہتی ہے۔ ابھی حال ہی میں متحدہ عرب امارات میں پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان کھیل گئی وہ ٹیسٹ میچوں کی سیریز پاکستان جیت گیا تو کھلاڑیوں کو ایک کروڑ سینتالیس لاکھ پچاس ہزار کی رقم انعام کے طور پر دی گئی جس کے مطابق ہر کھلاڑی کو پانچ پانچ لاکھ اور شاندار انفرادی کارکردگی پر الگ سے دس دس لاکھ دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہیڈ کوچ۔ کوچ اور دیگر کوچز اور معاون عملے کو



ساڑھے تین تین لاکھ روپے انعام میں دیے جائیں گے۔ اس کے برعکس ایک طویل عرصے بعد پاکستان ہاکی ٹیم انڈیا کو ہرا کر دوسری پوزیشن پر پہنچی لیکن ہاکی فیڈریشن اور حکومت نے ان کو کسی انعام سے نہیں نوازا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان کرکٹ کے علاوہ کسی اور کھیل پر توجہ نہیں دیتے دوسری طرف کرکٹ ٹیم میں شامل ہونے کے لیے میرٹ بنیاد نہیں ہے۔

انکشاف

بروین شاکر نے شاعری میں کیا نام بنایا ہر طرف خواتین شعرا نظر آنے لگیں اس کی حد دیکھیے کہ اداکارہ ریشم نے بھی فلم ٹی وی اور ملائگی کے بعد شاعری پر۔ طبع آزمائی شروع کر دی ہے۔ اور آنے والے چند ماہ میں سننے میں آ رہا ہے کہ ریشم اپنا ایک شعری مجموعہ لانے والی ہیں۔ (اب یہ کون بنائے گا کہ اس شاعری میں وزن کتنا ہے۔؟) اس بارے میں ریشم کا کہنا ہے کہ وہ ٹی وی ڈراموں میں اس قدر مصروف رہیں کہ اب تک اپنا شعری مجموعہ شائع نہیں کروا سکیں لیکن اب جلد ہی وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کروانے کے عوام کے سامنے لے آئیں گی۔

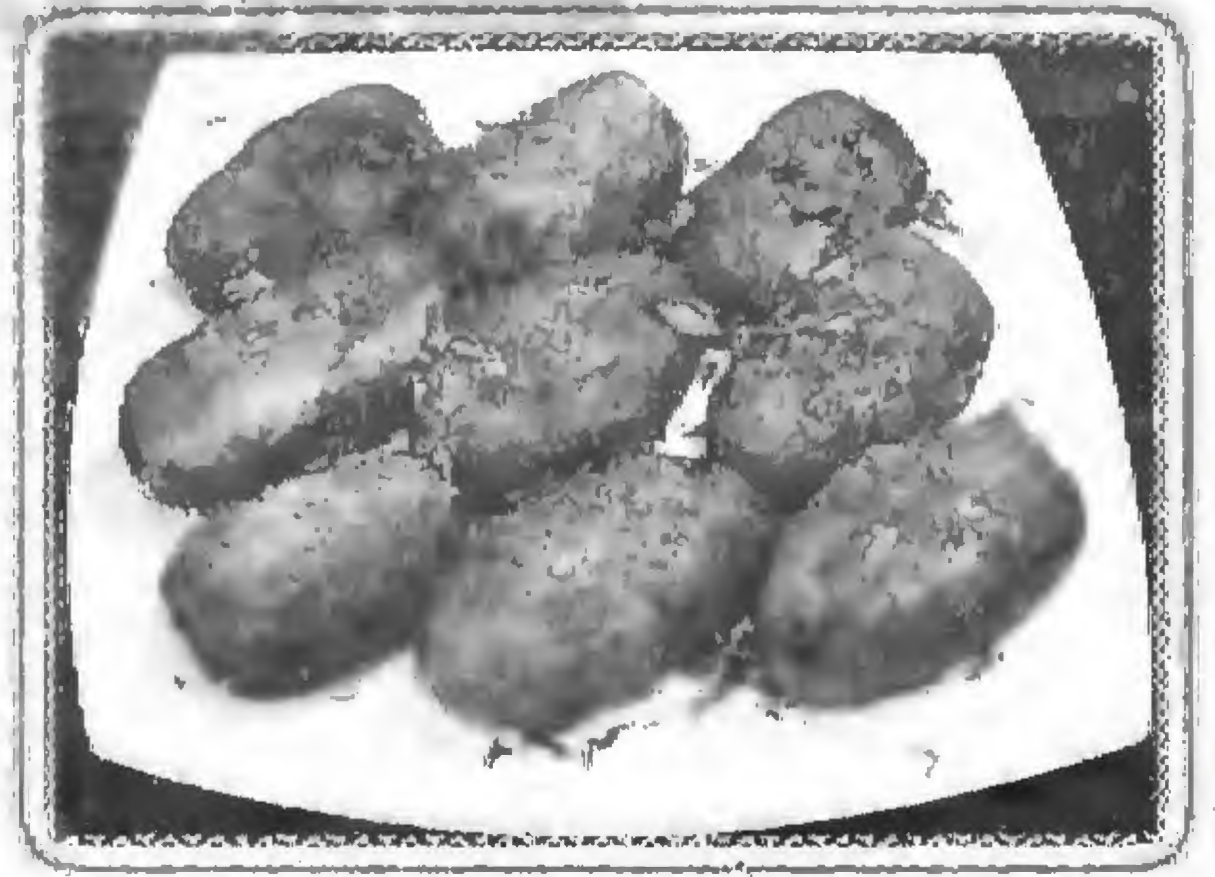
خواتین ڈائجسٹ 285 جنوری 2015ء

خواتین ڈائجسٹ 284 جنوری 2015ء

copied From Web







## ہمارے دیس کے یگوان

صیاست

### سندھی دیگھی کباب

ضروری اجزا :	تیمہ روکھا
ایک کلو	براون سائز
آرہا کپ	بیس خشکاش پیسی
دو روکھانے کے چمچے	انڈا
ایک عدد	دہی
دو روکھانے کے چمچے	نمک تیل
حسب ذائقہ و ضرورت	ترکیب :

تیمہ میں چار ہری مرچ، نمک، ہرا دھنیا، سیاد مرچ، گرم مسالا، پیسی خشکاش کے ساتھ باریک پیس لیں پھر اس میں براؤن پیاز کا چور، انڈا، بیس اور دہی مکس کر کے دبا دیا کر لے کباب بنائیں۔ دیگھی میں تیل گرم کر کے یہ کباب احتیاط سے رکھ دیں اور ڈھک کر دیگھی آنچ پر پکائیں۔ پانچ

منٹ بعد احتیاط سے دیگھی ہلاتے رہیں کہ تمام طرف سے کباب اچھی طرح پک جائیں۔ چمچے نہیں چلاتا ورنہ کباب ٹوٹ جائیں گے۔ گھی اور کٹ اور ہرا دھنیا چھڑک کر دینے اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

### حیدر آبادی فرائی مچھلی

ضروری اجزا :	مچھلی کے سلائسز
آٹھ عدد	لہسن پیسٹ
دو چائے کا چمچ	سرکہ
ایک کھانے کا چمچ	نمک تیل
حسب ذائقہ و ضرورت	ترکیب :

مچھلی کو اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں اور اس پر نمک، ایک چائے کا چمچ لہسن پیسٹ اور سرکہ لگا کر آٹھ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ ایک پیالے میں نمک، پانی، بجا لہسن پیسٹ، نال مرچ، ہلدی، مکس کر لیں اور پچھلی کو اس آمیزے سے نکال کر اس مسالے میں لپیٹ کر ایک گھنٹہ مزید چھوڑ دیں۔ کڑا سی تیل گرم کر کے مچھلی کو دونوں طرف سے فرائی کر کے نشور نکال لیں۔ ڈش میں نکال کر لیوں اور ک اور چاٹ مسالے چھڑک پیش کریں۔

### کشمیری مرچ قورمہ

ضروری اجزا :	چکن
پیارز شملہ مرچ	آرہا کلو
چار چار عدد	نہن پیسٹ
ایک چائے کا چمچ	دہی
آرہا کپ	نمک تیل
حسب ذائقہ و ضرورت	ترکیب :

گرم تیل میں دو پیاز پیسی ہوئی ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ گالی ہو جائے تو چکن ڈال کر مزید پکائیں۔ دو پیاز کو براؤن کر کے دہی پیسٹ لیں اور پیسی نال مرچ ڈال دیں، ہلدی، کٹا ہوا دھنیا، لہسن پیسٹ، ثابت گرم مسالا، زیرہ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھجوں لیں۔ مسالا بھجوں جائے تو باریک کٹی اور ک اور شملہ مرچ ڈال کر رکھ دیں۔

### بلوچی مکھنی وال

ضروری اجزا :	ایک کپ
پیاز نمائز	ایک ایک عدد
آرہا کپ	ایک چائے کا چمچ
زیرہ گرم مسالا	ایک ایک چائے کا چمچ
نمک تیل	تین کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ و ضرورت	ترکیب :

دال کو دھو کر آدھا نمونہ بھگو کر رکھیں پھر دو کپ پانی شامل کر کے اتنی دیر ابال لیں کہ وہ آدھی سے زیادہ گل جائے اس میں سرخ مرچ، ہلدی، نمک، دھنیا، نمائز، آرہا کپ، لہسن پیسٹ اور گرم مسالا ڈال کر مکس کریں اور ڈھک کر پکائیں۔ دال گل جائے تو اس میں ہری مرچیں ڈال کر دو منٹ تک دم پر رکھ دیں۔ فراٹنگ پان میں تیل گرم کر کے پیاز کے چمچے سنہری کر کے سفید زیرہ ڈال کر بھجھا لگادیں۔ ڈش میں نکال کر اوپر سے مکھن ڈال دیں اور چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

### سندھی مرغ پلاؤ

### ضروری اجزا :

چکن	ایک کلو
باجی چاول	آرہا کلو
پیاز	دو عدد
آرہا کپ	ایک کھانے کا چمچ
دہی	آرہا کپ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچ
نمک تیل	حسب ذائقہ و ضرورت
ترکیب :	

تیل گرم کر کے پیاز فرائی کر لیں۔ چکن اور آرہا کپ لہسن ڈال کر تھوڑا سا بھجوں لیں۔ پیالے میں دہی، ایک ایک چمچ کٹی ہوئی سوائف، کٹا ہوا دھنیا، گرم مسالا، کٹا ہوا زیرہ اور نمک ڈال کر پیسٹ لیں اور چکن میں مکس کر کے درمیانی آنچ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو بھیجے ہوئے چاول اور حسب ضرورت پانی ڈال کر پہلے تیز اور پھر درمیانی آنچ پر پکائیں پانی خشک ہو جائے تو دم پر رکھ دیں۔ دانے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

### پنجابی زردہ

ضروری اجزا :	آدھا، آرہا کلو
سیلا چاول، چینی	آدھی، آدھی پیال
کھویا، دودھ	آدھی پیالی
پستے، باوام، کشمش	چھ چمچ عدد
الائی، کوٹنگ	چند قطرے
کیورڈ	ایک ایک پیالی
تھی، اشرفیاں	ترکیب :

تین گھنٹے بھگو کر چاول ابال لیں اور مقدار کر کھلے برتن میں پھیلا دیں۔ سارے میوے باریک کٹ کر دو چمچے چھٹی میں فرائی کر کے نکال لیں۔ اسی گھی میں لونگ اور الائی کڑا لیں۔ پھر چاول کی ایک تہ لگائیں۔ تھوڑی سی چینی پھیلا لیں۔ تھوڑا سا دودھ اور تھوڑا سا میوہ چھڑکیں۔ پھر چاولوں کی تہ لگادیں اور گھی، میوہ، چینی اور دودھ کی ایک اور تہ لگائیں پھر آخری تہ چاول کی لگادیں۔ چاول کے اوپر کھویا اور کیورڈ اور دم پر لگادیں۔ پیش کرتے وقت مکس کریں۔





میں پانچ بھائیوں کی اکلونی لاؤلی بہن ہوں۔ شادی کو تیرہ سال ہونے والے ہیں۔ بات کہاں سے شروع کروں۔ شادی کے بعد میں نے بے حد ذہنی تکلیف اٹھائی ہے۔ میں نے چاہا ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے دوست بن کر رہیں۔ میں نے اپنی ایک بات اس سے شیئر کی۔ اس نے اسے اپنے تنگ محدود نہیں رکھا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ خاموشی اپنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخر کار مجھے سائیکاٹرسٹ کے پاس جانا پڑا۔ گزشتہ چار سال سے ڈپریشن کی ادویات استعمال کر رہی ہوں۔

میں ایک اسکول میں ٹیچر کے طور پر جاب بھی کر رہی ہوں۔ ایم اے لی ایڈ ہوں۔ یہ جاب کیا ہے۔ دراصل ایک فرار ہے اپنی ذات سے کھانا پینا تن ڈھانپنا ازدواجی تعلقات یہ کافی نہیں ہے زندگی میں۔ کچھ ہے جو مسنگ ہے۔ میں نے اپنے شوہر سے ہار کر کیا اعتبار کیا خود سے بڑھ کر مگر غلطی کی۔ میں نے اس کے پاس قابل اعتراض ویڈیوز دیکھیں تو میرا اعتبار ٹوٹ گیا۔

عدنان بھائی انچندون پہلے میں نے اس کے موبائل پر ایک گانے کا رقص دیکھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے اس سے کہا میں ان غور توں میں سے نہیں ہوں جو ان سب چیزوں کو مردوں کا حق سمجھتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ الگ ہو جاتے ہیں۔ میں نے کہا یہ مت سمجھنا کہ آپ کو چھوڑ کر اپنی زندگی آپ کے سوگ میں گزار دوں گی۔ میں اور شادی کر کے دکھاؤں گی آپ کو۔ چاہے کسی اندھے آدمی سے کروں۔ مجھے یقین تو ہو گا ناں کہ وہ ایسی چیزیں نہیں دیکھتا۔ میں نے جب یہ بات اس کے ماں باپ کو بتائی تو انہوں نے اس کو فیور دی تاجا نر طرف داری کی۔ اب سوچتی ہوں کہ اگر اس کے پاس ایسا کوئی مواد دیکھوں تو کیا کروں۔ اسے چھوڑ دوں ہمیشہ کے لیے طلاق لے لوں یا خلع؟ ڈاکٹر بھی وہ غلطو کاٹ دیتے ہیں جو باسور بن جائیں۔ دکھ تو ہوتا ہے تکلیف بھی ہوتی ہے مگر ایسا آرٹیشن کرنا پڑتا ہے ناں۔ میرے چار بچے ہیں بڑی بیٹی کی عمر بارہ سال ہونے والی ہے اور سب سے چھوٹا دو برس کا۔ لیکن کیا میں کسی اور شخص پر اعتبار کر سکوں گی؟ نہیں ناں۔ یہ بات مت سمجھئے گا عدنان بھائی کہ میں خواہنا بات کا بھنگنا رہی ہوں۔

اب آتے ہیں دوسری بات کی طرف۔ اس نے مجھے کبھی مناسب خرچ نہیں دیا۔ اپنی انکم وہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔ البتہ گھر کا سودا سلف بروقت آجاتا ہے۔ چاہے کم چاہے زیادہ۔ اگر میں اپنے بچے یا بچی کے لیے کچھ لوں تو خرچ مجھے اپنی تنخواہ میں سے کرنا پڑتا ہے۔ اپنی ذاتی استعمال کی اتیا کپڑے جو تے پرس وغیرہ بھی خود خریدتی ہوں۔ بچوں کی ٹیوشن یا اگر کام والی رکھوں تو اس کی ادائیگی بھی میری تنخواہ میں سے ہی ہوگی۔

سایس اور اکلونی مطلقہ مزد (ہمراہ ایک بیٹے کے) نے زندگی کو الگ عذاب بنائے رکھا۔ دو ہزار نکاح سال پہلے ہوا ہے۔ اکثر بھگڑا کر کے بیس رہتی ہے۔ رانی کا پہلا بیٹا لیتی ہے۔ بے حد خود پسند ہے۔ خواہنا خواہ اپنی آواز سے لڑنا شروع کر دیتی ہے اور مجھے پلٹ کر جواب دینے کی اجازت نہیں۔

محبت تو میں اپنے شوہر سے اب بھی کرتی ہوں۔ مگر کیا زندگی بھر ساتھ رہنے کے لیے صرف محبت کافی ہوتی ہے۔ نہیں ناں؟

عدنان بھائی! مجھے گھر میں وہ حیثیت نہ ملی جو میرا حق تھی۔ ہاں اگر وہ چاہتا تو مجھے سب کچھ ضرور ملتا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ ماں باپ سے لڑتا۔ مگر انسان تری اور پیار سے تو اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکتا ہے ناں۔

میں اپنی زندگی سے مطمئن نہیں۔ اگر زندگی ایک پزل ہے تو اس کا ایک ٹکڑا یا تو گمشدہ ہے یا پھر مس فٹ ہے۔ مجھے میں ایک خلا سارہ آیا ہے۔ نہیں معلوم کیسے ختم ہو گا۔ میں اور وہ چار برس پہلے تک بھی ایسے ہی تھے جیسے ایک بندی کے دو

کنارے جو ساتھ ساتھ تو چلتے ہیں مگر بھی ایک نہیں ہو پاتے۔ یہ تو ہمارے سائیکاٹرسٹ کی مہمانی ہے جو یہ سچ بھی نہیں تو ختم محسوس ہوتی ہے۔

میں اپنی تنخواہ اپنی مرضی سے خرچ کر سکتی ہوں۔ اس سلسلے میں مجھ پر دباؤ نہیں ہے۔ عدنان بھائی! میں نے اب۔ ہر رشتے ہر محبت سے بڑھ کر چاہا۔ شاید خدا کو میری یہی بات بڑی لگی ہو کہ دیکھو جسے تم نے سب کچھ سمجھا جس کی محبت میں اتنی لگن ہو گئیں دیکھو اس کی اصلیت کیا ہے؟ یہ ہے اس کی حقیقت۔

جب سے اس کا لباہ اترتا ہے اس کا مجھ پر وہ رعب نہیں رہا۔ ہاں۔ ایک چیز میرے حق میں مثبت ہوئی ہے۔ اب وہ کہتا ہے کہ مجھے دوسروں کو معاف کرنا چاہیے اس سے مجھے ذہنی سکون ملے گا۔ کیا معاف کر دیتا اتنا آسان ہے؟

بچہ۔ اچھی بہن! حقیقی زندگی میں اور ناٹل انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا زندگی میں جو کچھ آپ کو حاصل ہے وہ ہمارے ہاں 60 خواتین کو حاصل نہیں ہوتا۔ کھانا پینا کپڑے ازدواجی زندگی۔ زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل ہیں پھر بھی آپ کو کچھ کی محسوس ہو رہی ہے تو ایک بات سمجھ لیں کہ کی بیشہ رہتی جاتی ہے۔ مکمل آئیڈل زندگی کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

اس کے موبائل پر قابل اعتراض ویڈیوز دیکھ کر آپ خلع یا طلاق کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ اپنے بچوں کے بارے میں سوچا ہے؟ انہیں معاشرے میں کس صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ اپنے بچوں کو طلاق کی کیا وجہ بتائیں گی؟

اس نے اپنے والدین کو آپ کی باتیں بتائیں تو آپ نے کون سی کی چھوڑی۔ قابل اعتراض ویڈیوز والی بات اس کے گھر والوں کو بتادی۔ کیا ایک بیوی کو زیب دیتا ہے کہ اپنے شوہر کی انتہائی پرستل باتیں کسی کو بتائے۔

اس میں بہت سی خرابیاں ہوں گی لیکن کچھ باتیں اچھی بھی ہیں۔

اس نے آپ کو جاب کی اجازت دی اپنی تنخواہ آپ اپنی مرضی سے خرچ کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں۔ اس نے آپ کا ذہنی مسئلہ سمجھا اور آپ کا سائیکاٹرسٹ سے علاج کر رہا ہے۔ وہ آپ پر اعتماد کرتا ہے۔ دن یا رات کے کسی بھی پہر کہیں جائیں۔ آپ کے گھر پر رشک نہیں کرتا جہاں تک ساس زندگی کی بات ہے تو کون سا گھر ایسا ہے جہاں یہ جھگڑے نہیں ہوتے۔ بے شک اس نے آپ کے لیے آواز نہیں اٹھائی لیکن وہ آپ کو صحیح اور حق پر تسلیم کرتا ہے۔ تب ہی معاف کرنے کو کہتا ہے۔

قابل اعتراض ویڈیوز والی بات تکلیف دہ ہے لیکن اس بات پر طلاق یا خلع کی بات کر کے جو مزید مسائل پیدا کریں گی وہ آپ کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوں گے۔ آپ کو اس سے محبت کا دعوا ہے محبت میں تو بڑی بڑی غلطیاں معاف کر دی جاتی ہیں آپ نے لکھا ہے صرف محبت تو کافی نہیں ہوتی ناں اچھی بہن محبت کے ساتھ آپ کو اور بھی بہت کچھ حاصل ہے گھر شوہر بچے آزادوی۔

ویسے بھی چار بچوں کی ماں کو اپنی زندگی کے بارے میں کم اور اپنے بچوں کی زندگی کے بارے میں زیادہ سوچنا چاہیے۔ جہاں تک خرچ کا تعلق ہے تو جب آپ خود کماتی ہیں تو مل جل کر خرچ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر وہ آپ سے کسی بات کی وضاحت کے لیے سوال کرے تو آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ آپ سے ورشتہ لہجے میں بات کرے تو آپ کی حالت بڑی ہو جاتی ہے۔ آپ نے غور کیا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ احساس برتری کا شکار ہوں۔

اچھی بہن! آپ کو اپنی سوچ بدلنے کی ضرورت ہے۔ آپ غیر معمولی حساس ہیں۔ تھوڑا سا اپنا مزاج تبدیل کر لیں۔ شادی کے بعد اچھا برا وقت جو بھی تھا گزر گیا اب اسے بھول جائیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ سائیکاٹرسٹ سے علاج کر رہی ہیں۔ ان شاء اللہ اس سے بہتری آئے گی۔ زندگی کے مختلف ادوار ہوتے ہیں اب آپ کی زندگی پر سب سے زیادہ حق آپ کے بچوں کا ہے۔ آپ ماں بن کر سوچیں۔ اپنے بارے میں سوچنے کے بجائے ان کی بہتری بھلائی مستقبل کے بارے میں سوچیں۔



س۔ میرے گالوں پر جھائیاں ہیں جو کہ بہت ہی بری لگتی ہیں اس کے علاوہ میرے چہرے پر بال بھی ہیں میک اپ کروں تو بالوں پر جم جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔

رج۔ رہ جانے! جھائیاں۔ مختلف قسم کی ہوتی ہیں آنکھ کی کی سے یا کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے ہوتی ہیں انہیں کبھی ٹیمپل کی کی کی وجہ سے بھی ہو جاتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں۔

آج کل کیڑا موسم ہے۔ روزانہ صاب اور ایک یا دو کیڑا کھانے سے بھی فرق پڑ سکتا ہے۔ دودھ میں بادام پیس کر لگانے سے بھی جھائیاں ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ جھائیاں پر ٹوتھ پیسٹ لگانے سے بھی ہلکی ہو جاتی ہیں۔

چہرے پر بالوں کی موجودگی میں نہ میک اپ ہو سکتا ہے نہ قلم نہ سٹائپ۔ اب تھریڈنگ کے ذریعے بال صاف کر سکتی ہیں۔ اگر تھریڈنگ کا طریقہ نہ آتا ہو تو ریکسنگ کے ذریعہ بھی بال صاف کیے جاسکتے ہیں۔

زہرا انجم۔ ڈیرہ غازی خان

س۔ میں نے آئی بروز ہوا اس تو وہ بے حد باریک ہو گئیں۔ جو بہت بری لگ رہی ہیں۔ میں انہیں پھر سے گھنی کرنا چاہتی ہوں۔ دو ماہ بعد میری شادی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟

رج۔ اس میں شک نہیں کہ بہت زیادہ باریک ہو بہت برے لگتے ہیں۔ بھنوں دوبارہ اگلے کا وقت متعین نہیں کیا جاسکتا یہ چند ماہ سے لے کر سال بھر تک ہو سکتا ہے۔ البتہ بالوں کی افزائش کا عمل تیز کیا جاسکتا ہے۔

بھنوں پر کیسٹر آئل لگایا جائے تو بال جلدی آگ سکتے ہیں۔ بھنوں پر سرمہ لگانے سے بھی بال جلد آجاتے ہیں۔ جب تک بال دوبارہ نہ آئیں۔ بھنوں کو گھنا رکھانے کے لیے نرم آئی برو پینسل سے بھنوں پر ہلکے ہلکے خط لگائیں ایسے رنگ کی پینسل کا انتخاب کریں جس

کارٹک آپ کی بھنوں کے رنگ سے ملتا جلتا ہو۔

نسرین بشیر۔ پسرور

س۔ میرے سر میں کافی سفید بال نمودار ہو رہے ہیں۔ میں نے ہیر کلر کا استعمال کیا تو بال سخت روکھے ہو گئے۔ الجھے ہوئے بھی رہتے ہیں۔ کیا ہیر کلر کا استعمال مغربے یا میرے ساتھ ہی ایسا ہوا ہے۔

رج۔ ہیر کلر ہمیشہ اچھے اور معیاری برانڈ کا استعمال کرنا چاہیے جو اسموٹا فری ہوں اور ان میں کیمزیم وٹامنز کنڈیشننگ ایجنٹ کی بھرپور مقدار موجود ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہیر کلر کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو اس کا استعمال بالوں کی ساخت کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچاتا ہے۔ ہیر کلر اور بلیج میں شامل کیمیکلز بالوں کی حفاظتی تہہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

سفید بالوں کے لیے ایک آسان سائنس لکھ رہی ہوں جو بالوں کے لیے بھی مفید ہے۔ سبکی بھر آٹے رات کو بھگو دیں۔ صبح انہیں پیس کر بالوں میں لگالیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہے دیں۔ پھر انہیں سسو سے سردھو لیں۔ بال سیاہ کئے اور چمک دار ہو جائیں گے۔

بال رنگنے کے لیے مندی کا استعمال بھی بہت اچھا ہے۔ رات کو مندی گھول کر رکھ دیں۔ صبح اس میں سر دھو لیں۔ اتر اچھین کر لالیں۔ بالوں پر لگائیں۔ دھو گئے لگا رہے دیں۔ پھر بال دھو لیں۔ بالوں میں بے حد خوب صورت رنگ اور چمک آجائے گی۔

سعدیہ کفیل۔ پنڈی

س۔ سردی کے موسم میں میرے ہونٹ خشک رہتے ہیں اور ان پر پٹریاں سی جم جاتی ہیں۔ کوئی آسان گھریلو نسخہ بتائیں۔

رج۔ یوں تو سردی میں سب لوگوں کے ہونٹ خشک رہتے ہیں لیکن جن کی جلد حساس ہوتی ہے۔ ان کے ہونٹ بڑی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اس مسئلہ کے لیے آپ یہ ترکیبیں استعمال کریں۔

لیپ بام استعمال کریں۔ گلیسرین لگائیں۔ صاب کے تچ پیس کر لیپ بنالیں۔ رات کو لگا کر سو جائیں۔ صبح دھو لیں۔ گائے کا گچا دودھ ہونٹوں پر لگائے بہت مفید ہے۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ ٹائمہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں:-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی نین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو یہ کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں [www.paksociety.com](http://www.paksociety.com)

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)

